عمران ڈائجسٹ کی مشہور سلسلہ وار
پُراسرار کہانی
ترسول کنڈ کی داسی

عمران ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

ترسول کنڈ کی داسی

ایم اے راحت

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
۳۷ - اردو بازار - کراچی

جملہ حقوق محفوظ

بار اوّل ——— ۱۹۸۷ء

قیمت ——— [illegible]/ روپے

پریس ——— گرتاز پریس کراچی

یوں تو دنیا میں بہت سے مشکل کام ہیں، ہر فن کار فن پاروں کی تلاش میں بڑی جانفشانی کرتا ہے لیکن میں صرف اپنے فن سے واقف ہوں اور دوسروں کی طرح بہکنے میں عار محسوس نہیں کرتا کہ میرا کام بھی بہت مشکل ہے۔ کہانی کی تلاش افسانہ نگار کے لئے دردِ زہ سے کم نہیں ہے جس طرح کوئی ماں بچے کو جنم دیتے ہوئے زندگی کی سب سے بڑی تکلیف سے دوچار ہوتی ہے، اسی طرح افسانہ نگار نئی کہانی کا پلاٹ تلاش کرتے ہوئے وہی تکلیف محسوس کرتا ہے اور پھر جب نئی کہانی اس کے ذہن میں اتر آتی ہے تو وہ ایک خوشگوار کیفیت اور ایک سکون محسوس کرتا ہے اور بڑے چاؤ سے کہانی کی نوک پلک سنوارنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اسے اپنی کہانی سے اپنے بچے کی طرح محبت ہوتی ہے۔

وہ بھی ایسی ہی ایک شام تھی۔ نئی کہانی لکھنی تھی لیکن ذہن میں تاریکیاں رقص کر رہی تھیں۔ درجنوں صفحات ردی کی ٹوکری میں بھرے ہوئے تھے، ہر چیز پر غصہ آ رہا تھا۔ ذہن پر جھنجلاہٹ سوار تھی۔ نہ جانے دماغ کو کیا ہو گیا تھا، حالانکہ میں ان لوگوں میں ہوں، قلم اٹھایا اور لکھنا شروع کر دیا، خیالات ذہن میں خود بخود آتے رہتے ہیں، لیکن آج گاڑی کچھ ایسی اٹکی تھی کہ چلنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ اس وقت گھر میں رہنا ٹھیک نہیں ہے، کہیں باہر نکل جانا چاہئے تاکہ ذہن تازہ ہو جائے میں نے سوچا۔ اور دوسرے کمرے میں جا کر لباس تبدیل کیا اور باہر نکل آیا۔ گلیاں اور سڑکیں طے کرتا ہوا میں اپنے پسندیدہ علاقے میں نکل آیا۔

یوں تو ہمارا چھوٹا سا شہر بے حد خوبصورت ہے، چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ ہے لیکن مارگلہ کے سرسبز ڈھلوان مجھے بے حد پسند ہیں۔ یہ علاقہ جنت نظیر ہے۔ ڈھلوان پر پھیلے ہوئے لیچیوں کے درخت شام کی کجلاہٹ میں بے حد حسین معلوم ہوتے ہیں۔ ڈھلان کے اختتام پر بھی باغات ہیں اور تقریباً دو میل کے محیط پر پھیلے ہوئے باغات کے بعد اونچی نیچی چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جن کا اختتام میں آج تک نہیں دیکھ سکا۔ ویسے ان چٹانوں کے درمیان میں کہیں کہیں خود رَو درختوں کے جھنڈ موجود ہیں۔

سرسبز ڈھلانوں کو دیکھ کر میرے ذہن سے بوجھ ہٹ گیا۔ لیچیوں کے جھومتے ہوئے درختوں کے درمیان سے ہوا گنگناتی ہوئی گزر رہی تھی۔ میرے قدم خود بخود آگے بڑھنے لگے، درختوں کی موسیقی نے مجھے بے خود کر دیا۔ لیچیوں کی میٹھی میٹھی خوشبو خوابوں کی وادیوں میں لے جا رہی تھی۔ اور میں بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ آگے اور آگے۔ مجھے احساس بھی نہیں ہوا کہ طویل ڈھلان کب ختم ہوا اور کب میں باغ میں داخل ہوا۔ گھنے درخت ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے تھے اور میں ان سرگوشیوں سے بے خبر آگے چلتا جا رہا تھا۔ شام گہری اور گہری ہو رہی تھی، پھر مجھے بوڑھے تلسی کی جھونپڑی کا چراغ نظر آیا اور میں چونک پڑا۔ تلسی جھونپڑی کے باہر چارپائی پر بیٹھا ایک تھال میں پڑی ہوئی دال سے کنکریاں چن رہا تھا۔ میرے قدموں کی چاپ پر اس نے گردن اٹھا کر مجھے دیکھا۔

"سلام بابو جی ___" اس نے حسب عادت کہا۔

میں اکثر اس طرف آتا تھا، اس لئے تلسی سے میری جان پہچان تھی۔

"سلام تلسی چاچا، کیا ہو رہا ہے" میں نے بھی حسب عادت کہا۔

"بس جندگی گجر رہی ہے بابو جی، کدھر چل دیئے۔"

"ایسے ہی گھومنے جا رہا ہوں۔ ذرا چٹانوں تک جاؤں گا۔"

"اندھیرا پھیلنے سے پہلے آ جانا بابوجی! اندھیرے میں وہ چٹانیں محفوظ نہیں ہوتیں۔"

"کیوں، میرے خیال میں وہاں درندے نہیں ہیں؟"

"درندے کہاں نہیں ہوتے بابوجی!" تلسی فلسفیانہ انداز میں بولا پھر کہنے لگا: "ویسے آج منگل ہے۔ آپ مسلمان لوگ ہیں ہماری باتوں کو نہیں مانتے مگر ہمارے اکیدے کے مطابق (عقیدے کے مطابق) آج بری روحیں آباد (آزاد) ہوتی ہیں، اور ایسے ہی ویرانے ان کا مسکن ہوتے ہیں۔"

"اوہ، کیا تم نے ان چٹانوں میں روحوں کو بھٹکتے دیکھا ہے تلسی؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔ میرے سوال پر تلسی خاموش ہو گیا۔ چند لمحات وہ دال کے دانوں پر نظریں جمائے رہا، پھر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس پر کچھ سراسیمگی کے آثار نظر آنے لگے۔

"منگل کے دن ہم روحوں کے بارے میں بات چیت بھی نہیں کر سکتے بابوجی۔ رام رام ـــــ" اس نے دال کے چننے اور بغیر چننے دانے ملاتے ہوئے کہا اور جلدی سے اٹھ کر اندر چلا گیا۔ میں دل ہی دل میں ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ان ہندوؤں کا مذہب بھی توہمات کی بنیاد پر رکھا گیا ہے۔ ان کی مکمل تاریخ دیوی دیوتاؤں، بھوتوں اور پلیدوں سے بھری پڑی ہے۔ پھر بوڑھے تلسی کو منگل کے دن بری روحیں نظر آتی ہیں، تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ میں آگے بڑھ گیا۔ حالانکہ یہاں تک آنے کے بعد خاصی ذہنی شگفتگی حاصل ہو گئی تھی، لیکن نہ جانے کیوں میرے قدم آگے ہی بڑھ رہے تھے، واپس جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں چٹانوں کے نزدیک پہنچ گیا اور پھر اونچی نیچی، گول تکونی اور نکیلی چٹانوں کے درمیان آگے بڑھتا رہا۔ آخر ایک بڑی چٹان کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ یہ چٹان کافی اونچی تھی اور یہاں سے قرب و جوار کے مناظر نظر آتے تھے۔ کئی بار اس چٹان پر بیٹھ کر میں بہت سی کہانیاں جنم دے چکا تھا۔ اس وقت بھی میں کچھ دیر اس چٹان پر بیٹھنا چاہتا تھا۔

سطح چٹان اس طرح شفاف تھی، اس پر بیٹھ کر مجھے ایک عجیب سے سکون کا احساس ہوا۔ میں نے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگائی اور اس کے چھوٹے چھوٹے کش لیتے ہوئے دور تک نظریں دوڑانے لگا۔ اندھیرے کے سیلاب نے ماحول کو غرق کر لیا تھا اور ـــــ تلسی کے جھونپڑے کا چراغ جگنو کی طرح چمک رہا تھا۔ پراسرار لیکن دلکش ماحول، میری روح سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ فضا میں تحلیل ہونے لگی، وہ اضطراب جو میرے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا تاریکی میں گم ہو گیا۔ ایک پراسرار سناٹا میرے ذہن پر چھانے لگا۔ اور نہ جانے کب تک میں اس سحر میں ڈوبا رہا۔ پھر سگریٹ کے سرے پر سلگتی ہوئی آگ نے میری انگلیوں کو چوم کر مجھے اس سحر سے نکال دیا اور میں نے جلدی سے سگریٹ پھینک دیا۔ خاصا وقت ہو چکا تھا اور پھر مجھے سکون بھی مل گیا تھا، اس لئے میں نے واپسی کا قصد کیا۔ میں چٹان پر کھڑا ہو گیا اور پھر میں نیچے اترنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ ایک انسانی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

وہ انسانی کراہ تھی۔ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہاں کون ہو سکتا ہے۔ میں نے اسے اپنی سماعت کا واہمہ قرار دیا اور نیچے اترنے لگا۔ جونہی میں چٹان سے نیچے

اترا مجھے کراہ پھر سنائی دی۔ اور اس بار اس کی سمت بھی معلوم ہو گئی تھی۔

"اوہ — اف — اوہ —"

انسانی کراہ پھر سنائی دی اور میں اس طرف جھپٹ پڑا۔ نہ جانے کون ہے اور اسے کیا تکلیف ہے میرا دل ہمدردی سے بھر گیا۔ چند لمحات میں میں چٹان کے دوسری سمت پہنچ گیا۔ چٹان کا یہ حصّہ آدھی چٹان تک کچھ کھلا تھا اور اس کھلے حصّے میں ایک انسانی جسم نظر آ رہا تھا۔

"کو — کون ہے؟" ایک لرزتی ہوئی آواز مجھے سنائی دی۔ اس آواز میں کمزوری تھی۔ کرب تھا۔ میں کچھ اور آگے بڑھ گیا۔ کافی دیر سے میں اس ماحول میں تھا، اس لئے میری آنکھیں تاریکی سے مانوس تھیں۔ میں نے اس باریش بوڑھے کو دیکھ لیا جو زمین پر چت لیٹا ہوا تھا۔ میں جلدی سے اس کے نزدیک پہنچ کر گھٹنوں کے بل جھک گیا۔

"کون ہو تم، جواب دو۔" بوڑھے کی آواز پھر سنائی دی۔

"ایک انسان ہی ہوں، آپ کون ہیں اور آپ کو کیا تکلیف ہے؟" میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"اگر تمہارے پاس ماچس ہو تو کونے میں رکھا چراغ روشن کر دو، بڑی مہربانی ہو گی۔" بوڑھے نے بدستور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ اور میں نے جیب سے ماچس نکال کر ایک تیلی جلائی۔ کونے میں رکھا کڑوے تیل کا چراغ نظر آ گیا اور چند لمحات کے بعد وہاں روشنی پھیل گئی۔ روشنی میں میں نے بوڑھے کو دیکھا۔ سفید داڑھی سر کے بال اور بھنویں تک سفید تھیں۔ جسم پر بھی سفید لباس تھا، لیکن وہ دونوں ٹانگوں سے معذور تھا۔ گلے میں ہزار دانوں کی تسبیح پڑی ہوئی تھی۔ قریب ہی لکڑی کی ایسی کھڑاویں رکھی تھیں جنہیں معذور لوگ ہاتھوں سے استعمال کرتے ہیں۔ ایک طرف کورا مٹکا اور ایک آبخورہ رکھا تھا۔ دوسری طرف اینٹوں کا چولہا تھا جس میں راکھ نظر آ رہی تھی۔ چولہے پر ایک دیگچی رکھی تھی اور قریب ہی دو تین ٹین کے ڈبے نظر آ رہے تھے۔ یہ اس فقیر کی کٹیا کا اثاثہ تھا۔

مجھے حیرت ہوئی، ابھی ایک ہفتہ قبل بھی میں اس طرف آیا تھا لیکن یہاں کسی کا وجود نہ تھا۔ یا پھر میں نے دیکھا ہی نہیں ہو گا کیونکہ میں چٹان کے اس طرف کبھی نہیں آیا تھا۔ پورے ماحول کا جائزہ لے کر میں بزرگ کے نزدیک آ گیا۔ بوڑھے کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد بوڑھے نے آنکھیں کھولیں اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا:

"پانی — مجھے ذرا سا پانی پلا دو۔"

میں جلدی سے اٹھا اور آبخورے میں پانی لے کر اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ میں نے بوڑھے کو سہارا دے کر اٹھایا اور آبخورہ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ بوڑھا کافی پیاسا تھا۔

"اور دوں؟" — میں نے پوچھا، لیکن اس نے انکار میں گردن ہلا دی اور گہری گہری سانس لینے لگا۔ ویسے اسے کچھ سکون ہو گیا تھا، کیونکہ اس کی سانسیں اعتدال پر آنے لگیں۔

"تم اس طرف کیسے نکل آئے بیٹے؟" اس نے محبت بھری آواز میں پوچھا۔

"میں سیلانی آدمی ہوں بابا، اکثر ادھر آ جایا کرتا ہوں۔

مگر میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"میں تو بہت دن سے یہاں ہوں، زندگی کی آخری سانسیں پوری کر رہا ہوں۔ بس ایک خواہش دل میں ہے، لیکن اپنی کمزوری اور ناتوانی کی وجہ سے پوری نہیں کر سکا۔ کیا تم میری مدد کرو گے بیٹے؟"

"کیا بات ہے بابا؟" میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

"زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے بیٹے، اور — پھر مجھے زندہ رہنے کی خواہش بھی نہیں ہے کسی بھی وقت فرشتۂ اجل میرے پاس آسکتا ہے۔ مجھے یہاں اس چٹان کے نیچے مر جانے کا دکھ ہے، جنگلی جانور میری لاش نوچ نوچ کر کھا جائیں گے میں یہ نہیں چاہتا۔"

"اوہ، میں آپ کو شہر لے چلوں بابا، میرے گھر میں آپ کافی آرام محسوس کریں گے، میں آپ کا علاج بھی کراؤں گا۔"

"تم بڑے رحم دل ہو بیٹے، تمہیں اس کا اجر ملے گا۔ لیکن شہر چھوڑے ہوئے ایک جگ بیت گیا، اب مجھے دنیا اور دنیا والوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے اپنی زندگی دنیا سے دور رہ کر گزاری ہے آخری وقت میں پھر دنیا میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ تم میری اگر ایک مدد کر سکو تو تمہارا احسان مرنے کے بعد بھی نہیں بھولوں گا۔"

"بتائیے بابا، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟" میں نے ہمدردی کے جذبے سے مغلوب ہو کر کہا۔

"ان چٹانوں کے اختتام پر ایک مسجد ہے، پرانی اور ویران مسجد۔ برسوں پہلے یہاں ایک چھوٹی سی آبادی تھی، آبادی ہندو تھی، پھر ایک بزرگ کا ادھر سے گزر ہوا اور انہوں نے اس بستی میں رک کر اپنے مذہب کی تبلیغ کی تب یہاں کے سیدھے سادے لوگ مسلمان ہو گئے۔ مسجد انہیں بزرگ نے بنائی تھی، مگر پھر آہستہ آہستہ بستی تباہ ہو گئی۔ اور مکانات کے نشان تک مٹ گئے لیکن مسجد اسی طرح سلامت ہے۔ گو وقت نے اس کے نقش و نگار بگاڑ دیئے ہیں لیکن عمارت کسی حد تک باقی ہے، میری خواہش ہے کہ اس مسجد میں جان دوں، میں معذور ہوں، وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگر تم مجھے اس مسجد میں پہنچا دو، تو میری آخری خواہش پوری ہو جائے۔"

"مسجد یہاں سے کتنی دور ہے بابا؟" میں نے پوچھا۔

"بس ایک میل سے زیادہ نہیں ہے۔" بوڑھے نے مجھے امید و بیم کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایک میل —" میں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔ ظاہر ہے بوڑھا اپنے قدموں سے نہیں چل سکتا تھا۔ مجھے اسے پیٹھ پر لاد کر ہی لے جانا ہوگا، رات کا وقت تھا اور پھر خطرناک علاقہ۔ "کیوں نہ یہ کام کل پر رکھا جائے بابا، کل دن میں میں آجاؤں گا اور تمہیں مسجد تک پہنچا دوں گا۔"

"کل کبھی نہیں آئے گی بیٹے، اور پھر مجھے اپنی سانسوں پر بھروسہ نہیں ہے، تم میرے اوپر یہ احسان کر دو، اس

پیارے بچوں کیلئے

محمود خاور کی خوبصورت کتابیں

جاسوسی ناول

لطیفے

پراسرار ناول

ٹارزن

معلومات

دستگار رنگ کتاب کلب ۲۷ اردو بازار کراچی 216361

کے بدلے میں میں تمہیں وہ کچھ دوں گا جس کا تم تصور بھی نہیں
کر سکتے۔"

میں نے غور سے اس اپاہج بوڑھے کو دیکھا، اور پھر
میری نظریں چاروں طرف بھٹکنے لگیں، یہ معذور بوڑھا مجھے
کیا دے گا، کیا اس کے پاس کوئی پوشیدہ دولت ہے، پھر
میں نے اس برے خیال کو فوراً ذہن سے نکال دیا۔ مجھے
یہ کام صرف نیکی حاصل کرنے کے لئے کرنا چاہئے، کسی طمع
سے ثواب ختم ہو جائے گا۔ مگر مسئلہ وہی تھا۔ میں بھی زیادہ
طاقتور آدمی نہیں ہوں۔ بوڑھا گو بہت توانا نہیں تھا لیکن
بہر حال تیس پینتیس سیر سے کسی طرح کم نہیں ہو گا۔ اس وزن
کو لاد کر اندھیرے میں چلنا آسان کام نہیں تھا۔ میں اسی
الجھن میں تھا کہ بوڑھا پھر بولا،

"مجھے لے کر چلنے میں تمہیں کسی قسم کی دشواری نہیں
ہو گی بیٹے میرا وزن نہ ہونے کے برابر رہ جائے گا۔ تم مجھے
اٹھا کر دیکھ لو۔"

میں نے اب مزید سوچنے کا ارادہ ترک کر دیا، بوڑھے
کی التجا کو ٹھکرانا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے
رضامندی ظاہر کر دی اور بوڑھا خوش ہو گیا، پھر میں نے
بوڑھے کو سہارا دے کر اٹھایا اور اسے پشت پر لاد لیا۔
بوڑھے نے میری گردن میں بانہیں ڈال دی تھیں۔ اس کا
کہنا بالکل درست تھا اس کے جسم میں کوئی وزن نہیں تھا۔
مجھے اس کی بے وزنی پر حیرت ہوئی۔ بہر حال ایک میل کا
سفر تھا۔

"مجھے مسجد کا راستہ بتاتے چلو، کیا کوئی سامان بھی
لینا ہے؟"

"سامان کا کیا کرنا ہے، موت کے بعد کسی چیز کی ضرورت
نہیں رہتی۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

ویسے اس کی آواز پر مجھے حیرت ہوئی تھی کیونکہ اب
اس کی آواز میں وہ نقاہت نہیں تھی جو چند ساعت قبل
تھی۔ بہر حال میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی اور آگے
بڑھنے لگا۔ بوڑھا مجھے راستہ بتاتا جا رہا تھا ۔۔۔ اور میں
سبک رفتاری سے چل رہا تھا۔ میرے دل میں بس ایک
خیال تھا۔ کہ میں نیکی کر رہا ہوں۔ ایک قریب المرگ انسان
کی آخری خواہش پوری ہو جائے یہ بہت اچھی بات تھی۔
میں چلتا رہا، سفر کافی طویل محسوس ہوا، لیکن مجھے تھکن کا
احساس نہیں تھا۔ ماحول بے حد تاریک اور خوفناک تھا لیکن
بوڑھے کی موجودگی میں مجھے اس کا احساس نہیں تھا۔ پھر چٹانی
سلسلہ ختم ہو گیا اور ایک چھوٹا سا میدان نظر آنے لگا ۔۔۔
میدان کے اندر ٹوٹے پھوٹے کھنڈرات سے نظر آ رہے
تھے اور سامنے ایک گنبد موجود تھا۔ زمانے کی کہن سالی کا
شکار یہ گنبد نہ جانے کب کی کہانی دوہرا رہا تھا۔ یہی وہ مسجد
تھی جس میں بوڑھے نے آنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ میرے
قدم اور تیز ہو گئے، اور چند منٹ کے بعد میں مسجد کے
دروازے کے سامنے تھا۔

لیکن اچانک میرے قدم رک گئے۔ میں نے کسی شیر
کی غراہٹ محسوس کی تھی اور میری نگاہ مسجد کے دروازے
کی طرف اٹھ گئی۔ تاریکی میں میں نے شیر کی چمکتی ہوئی آنکھوں
کو دیکھا جو مجھے گھور رہی تھیں اور میرے اوسان خطا ہو گئے۔
اچانک شیر زور سے گرجا اور میں اچھل پڑا۔

"خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے، یہ تیرا کچھ
نہیں بگاڑ سکے گا۔ بڑھتا چل۔"

بوڑھے کی آواز سنائی دی، مگر مجھ میں آگے بڑھنے
کی ہمت نہیں تھی۔ ویسے میں حیران بھی تھا، اس علاقے
میں شیر کی موجودگی حیرت انگیز تھی۔ میں نے کبھی اس بارے

میں نہیں سنا تھا۔ شیر پھر گرجا اور میں نے بوڑھے کو اتارنے کی کوشش کی۔

"نہیں، نہیں یہ کیا کر رہا ہے، میں کہہ چکا ہوں کو شیر تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ آگے بڑھ اور مسجد کے دروانے سے اندر داخل ہو جا۔"

"میں اندر نہیں جا سکتا۔" میں نے ہمت ہار دی تھی۔

"میں یہاں تمہیں اتارے دیتا ہوں، تم خود اندر جانے کی کوشش کرنا۔"

"کیا بکواس کرتا ہے۔" بوڑھے نے طیش کے عالم میں کہا۔

بھونکتے ہوئے خونخوار بھیڑیے میری طرف لپکے لیکن اس کے ساتھ ہی دوسرا خوفناک واقعہ ہوا۔

جیسے ہی ایک بھیڑیا مجھ پر اچھلا اچانک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

سیاہ نیولا

عمران ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ اب خوبصورت کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ کراچی

۳۷۔ اردو بازار کراچی

"جب میں کہہ رہا ہوں کہ وہ تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تو پھر تو کیوں ڈر رہا ہے، آگے بڑھ اور اندر داخل ہو جا۔"

میں بوڑھے کا لہجہ سن کر چونک پڑا۔ اس میں تحکم تھا۔ حالانکہ اس بوڑھے کو میرا شکر گزار ہونا چاہئے تھا کہ میں بغیر کسی لالچ کے اسے یہاں تک لایا تھا۔ وہ الٹی دھونس جما رہا تھا۔ دوسری طرف شیر برابر غرا رہا تھا۔ مجھے خوف تھا کہ کسی بھی وقت وہ مجھ پر حملہ آور ہو کر ہم دونوں کو چٹ کر سکتا ہے، چنانچہ مجھے بھی غصہ آ گیا۔

"مجھے افسوس ہے بڑے میاں، میں بے مقصد جان دینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ نیکی اپنی جگہ زندگی بچانا بھی ضروری ہے۔"

"اگر تو نے مجھے اندر نہ پہنچایا تو بھی تیری زندگی بچنا مشکل ہے۔ اندر چل ورنہ نقصان اٹھائے گا۔" بوڑھے نے کہا۔ اور اچانک میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اپاہج بوڑھے کی ٹانگیں گھٹنوں کے پاس سے سوکھی ہوئی اور بے جان چیچھڑے کی طرح تھیں، بظاہر ان میں کوئی جان نہیں تھی۔ لیکن دوسرے لمحے دونوں بے جان ٹانگیں میرے پیٹ پر لپٹ گئیں، دو لجلجے سانپ جیسی ٹانگیں۔ میں نے دونوں ہاتھوں کی طاقت ان ٹانگوں کی گرفت ڈھیلی کرنے میں صرف کر دی۔ لیکن اس لجلجاہٹ سے مجھے پھریریاں آ رہی تھیں — پوری کوشش کے باوجود میں ان کی گرفت ڈھیلی نہیں کر سکا اور اچانک مجھے اپنے پیٹ پر دباؤ محسوس ہوا۔ ٹانگوں کی گرفت سخت ہو رہی تھی۔ مجھے سخت تکلیف ہونے لگی اور میں نے جھنجھلاہٹ میں بوڑھے کو نیچے پھینک دینے کی کوشش کی، لیکن بوڑھا کسی جونک کی طرح مجھ سے لپٹا ہوا تھا۔ میں کافی کوشش کے باوجود اسے نیچے گرانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اور میری سانس پھولنے لگی۔ مجھے اپنی آنکھیں حلقوں

سے اُبلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

"کیوں بچو، کیا خیال ہے، آگے بڑھ رہا ہے کہ نہیں۔ اگر تو آگے نہ بڑھا تو میں اسی طرح تیرا دم گھونٹ کر تجھے مار ڈالوں گا۔"

"یہ کیا حرکت ہے بوڑھے شیطان، کیا میری نیکی کا یہی صلہ ہے؟" میں نے کہا۔

"صلہ تجھے مل جائے گا یہ میرا وچن ہے، مگر اندر جانے کے بعد۔" پہلی بار اس کے منہ سے ہندی کا لفظ ادا ہوا تھا۔ میں نے اس سے اب تک کی گفتگو پر غور کیا، تو مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اس نے نیکی اور اجر کا ذکر ضرور کیا تھا، لیکن اب تک خدا کا نام ایک بار بھی نہیں لیا تھا۔

کیا وہ ہندو ہے؟ میں نے سوچا اور اچانک مجھے کسی کی گفتگو یاد آگئی کہ آج منگل ہے سرکار اور منگل کے دن بُری روحیں ان چٹانوں میں بھٹکتی ہیں۔ تو۔۔۔ تو کیا یہ بوڑھا کوئی بُری روح ہے، میرے دل میں خوف جاگزیں ہو گیا۔

اور میں پھر بوڑھے کو گرانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کوشش میں میں زمین پر چت لیٹ گیا اور بوڑھے کو زمین سے رگڑنے لگا، لیکن میری انتہائی کوشش کے باوجود بوڑھے کی گرفت ڈھیلی نہ ہوئی۔ میرے جسم کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا۔ دوسری طرف مجھے شیر کا خوف بھی ستا رہا تھا۔ یقیناً وہ آہٹیں سن کر اس طرف متوجہ ہو جائے گا۔ پھر بوڑھے کے ساتھ میری بھی خیر نہیں۔

"کتنی ہی کوشش کرلے بالک، مجھے تیری پیٹھ سے کوئی نہیں اتار سکے گا۔" بوڑھے کی آواز سنائی دی۔

میں بُری طرح تھک گیا۔ بوڑھے کی مریل ٹانگیں اب بھی سانپ کی طرح میرے جسم سے لپٹی ہوئی تھیں اور ہاتھ گردن میں تھے۔

"کیوں اپنی جان سے ہاتھ دھو رہا ہے مورکھ۔۔۔ میں تجھے گردن دبا کر مار دوں گا، ورنہ میرا کہا مان لے، تو اگر آگے بڑھے تو شیر تیرا کچھ نہیں بگاڑے گا، حالانکہ تو مسلمان ہے۔"

"کیا تم مسلمان نہیں ہو؟" میں نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔ اور بوڑھا کریہہ آواز میں ہنسنے لگا۔

"میں کیا ہوں، یہ تجھے اندر چل کر معلوم ہو جائے گا۔ تو اندر چل۔"

میں اس بوڑھے کے ہاتھوں بے بس ہو چکا تھا۔ موت میری آنکھوں میں رقص کر رہی تھی۔ اگر شیر سے جان بچانے کی کوشش کرتا، تو بوڑھا موجود تھا۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس شیطان کی بات مان لوں۔ چنانچہ میں ہمت کرکے آگے بڑھا۔ شیر بالکل سامنے موجود تھا۔ وہ اب بھی دھاڑ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور موت کا انتظار کرنے لگا۔ میرے قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ اچانک شیر کی دھاڑ مجھے اپنے کانوں کے بالکل قریب سنائی دی اور میری چیخ نکل گئی۔ ایک ہوا سی میرے قریب سے گزر گئی تھی۔ شاید شیر کی چھلانگ خطا ہو گئی تھی۔ میں نے خوف سے آنکھیں کھول دیں۔ میں مسجد کے دروازے سے زیادہ سے زیادہ دس گز دور تھا۔ اور شیر نظروں سے غائب تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھنے کی کوشش کی، لیکن بوڑھے نے دونوں ہاتھوں سے میرے کان پکڑ لیے۔

"پیچھے مت دیکھ مورکھ، بس آگے بڑھ اور جلدی سے اندر چل۔"

میں بوڑھے کے ہاتھوں میں بے بس تھا۔ میں نے قدم آگے بڑھائے، لیکن اچانک مسجد کے دروازے پر آگ بھڑک اٹھی۔ آن کی آن میں شعلے اتنے بلند ہوئے کہ مسجد کا دروازہ ان

سے ڈھک گیا۔ شیر کے بعد یہ نئی مصیبت تھی۔ میں شعلوں کی تپش سے گھبرا گیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ مگر اسی وقت بوڑھے کی مہر میرے پیٹ پر سخت ہو گئی۔

"پرواہ مت کر، یہ آگ تیرے شریر کو نقصان نہیں پہنچائے گی۔ آگے بڑھ جلدی کر، یہ وقت پھر نہیں آئے گا۔"

"بکواس مت کر خبیث بوڑھے۔ میں آگے نہیں جاؤں گا چاہے تو کچھ بھی کر لے۔" اور میں نے پلٹ کر پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔ بوڑھے نے مجھے روکنے کی انتہائی کوشش کی لیکن میں ہر تکلیف برداشت کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ میں مسجد سے کافی دُور نکل آیا اور اچانک مجھے اپنی کمر اور شانے ٹوٹتے محسوس ہوئے۔ بوڑھے کا وزن اچانک دس گنا بڑھ گیا تھا اور ــــــ میں اس وزن کو لے کر نہیں دوڑ سکتا تھا۔ میں نڈھال ہو کر گر پڑا۔ اور نیچے گرتے ہوئے پتھر کا ایک کونہ میرے سر سے ٹکرایا میرے حواس تاریکی میں گم ہو گئے۔

پھر جب مجھے ہوش آیا، تو سورج نکل آیا تھا میں اسی جگہ پڑا تھا جہاں گرا تھا! اور خبیث بوڑھا اسی طرح میری کمر سے چپکا ہوا تھا۔ اس کی ٹانگیں اور ہاتھ اب بھی میری گردن اور کمر میں پھنسے ہوئے تھے۔ میرے نتھنوں سے ایک بدبو ٹکرائی اور میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ قریب دو سیاہ بلیاں مری پڑی تھیں! ان کے جسموں سے کیڑے رینگ رہے تھے۔ اور خبیث بوڑھا ہاتھ بڑھا کر ان کیڑوں کو اٹھا رہا تھا! اس کے ساتھ ہی مجھے منہ چلانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کیا وہ کم بخت ان کیڑوں کو کھا رہا ہے۔ میں نے سوچا اور میری طبیعت نالش کرنے لگی۔

"کیا تجھے بھوک لگ رہی ہے، مگر میں یہ لذیذ غذا تجھے نہیں کھلا سکتا کیونکہ تجھ سے مجھے کام لینا ہے۔" بوڑھے کی آواز سنائی دی۔

"مجھے چھوڑ دے شیطان، میں نے تیرے ساتھ نیکی کی تھی، تو مجھے اس کا یہ صلہ دے رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"صلہ تو میں تجھے دیتا، مگر تو نے خود ہی اسے نہیں حاصل کیا۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ مجھے اس مسجد کے اندر پہنچا دے، اس کے بدلے میں میں تجھے ایک شکتی دوں گا کہ سنسار کا ایک ایک منش تیرا تابع ہو گا۔ تیری ہر خواہش پوری ہو جائے گی سنسار کی حسین ترین کنیائیں تیری داسی ہوں گی۔ جو تجھے ایک نگاہ دیکھے گی گھائل ہو جائے گی۔ تیری نظریں زمین میں چھپے ہوئے خزانے دیکھ سکیں گی۔ تیری دی ہوئی مٹی کی چٹکی

حسین، پُراسرار، فتنہ گر، فتنہ ساز
چمپا کلی کی آپ بیتی

چمپا کلی

"اب کتابی شکل میں
شائع ہو گیا ہے
اب تک پڑھے جانیوالے تمام پُراسرار
سلسلوں میں سب سے زیادہ پُراسرار
سلسلہ ایک ایسی پُراسرار عورت کی
داستان جس کی فتنہ انگیزیاں عروج پر
تھیں۔ یہ کتاب نہ پڑھی تو آپ
نے کچھ بھی نہیں پڑھا،
ہر بک سٹال پر دستیاب ہے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ اردو بازار کراچی فون ۲۱۶۳۶۱

ہر مرض کی دوا ہوگی ۔ یہ میرا وچن ہے ۔ مگر تو میرا کام کر دے ۔"

" اگر تو اتنی ہی قوت رکھتا ہے ، تو خود کیوں نہیں مسجد میں چلا جاتا ؟"

" افسوس یہی میرے بس میں نہیں ہے ۔ مسجد میں مسلمان ہی جا سکتا ہے ، تو ہی مجھے پیٹھ پر لاد کر اندر لے جا سکتا ہے ۔ اندر جاتے ہی میں تجھے چھوڑ دوں گا ۔ اور پھر تو سنسار کا سب سے بلوان منش ہوگا ۔"

" مگر تو مسجد میں کیوں جانا چاہتا ہے ؟"

" اس بارے میں تجھے نہیں بتایا جا سکتا ۔ بس تو ہر خطرے سے بے پرواہ ہو کر میرا کام کر دے ۔ بدلے میں کسی قسم کا خوف مت لا ، تیرا کچھ نہیں بگڑے گا ۔ اور اس کے بدلے میں جو کچھ تجھے ملے گا وہ تیرا جیون سپھل کر دے گا ۔"

" نہیں ، میں کسی قیمت پر یہ کام نہیں کر سکتا ۔ دیکھتا ہوں تجھ میں کتنی طاقت ہے ، تو ناپاک انسان ہے میں تجھے اپنے قدموں سے مسجد میں نہیں لے جا سکتا ۔ یہ میرے دین کے خلاف ہے ۔"

" تب تو زندگی بھر اسی عذاب میں مبتلا رہے گا میں ہمیشہ تیرے کندھوں پر سوار رہوں گا ، اس وقت تک جب تک تو میرا کام کرنے کے لئے تیار نہ ہو جائے ۔" اس نے غصے سے کہا ۔

اسی وقت میری نگاہ باغوں کے سرے کی طرف اٹھ گئی ، کچھ لوگ اس طرف آ رہے تھے میں غور سے انہیں دیکھنے لگا ۔ اور میں نے انہیں پہچان لیا ۔ وہ میرے والد ، میرے چچا اور ہمارا ملازم تھے ، بوڑھا آدمی تلسی تھا جو ان کے ساتھ آ رہا تھا ۔ میں خوش ہو گیا کہ اب وہ لوگ مجھے اس مصیبت سے نجات دلا دیں گے ۔ مگر اس وقت بوڑھے خبیث کی آواز سنائی دی :

" تیرے رشتہ دار آ رہے ہیں ، مگر تو انہیں کچھ نہیں بتا سکے گا ۔" اس نے اپنا کریہہ ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا اور میرے نتھنوں سے ایسی گندی بدبو ٹکرائی میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا ۔ اور بوڑھا قہقہے لگانے لگا مجھے یقین تھا کہ میرے والد اور چچا وغیرہ اس کے قہقہوں کی آواز سن کر ضرور اس طرف متوجہ ہو جائیں گے ۔ میں امید و بیم کی نظروں سے انہیں دیکھنے لگا ۔ یقیناً وہ لوگ مجھے ہی تلاش کر رہے تھے ۔ بوڑھا تلسی ان کی رہنمائی کر رہا تھا ۔ اور پھر میں نے پوری قوت سے والد صاحب کو آواز دی ۔ لیکن ـــ خود ہی حیران رہ گیا ۔ میرے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی اور بوڑھے کے قہقہے جاری تھے ، میں پھر چیخا لیکن بے سود ، میری آواز ہی نہیں نکل رہی تھی ۔

" یہ کیا کیا تو نے ذلیل انسان ؟" اس بار میں بوڑھے سے مخاطب ہوا ! اور آواز حیرت انگیز طور پر درست ہو گئی ۔

" کچھ نہیں ، تیری آواز اب میرے علاوہ اور کوئی نہیں سن سکے گا ۔ تو کسی کو کچھ نہیں بتا سکتا ۔ تو میری زبان میں بول سکتا ہے اپنی میں نہیں ۔"

یہ بے بسی کی انتہا تھی ، میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ اسی وقت شاید تلسی کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی ۔ وہ انگلی کے اشارے سے میرے والد کو اس طرف متوجہ کر رہا تھا ۔ اور وہ سب میری طرف دوڑنے لگے ۔ چند لمحات کے بعد وہ میرے قریب تھے ۔

" شارق ، شارق میرے بچے ، تجھے کیا ہو گیا ، یہ تیری کیا حالت ہو گئی ۔" والد صاحب مجھے سینے سے لگا کر بولے ۔

میں نے ان سے کچھ کہنا چاہا ، لیکن میری آواز بند تھی ۔ ان لوگوں نے مجھے اٹھایا ، بوڑھی جونک بدستور میرے کندھوں پہ سوار تھی ، پتہ نہیں وہ لوگ بھی اسے محسوس کر رہے تھے یا نہیں ۔

میرا خیال ہے وہ انہیں نہیں نظر آیا تھا ورنہ وہ اسے مجھ سے علیحدہ کرنے کی کوشش ضرور کرتے۔ میرے چچا، والد اور ملازم مجھے اٹھائے ہوئے چل پڑے۔ والد صاحب سخت پریشان تھے ان کی زبان سے عجیب عجیب کلمات نکل رہے تھے۔

"میں نے سمجھایا تھا سرکار کہ آج کے دن اس طرف نہ آئیں، یہ سرکار نہیں مانے میری جندگی ان ویرانوں میں گجری ہے سرکار، میں نے اپنی آنکھوں سے ان ویرانوں میں بھٹکتی روحوں کو دیکھا ہے ـــــ سرکار ہیں تو ایسے ہی جندگی گزارنی ہے ہم کا کہہ سکتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے تم تھوڑی دیر کے لئے بیہوش ہو جاؤ۔" بوڑھے نے میرے کان میں سرگوشی کی اور پھر اس کے ہاتھ کا دباؤ میری گردن کی پشت پر پڑنے لگا۔ اور میرا ذہن تاریکیوں میں گم ہونے لگا۔ چند لمحات کے بعد مجھے کچھ خبر نہ رہی، پھر جب آنکھ کھلی، تو میرے گرد بہت سے لوگ جمع تھے۔ بوڑھے کا لمبا جسم میرے نیچے دبا ہوا تھا۔ اور اس کی ٹانگیں میرے پیٹ پر رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اپنی والدہ کا ہاتھ پکڑنا چاہا جو میرے نزدیک بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں، مگر مجھے معلوم ہوا کہ میرا جسم بھی مفلوج ہے۔

"یہاں مجھے اور احتیاط کرنی پڑی ہے بالک ـــــ بے شک تمہاری زبان بند ہے، مگر تم لکھ کر انہیں اپنا اور میرا حال بتا سکتے تھے، اس لئے میں نے تمہارا جسم بھی سن کر دیا۔ اب تم صرف میری مرضی سے ہاتھ پاؤں ہلا سکتے ہو۔"

"او خبیث کتے، تو مجھے چھوڑے گا یا نہیں، آخر کب تک تو میرے پیچھے اس طرح پڑا رہے گا۔" میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ اور پھر اپنے قریب موجود لوگوں پر اپنی اس بات کا ردِعمل دیکھنے لگا لیکن سب اسی طرح بیٹھے تھے جس کا مقصد تھا کہ میری آواز اب بھی کوئی نہیں سن رہا۔

"چھوڑ دوں گا بالک، مگر شرط وہی ہے، تو مجھے مسجد میں پہنچا دے اور مہان شکتی حاصل کرلے۔"

"مگر تجھ جیسے ناپاک انسان مسجد میں نہیں داخل ہو سکتے۔"

"اسی لئے تو تیری ضرورت ہے، تو تو پاک ہے۔ تو مجھے لے کر مسجد میں چلا جائے تو کون روک سکتا ہے بس اندر پہنچانا تیرا کام ہے باقی میں خود دیکھ لوں گا۔"

"لیکن وہاں تو تم نے دیکھا تھا، وہاں شیر تھا اور پھر جب میں نے تجھے لے کر اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا تو دروازے پر شعلے بھڑک اٹھے تھے۔"

"تو ان شعلوں سے گزر سکتا تھا، جس طرح شیر تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکا، اسی طرح شعلے تیرے شریر کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ بس ہمت کی ضرورت تھی۔" اس نے جواب دیا اور میں لاجواب ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ ایک خیال آتا تھا، کہ اس بدبخت کی خواہش پوری کرکے خود کو اس مصیبت سے نجات دلاؤں۔ لیکن پھر دل کہتا تھا کہ یہ گناہِ عظیم ہوگا ـــ ایک ناپاک انسان کو مسجد میں لے جانا ایک مسلمان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ ادھر گھر والوں کو دیکھ دیکھ کر دل کڑھ رہا تھا۔ اسی کشمکش میں تھا کہ ایک ڈاکٹر اندر آگیا۔ ملازم اسے بلا کر لایا تھا۔ میرے ذہن پر جھنجھلاہٹ طاری ہونے لگی۔ بلاوجہ ڈاکٹر کو بلایا گیا ہے، یہ کیا کر سکے گا سوائے اس کے کہ چند انجکشن میرے جسم میں گھونپ دے گا اور الٹی سیدھی دوائیں دے دے گا۔ مگر میں کسی کو منع بھی نہیں کر سکتا تھا۔

وہی ہوا۔ ڈاکٹر نے میری نبض دیکھی اسٹیتھسکوپ سے سینے کا معائنہ کیا اور نسخہ لکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس

نے میرے بازو میں انجکشن بھی دیا اور فیس لے کر چلتا بنا۔ آپ ایک ایسے انسان کا تصور کیجئے جو اپنی بیماری کے بارے میں بخوبی جانتا ہو لیکن دوسروں کو کچھ بتانے سے قاصر ہو، نہ صرف بیماری بلکہ صحیح الدماغ ہوتے ہوئے اپنی کیفیت بھی نہ بتا سکتا ہو۔ میں زبان رکھتا تھا، بول سکتا تھا، لیکن کوئی بھی میری بات نہیں سن سکتا تھا۔ یہ کیسی بے بسی تھی۔ اور اس سے چھٹکارا کس قدر مشکل تھا۔ میرے گھر کے لوگ ڈاکٹر کی دوا کے اثر کا انتظار کرتے رہے۔ میرے حلق میں دوائیں ٹھونسی جاتی رہیں اور تمام دن گزر گیا۔ کڑوی کسیلی دوائیں میرے لئے زہر تھیں۔ اس کے علاوہ خوراک کی شکل میں کچھ نہیں ملا تھا۔ میں بھوک سے نڈھال ہونے لگا۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ بھوک اور کمزوری کی وجہ سے مجھ پر غشی طاری ہو گئی اور جب ہوش آیا تو رات کا ایک بجا تھا۔ میں نے قرب و جوار کا ماحول دیکھا۔ میری والدہ ایک کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئی تھیں۔ دوسری کرسی پر والد صاحب سو رہے تھے۔ وہ بے چارے میرے لئے جاگ رہے

تھے۔ کیسی تھکن اور کیسی پریشانی تھی ان کے چہروں پر۔ میرا دل رونے لگا۔ پھر مجھے اپنی بھوک کا بے پناہ احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ہاتھ اپنے پیٹ کی طرف رینگ گئے۔ وہی لمبی ٹانگیں پیٹ سے لپٹی ہوئی تھیں۔ مجھے گھن آنے لگی اور ساتھ ہی غصہ بھی۔

"کیا تم جاگ رہے ہو بوڑھے خبیث؟" میں نے زور سے کہا۔ اور مجھے اس کی کریہہ ہنسی سنائی دی۔

"جاگنے میں ہی کلیان ہے بالک۔ جو سو گیا اس نے بہت کچھ کھو دیا۔"

"میں بھوک سے مرا جا رہا ہوں، کیا اس طرح میں چند روز سے زیادہ زندہ رہ سکتا ہوں؟"

"تو خواہش کر بالک، بول کیا کھانا چاہتا ہے۔ جب تک میں تیرے ساتھ ہوں تیری شکتی مہان ہے، تو میری اچھا کے ساتھ جو دل چاہے کر سکتا ہے۔"

"تب پھر میرے لئے کھانا منگواؤ۔"

"تو خود منگوا ـــــ میں تیری پشت پر ہوں۔" اس نے کہا اور میں نے تجربے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر میں نے کھانے کی خواہش کی اور اپنے سامنے ایک خوبصورت خوان دیکھ کر حیران رہ گیا۔ گرم اور لذیذ کھانا موجود تھا۔ میری بھوک زوروں پر تھی۔ اور پھر اس وقت میرے ہاتھ پاؤں بھی آزاد تھے۔ بوڑھے کا بوجھ بھی پشت پر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور مجھے سکون محسوس ہوا۔ پلک جھپکی ہی تھی کہ خالی برتن غائب ہو گئے۔ میں نے چائے کی خواہش ظاہر کی اور آن کی آن میں گرم چائے موجود تھی۔ چائے پینے کے بعد میں لیٹ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد مجھے نیند آ گئی۔

دوسری صبح جب میری آنکھ کھلی تو میرے کانوں میں ایک آواز گونجی۔ یہ مانوس آواز تھی۔ میری والدہ تلاوتِ کلام پاک کر رہی تھیں۔ وہ ہمیشہ نماز کے بعد تلاوت کی عادی تھیں۔ والدہ دوسرے کمرے میں تھیں، لیکن ان کی دھیمی دھیمی آواز یہاں تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے اپنی پشت پر کلبلاہٹ محسوس کی اور پھر بوڑھے کی آواز سنائی دی:

"تو جاگ گیا؟"

"ہاں، کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چل یہاں سے نکل چل، یہ آواز مجھے بیاکل کر رہی ہے۔ میں اس آواز کو برداشت نہیں کر سکتا۔ جلدی کرو، میں سخت پریشان ہوں۔" اس نے کہا اور میری آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ یقیناً یہ ارداح پلید کلام پاک کے سامنے

نہیں ٹھہر سکتیں، کیوں نہ میں دوڑ کر والدہ کے کمرے میں پہنچ جاؤں۔ اس طرح اس سے چھٹکارا مل سکتا ہے۔

آپکی ذاتی لائبریری کیلئے

نادرہ خاتون کے ناول

نئے ایڈیشن نئے سرورق

حنا	۵۰/ روپے
شعاع	۵۰/ روپے
چلمن	۵۰/ روپے
کنول	۳۰/ روپے
دُردانہ	۳۵/ روپے
لبنیٰ	۳۰/ روپے
شگوفہ	۳۵/ روپے
عرفانہ	۳۵/ روپے

خواتین ڈائجسٹ اردو بازار کراچی

"اٹھ رہا ہے یا نہیں؟" اس کی آواز میں بے چینی تھی۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"جلدی یہاں سے نکل چل، اس وقت تجھے کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔"

میں نے قدم آگے بڑھائے اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اور پھر دروازے سے نکلتے ہی میں نے والدہ کے کمرے کی طرف دوڑنے کا قصد کیا لیکن وہ ملعون جیسے میرے ارادے کو بھانپ گیا۔

"مار ڈالوں گا، جان سے مار ڈالوں گا، اگر تو اس طرف بڑھا تو۔" اس کے ساتھ ہی میری ہڈیاں کڑکڑا اٹھیں اور میرے قدم رک گئے۔

"نکل چل مورکھ یہاں سے نکل چل، میرے شریر میں سوئیاں چبھ رہی ہیں۔" اس نے بدستور مجھے دباتے ہوئے کہا، اور مجبوراً مجھے دروازے سے باہر نکلنا پڑا۔

"چل یہاں سے دُور نکل چل۔ ہم اب اس گھر میں نہیں آئیں گے۔"

میں اب اس کے حکم کی تعمیل کے لئے مجبور تھا۔ میں اس کے اشاروں پر چلتا رہا۔ اور چند منٹ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرا رُخ اسی ڈھلان کی طرف ہے۔ میں چلتا رہا اور ڈھلان طے کر کے باغ میں داخل ہو گیا۔ اس کے اشارے پر میں تلسی کی جھونپڑی سے کافی فاصلے سے نکلا تھا۔ غالباً اسے اندیشہ تھا کہ تلسی مجھے دیکھ نہ لے۔ پھر ہم چٹانوں میں داخل ہو گئے اور طویل چٹانی فاصلہ طے کر کے ایک بار پھر اسی بوسیدہ مسجد کے سامنے جا پہنچے۔

لیکن میں ایک انوکھی بات دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کل ہم جس جگہ تک پہنچ گئے تھے آج وہاں پہنچنا مشکل تھا۔ کیونکہ مسجد کے چاروں طرف گہری خندق کھدی ہوئی تھی۔

جس میں پانی بھرا ہوا تھا، میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

"ہوں، تو انہوں نے راستہ بند کر دیا ہے، اگر میرا نام بھی باتدبو ہے وہ بوی۔ میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں، کیا خیال ہے بالک، اگر اس خندق پر پل بن جائے، تو تو مجھے اندر لے چلے گا؟"

"میں تجھے خانۂ خدا میں کبھی نہیں لے جاؤں گا مردود۔ چاہے میری زندگی ہی کیوں نہ چلی جائے۔" میں نے ایک عزم سے جواب دیا۔

"میں تیرے خاندان کو نشٹ کر دوں گا، میں تجھے ایسی سزا دوں گا کہ تو زندگی بھر یاد رکھے۔"

"کچھ بھی ہو۔ میں ایک گنہگار انسان ہوں، مگر اتنا بڑا گناہ نہیں کر سکتا کہ تجھ جیسے ناپاک پلید کو مسجد میں لے جاؤں۔"

"کیوں ہٹ کر رہا ہے بالک، تجھے ابھی تک میری قوت کا احساس نہیں ہوا، تو نے ابھی کیا دیکھا ہے میں تو چاہ رہا تھا کہ بغیر کچھ کئے تو راہ راست پر آ جائے، مگر تو اس کے لئے تیار نہیں ہو گا۔ ٹھیک ہے اب میری شکتی دیکھ، کیا تو سمجھتا ہے کہ میں تیرے کندھوں پر سوار رہ کر ہی تجھ سے کام لے سکتا ہوں، میں اس کے لئے مجبور نہیں ہوں۔ سن غور سے سن، آج سے تیری تباہی کا دور شروع ہو رہا ہے، میری شرط اب بھی برقرار ہے۔ جب تو میرا کام کرنے کے لئے دل سے تیار ہو جائے گا میں تجھے اسی چٹان کے نیچے مل جاؤں گا، لیکن اگر تو من میں کھوٹ لے کر آیا تو اندھا ہو جائے گا، میں جا رہا ہوں اگر تو اپنی تباہی سے گھبرا جائے، تو اسی جگہ آ جانا، میں تیری تمام تکلیفیں دور کر دوں گا۔"

میں دل میں خوش تھا کہ اب یہ بلا میرا پیچھا چھوڑنے والی ہے۔ اس نے مجھے دھمکیاں دی تھیں کہ مجھے تباہ و برباد کر دے گا، لیکن وہ سب بعد کی باتیں تھیں —— میں تو فی الحال اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔ لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ منحوس بڑھا ایسی شیطانی قوتوں کا مالک ہو گا جو میری دنیا تہہ و بالا کر دے گا۔

اچانک میں نے اپنے پیٹ سے بوڑھے کی لمبی ٹانگوں کو ہٹتے ہوئے دیکھا، وہ ٹانگیں لمبی ہو رہی تھیں اور پھر وہ زمین پر ٹک گئیں اور بوڑھے نے میرا جسم چھوڑ دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا بوڑھا اب اپاہج نہیں تھا، وہ اپنی مضبوط ٹانگوں پہ کھڑا تھا اور اس کی خونخوار نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"مجھے اس مسجد میں تیرے علاوہ اور کوئی نہیں لے جا سکتا یہ ایک گہرا راز ہے جو میں تجھے نہیں بتاؤں گا، لیکن یہ یاد رکھ لے مجھے اس مسجد میں داخل ضرور ہونا ہے اور تو ہی میرے کام آئے گا۔ میرا علم یہی بتاتا ہے کہ ایک دن تو میرے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے گا۔ ذلت اور رسوائی تیرا مقدر ہے، تو اس ذلت سے بچ سکتا ہے لیکن تیری ضد تجھے لے ڈوبے گی۔"

میں خاموشی سے اس کی گفتگو سنتا رہا۔ مجھے اس کے الفاظ کی پرواہ نہیں تھی۔ مجھے تو اس بات کی خوشی تھی کہ میں اس مصیبت سے بچ گیا۔ بوڑھا چند سیکنڈ اسی طرح کھڑا رہا۔ اور پھر گھوم کر واپس چل دیا۔ میں اس کی پشت دیکھتا رہا اور پھر دور سے مجھے اپنے والد صاحب کی آواز سنائی دی۔ اور میں چونک کر اس طرف دیکھنے لگا۔ وہ لوگ پھر مجھے تلاش کرتے ہوئے آئے تھے، میں نے بوڑھے کو دیکھا اور میرا منہ حیرت سے کھل گیا، بوڑھے کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔

حالانکہ اگر تیزی سے دوڑتے ہوئے بھی میدان کے دوسرے سرے تک جانے کی کوشش کی جاتی تب بھی آدمی اتنی جلد نہیں پہنچ سکتا تھا۔ لیکن پھر میری حیرت فوراً رفع ہوگئی میں بوڑھے کی پراسرار قوتوں کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا میرے والد، چچا اور ملازم دوڑتے ہوئے میرے پاس پہنچ گئے۔ میرے والد سخت پریشان تھے، کہہ رہے تھے:

"شارق، میرے بچے، میرے لخت جگر، تجھے کیا ہوگیا ہے بیٹے، تجھے کیا ہوگیا ہے۔"

"میں اب ٹھیک ہوں اباجان۔" میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ اور وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ بہرحال مجھے گھر لے جایا گیا۔ میری حالت اب بالکل درست تھی، گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن میں نے کسی کو اپنی بیماری کے بارے میں کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ظاہر ہے وہ لوگ ان پراسرار واقعات کا کوئی حل تلاش نہیں کر سکتے تھے! اور پھر ممکن ہے میری بات پر یقین بھی نہ کیا جاتا، چنانچہ میں خاموش رہا۔ یہ دو دن جس طرح گزرے تھے انہوں نے مجھے واقعی مریض بنا دیا تھا۔ بڑی نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ اس رات میں جلد ہی سوگیا۔ میں نے خواب میں بوڑھے باسدیو کو دیکھا، وہ عجیب بھیانک شکلوں میں میرے سامنے آرہا تھا۔ کبھی شکل بوڑھے کی اور بقیہ جسم بھینسے کا سر پر سینگ موجود تھے۔ اور وہ اس پوزیشن میں تھا جیسے اپنے نوکیلے سینگ میرے سینے میں بھونک دے گا۔ کبھی سر اس کا اور بقیہ جسم سانپ کا ہوتا، غرض ساری رات میں بھیانک خواب دیکھتا رہا۔ کئی بار خوف سے میری آنکھ کھل گئی، آنکھ کھلتے ہی میرے کانوں میں بلیوں کے رونے کی آواز سنائی دی اور خوف سے میرے جسم نے پسینہ چھوڑ دیا۔ بڑی بھیانک رات گزری تھی۔ صبح ہونے سے قبل پھر میری آنکھ لگ گئی تھی۔ اور اس وقت میں خود کو ایک ویران کھنڈر میں دیکھ رہا تھا۔ کھنڈر کی دیواریں شکستہ تھیں چھت سے اینٹیں نکل کر نیچے گر رہی تھیں اور میں ان سے بچ رہا تھا۔ ایک بار ایک اینٹ بالکل میرے سر کے پاس سے نکلی اور میں اچھل کر دیوار کے ساتھ جا لگا لیکن جس دیوار کا میں نے سہارا لیا تھا اس نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی اور ایک زور دار دھماکا ہوا اس کے ساتھ ہی مجھے ایک چیخ سنائی دی۔

پھر بہت سی آوازیں اور مجھے احساس ہوا کہ میں جاگ رہا ہوں اور وہ آوازیں میری والدہ، والد اور چچا کی ہیں۔ میں پھرتی سے اٹھ کر اپنے کمرے سے نکل آیا۔ تین کمروں سے گزر کر میں صحن میں پہنچ گیا جہاں میرے گھر کے افراد جمع تھے اور میری بہن سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ میری بہن مجھ سے چھ سال چھوٹی تھی اور اس وقت اس کی عمر ۱۰ سال تھی۔ اس سے ایک سال چھوٹا ایک بھائی بھی تھا میں صورت حال دریافت کرنے کے لئے ان کے نزدیک پہنچ گیا لیکن اس کی نوبت نہیں آئی کیونکہ غسل خانے کے دروازے پر میں نے ان تین سیاہ بلیوں کی لاشیں دیکھ لی تھیں جن کے سر غائب تھے۔ بلیوں کی کٹی ہوئی گردنوں سے بہا ہوا خون دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے انہیں اسی جگہ ذبح کرکے سر غائب کر دیئے گئے ہوں۔

"الٰہی خیر، یہ اچھی علامت نہیں ہے کسی نے ہمارے اوپر جادو کرانے کی کوشش کی ہے۔" والدہ صاحبہ سہمے ہوئے لہجے میں بولیں۔

والد صاحب روشن خیال آدمی تھے، لیکن اس وقت والدہ صاحبہ کے خیال کی تردید نہیں کر سکے۔ ان گردن کٹی سیاہ بلیوں کی یہاں موجودگی کا کوئی اور جواز

نہیں تھا۔ بہر حال انہوں نے کھوکھلے انداز میں والدہ کو
تسلی دی۔

"ہمارے اوپر جادو کون کرائے گا بیگم، ہماری تو کسی سے
دشمنی بھی نہیں ہے۔"

میں بالکل خاموش کھڑا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ ان
لوگوں کو تمام ماجرا سنا دوں۔ لیکن نہ جانے کیوں زبان
ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ بہر حال والد صاحب نے ہمت
کر کے سر کٹی ہوئی بلیوں کو اٹھایا اور دروازہ کھول کر باہر
پھینک دیا۔ سب لوگ سہم گئے تھے۔ کوئی ڈھنگ سے
ناشتہ بھی نہ کر سکا۔ پھر والد صاحب ڈیوٹی پر چلے گئے۔ میں
اپنے کمرے میں آ گیا۔ گھر والوں کو اب میری طرف سے
سکون ہو گیا تھا۔ لیکن اس نئی افتاد پر کافی غور و خوض
ہو رہا تھا۔ شام کی چائے پر بھی وہی ذکر تھا۔ والدہ صاحبہ
پر زور لہجے میں کہہ رہی تھیں کہ ضرور کوئی ہمارے خاندان
کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ انہوں نے دلیل دی کہ میری پراسرار
بیماری بھی اسی حملے کا نتیجہ تھی۔ لیکن اللہ نے مجھے بچا لیا۔
وار کرنے والے نے جب ناکامی کا منہ دیکھا تو دوبارہ کوششیں
شروع کر دیں۔ لیکن مسئلہ یہ تھا۔ ایسا کون دشمن اچانک
پیدا ہو گیا ہے۔ خاندان کے ایک ایک فرد کا جائزہ لیا گیا۔
لیکن کسی کو ہم سے دشمنی نہیں تھی چنانچہ کسی کے نام کا
تعین نہیں کر سکے۔ اس پوری گفتگو کے دوران میں خاموش
ہی رہا۔ کئی بار دل چاہا کہ ان لوگوں کی غلط فہمی دور کر دوں۔
لیکن زبان پر تالا تھا۔ میں کوشش کے باوجود کچھ بھی نہ
کہہ سکا۔ یہاں تک کہ رات کے بھیانک خوابوں اور بلیوں
کے رونے کی آوازوں کے بارے میں بھی میں نے کچھ نہیں بتایا۔
رات ہو گئی اور میرے دل میں ہول اٹھنے لگا کیا آج بھی
میں انہیں خوابوں سے دو چار رہوں گا۔ اور بلیوں کے رونے
کی آوازیں سنوں گا۔ میرا دل چاہا کہ میں والد صاحب کے
کمرے میں سو جاؤں۔ لیکن اس کے لئے مجھے وجہ بتانی ہوتی
اس کے علاوہ دوسرے لوگ یہ سمجھتے کہ میں بلیوں سے خوفزدہ
ہو گیا ہوں۔ خاصی رات گئے ہم سب لوگ ایک کمرے میں
بیٹھے رہے۔ اور پھر سب سونے کے لئے لیٹ گئے تو میں بھی
اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کمرے میں داخل ہو کر میں نے دروازہ
اندر سے بند کر لیا۔ کھڑکیاں بھی بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔
حالانکہ اس سے کمرے میں گھٹن پیدا ہو گئی تھی لیکن میرا
خوف مجھے اس بات پر مجبور کر دیا تھا۔ میں بستر کے نزدیک
آ گیا۔ اور پھر لیٹنے سے پہلے میں نے اپنا تکیہ اٹھا کر مناسب
جگہ پر رکھنا چاہا۔ لیکن خوف سے میری چیخ نکلتے نکلتے
رہ گئی۔

تکیے کے نیچے ایک سیاہ رنگ کی چھپکلی بیٹھی تھی۔۔۔
بے حد بھیانک اور کریہہ شکل کی چھپکلی تھی۔ ہمارے مکان
میں اور بھی چھپکلیاں تھیں۔ لیکن اس قدر خوفناک چھپکلی
میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ تکیہ ہٹاتے ہی چھپکلی دوڑ
کر پلنگ کے نیچے گھس گئی۔ میرے پلنگ پر لیٹنے کا سوال
ہی نہیں تھا۔ میں نے پورا بستر دیکھا۔ پلنگ الٹ کر دیکھا
مگر چھپکلی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ خوف کی وجہ سے میرے جسم
سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ اب کیا کروں، یہاں سے کہاں
جاؤں، چھپکلی کمرے میں موجود ہے۔ وہ میرے تکیے کے
نیچے کیوں چھپی ہوئی تھی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ چھپکلی بہت
زہریلی ہوتی ہے ۔۔۔ تو کیا ۔۔۔ وہ مجھے کاٹ لیتی ۔۔۔
اف میرے خدا میں کیا کروں، کہاں جاؤں کسی سے کچھ
کہہ بھی نہیں سکتا۔ یہ کیسا عذاب ہے میں اس عذاب سے
کس طرح چھٹکارا حاصل کروں۔ میں نے کمرے میں نہ سونے
کا فیصلہ کیا۔ اور بستر جھاڑ کر باہر نکل آیا۔ میں نے ایک

چادر اور ایک دری لے لی۔ حالانکہ کھلے میں سوتے ہوئے میرا دم نکل رہا تھا لیکن اب میں کمرے میں نہیں سو سکتا تھا۔ بہرحال دری اور چادر لے کر میں چھت پر پہنچ گیا۔ پکی اور شفاف چھت تھی۔ میں نے دری بچھائی اور تکیہ رکھ کر لیٹ گیا۔ پورے چاند کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں ذہن کو خوف سے آزاد کرنے کے لئے چاند کو گھورنے لگا۔ میں چاہتا تھا کہ دل سے ڈر نکال دوں۔ آخر جوان آدمی تھا لیکن بوڑھے پاسدیو کی ایسی دہشت بیٹھی تھی کہ دل قابو میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس نے مجھے تباہی کی دھمکی دی تھی۔ تباہی کیسی ہوگی۔ کیا ہونے والا ہے۔ میں سوچتا رہا اور پھر میں نے گردن جھٹک دی۔ میں تو یہ خیالات ذہن سے نکال دینا چاہتا ہوں۔ پھر اس بارے میں کیوں سوچ رہا ہوں۔ میں اللہ کر بیٹھ گیا۔ میرے خدا میں کیا کروں۔ کافی دیر تک میں پریشانی کے عالم میں بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر چھت کے سرے پر پہنچ گیا۔ کہیں دور سے ڈھول کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ باقی چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دنیا میٹھی نیند سو رہی ہے ایک میں کم بخت ہوں جس کی آنکھوں سے سکون کی نیند کوسوں دور ہے۔

مجھے خود پر غصہ آنے لگا۔ میں وہاں گیا ہی کیوں تھا۔ اور پھر میں دل ہی دل میں بوڑھے خبیث کو گالیاں دینے لگا۔ دیکھوں کا بوڑھے تو مجھے کتنا پریشان کرتا ہے۔ میں نے غصے کے عالم میں سوچا اور پاؤں پٹختا ہوا واپس دری پر آکر لیٹ گیا۔ میں نے سر تک چادر اوڑھ لی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد میرے پپوٹے بھاری ہونے لگے اور پھر نیند مجھ پر مہربان ہوگئی۔

لیکن زیادہ دیر نہیں ــــ شیطانی قوتوں نے عمل شروع کر دیا۔ میں نے پہلا ٹاور تے دو بجائے تھے میں نے گھنٹے کی آواز جاگتے ہوئے سنی۔ دو بجانے میری آنکھ کیوں کھل گئی۔ ویسے مجھے ایک بات پر مسرت تھی وہ یہ کہ میں نے آج ابھی تک کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔ کم بخت گھنٹے کو اتنی زور سے بجتا تھا۔ اچھا خاصا سو رہا تھا۔ میں نے کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کی لیکن اچانک مجھے ایک آہٹ سنائی دی۔ اور میرا دل دھڑک اٹھا۔ آہٹ چھت پر ہی تھی میرے سرہانے شاید مجھ سے تھوڑے فاصلے پر۔ یقیناً وہ انسانی قدموں کی آہٹ تھی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں منتظر تھا کہ اب کیا ہوتا ہے۔ میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ منہ کھول کر آنے والے کو دیکھوں۔ مگر قدموں کی چاپ میرے نزدیک آتی جا رہی تھی۔ قریب اور قریب اور قریب ــــ میرا دل سینے کی بندشیں توڑ کر باہر نکل پڑ رہا تھا۔ اور پھر وحشت کے عالم میں میں نے چادر زور سے اتار پھینکی اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک بھیانک چیخ سنی۔ اور میں خود بھی اپنی چیخ پر قابو نہ پا سکا۔ دہ گھگیائی ہوئی چیخیں ایک ساتھ گونج رہی تھیں۔ میرے قریب ہی ایک انسانی سایہ موجود تھا جو میری طرح چیخ رہا تھا۔ پھر نیچے سے بھی چیخوں کی آواز سنائی دی۔ ہماری چیخیں سن کر نیچے والوں کی بھی آنکھ کھل گئی تھی اور چونکہ وہ سوتے سے جاگے تھے۔ اس لئے اپنے ذہن پر قابو نہ رکھ سکے۔ نیچے سے آنے والی چیخوں کی آواز میری بہن شاہدہ اور بھائی عارف کی تھی۔ ان کے ساتھ ہی والد صاحب کی آواز سنائی دی۔ وہ شاید ان لوگوں کو سمجھا رہے تھے۔ دو تین چیخوں کے بعد مجھے بھی ہوش آ گیا۔ نیچے کے لوگ اوپر آ رہے تھے ــ اوپر آنے والے چچا اور والد صاحب تھے۔ والد صاحب کے ہاتھ میں ٹارچ اور چچا کے ہاتھ میں ہاکی اسٹک تھی۔ اوپر پہنچ کر وہ رک گئے۔ ٹارچ کی روشنی پہلے مجھ پر اور پھر اس دوسرے

شخص پر پڑی! اور میں چونک پڑا! وہ ہمارا ملازم رحمت تھا۔
"کیا ہوا شارق بیٹے، کیا بات ہے؟" والد صاحب نے پوچھا۔ میرا دل ابھی تک زور زور سے دھڑک رہا تھا! اور سانس پھولا ہوا تھا اس لئے میں کوئی جواب نہیں دے سکا۔ میری خاموشی پر والد صاحب ملازم کی طرف متوجہ ہوئے "تم بتاؤ رحمت، کیا بات ہے؟"
"میں، میں پیشاب کرنے اٹھا تھا سرکار مجھے چھت پر ہلچل معلوم ہوئی۔ میری اوپر آنے کی ہمت نہیں ہوئی مگر پھر میں سو بھی نہیں سکا۔ میں نے سوچا کوئی چور نہ چڑھ آیا ہو ——— کافی دیر تک ہمت کرتے رہنے کے بعد میں اٹھا اور چھت پر آ گیا۔ یہاں میں نے کسی کو چادر اوڑھ کر سوتے دیکھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ چھوٹے سرکار ہیں۔ میں قریب سے انہیں دیکھنا چاہتا تھا کہ چھوٹے سرکار جلدی سے اٹھ گئے اور میں ڈر گیا۔"
"اوہ" والد صاحب ہنس پڑے۔ چچا بھی ہنس رہے تھے۔
پھر والد صاحب نے مجھ سے اوپر آنے کی وجہ پوچھی۔
"مجھے گرمی لگ رہی تھی" میں نے جواب دیا۔
"چلو، نیچے چلو"
بہرحال وہ رات خیریت سے گزر گئی، کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ لیکن تیسری رات پہلی رات سے بھی تباہ کن تھی۔ اور اس تیسری رات سے ہی ہمارے خاندان کی تباہی کا آغاز ہوا۔ وہ رات، میری زندگی کی سب سے بھیانک رات تھی۔ اف، میں اس منحوس رات کو کبھی نہیں بھول سکوں گا ——— کبھی نہیں ——— پورا دن سکون سے گزرا تھا۔ نہ جانے کیوں میں نے بھی اپنی طبیعت میں فرحت محسوس کی، مجھے اپنا وجود کچھ ہلکا محسوس ہو رہا تھا ——— پاسدیو کی پیشین گوئی کے بعد میرے ہونٹوں سے مسکراہٹ اور مزاج سے شگفتگی چھن گئی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں آج دن میں میری پچھلی شخصیت ابھر آئی تھی اس دن میں نے اپنی بہن کو بہت تنگ کیا۔ شاہدہ میری پیاری بہن جو مجھ سے بے حد محبت کرتی تھی رات کے پہنچنے پر بہت شرمندہ تھی اور میں اسے چھیڑتا رہا تھا۔ مغرب تک میری شگفتگی برقرار رہی اور اس کے بعد سے پھر طبیعت پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ مجھے رات کے تصور سے خوف آ رہا تھا۔ لیکن رات آنی تھی اور آ گئی۔ گیارہ بجے تک ہم لوگ ایک ساتھ بیٹھے رہے۔ عارف اور شاہدہ سو گئے تھے، چچا بھی ٹھیک گیارہ بجے اٹھ گئے۔ والد صاحب نے کہا کہ اگر میں ان کے کمرے میں سونا چاہوں تو سو جاؤں۔ لیکن اسی وقت میرے ذہن میں خیال آیا پچھلی رات میں چھت پر سویا تھا تو سکون رہا، کمرے سے چھت بہتر ہے، چنانچہ میں نے کہہ دیا کہ میں چھت پر سوؤں گا۔ آج رحمت نے چھت پر میرے لئے باقاعدہ بستر لگا دیا۔ اور بارہ بجے کے قریب میں سونے کے لئے لیٹ گیا۔
حسب معمول ذہن اوہام کا شکار تھا۔ میں نے تکیہ اٹھا کر بھی دیکھ لیا تھا کہ کل کی طرح آج بھی کوئی چپکلی تو نہیں ہے۔ چاند کو دیکھتے دیکھتے مجھے نیند آ گئی۔ لیکن، اس وقت بھی رات کے دو بجے تھے میونسپل ٹاور کے گھنٹے کی بازگشت ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ مجھے اپنے سرہانے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میرا دل دھڑک اٹھا، لیکن پھر میں نے کل کے تصور میں چادر اٹھا کر پیچھے دیکھا۔ اف میرے خدا، میرے خدا ——— وہ ——— وہ رحمت نہیں تھا۔ وہ رحمت نہیں تھا۔"

چاند کی میلی روشنی میں میں نے اسے دیکھا، اس کا جسم سنگ موسیٰ کی طرح سیاہ تھا۔ برہنہ جسم پر اس نے ایک سفید رنگ کی لنگوٹی باندھی ہوئی تھی۔ ہوئے ہوئے مضبوط ہاتھ پاؤں تھے لیکن کندھوں سے اوپر کچھ نہیں تھا۔ ہاں، اس کی گردن کندھوں کے پاس سے کٹی ہوئی تھی اور اس سے گاڑھا خون سیاہ بدن پر بہہ رہا تھا۔

یہ بھیانک منظر دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ میری آواز سلب ہو گئی تھی۔ گردن کی رگیں پھول گئی تھیں اور زبان اتنی موٹی ہو گئی تھی کہ میں ٹھیک سے سانس بھی نہ لے سکتا تھا۔ اس وقت میری جو حالت تھی بیان سے باہر ہے۔ دنیا کے کسی انسان نے اس سے زیادہ دہشت اور اس سے زیادہ بے بسی محسوس نہ کی ہو گی۔ میرے جذبات کا اظہار صرف میری خوف و دہشت سے پھٹی ہوئی آنکھیں کر سکتی تھیں۔

"مہاراج باسد یو نے تمہارے لئے یہ پہلا تحفہ بھیجا ہے۔ یہ لو ــــ" اس کٹے ہوئے سر کے زندہ انسان نے کہا اور ایک ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ یہ ایک کپڑے کی پوٹلی تھی جس میں تربوز جیسی کوئی شے بھری ہوئی تھی۔ لیکن سفید کپڑے میں جا بجا سرخ دھبے لگے ہوئے تھے اور ان سے خون کی بوندیں بھی ٹپک رہی تھیں۔ میں نے اس بھیانک پوٹلی کو دیکھا اور نہ جانے کس طرح میرے حلق سے چیخ آزاد ہو گئی ــ بے حد بھیانک چیخ ــــــ اور اس چیخ میں کٹے ہوئے سر والے کا قہقہہ بھی شامل تھا۔

"یہ تو پہلا تحفہ ہے شارق بابو۔ باسدیو مہاراج کے پاس تو ایسے ہزاروں تحفے ہیں جو ایک کے بعد ایک کر کے تمہیں ملتے رہیں گے۔ یہ تحفہ سنبھالو۔" اس نے پوٹلی میرے بستر پر پھینک دی۔ اور میں بستر سے جست کر کے نیچے اتر گیا۔ پوٹلی کھل گئی تھی اور چاند کی روشنی میں میں نے تین کٹے ہوئے سر دیکھے۔ میرا بستر خون سے لتھڑ گیا تھا۔ میں نے سیڑھیوں کی طرف چھلانگ لگائی اور توازن قائم نہ رکھ سکا۔ گرتے وقت بھی میرے حلق سے دلدوز چیخیں نکل رہی

تھیں۔ تاہم نیچے پہنچنے تک میرے حواس قائم رہے۔
میرے چیخنے اور گرنے کی آوازیں نیچے تک پہنچ گئی تھیں اور سیے چاپ گھر والے پریشان ہو کر پھر دوڑ پڑے تھے۔
الٰہی خیر، الٰہی خیر، میری والدہ کے منہ سے خوف کے عالم میں نکل رہا تھا۔ والد اور چچا نے مل کر مجھے اٹھایا، حالانکہ اوپر سے گرا تھا، لیکن میرے جسم پر معمولی خراشوں کے علاوہ کوئی خاص چوٹ نہیں لگی تھی۔
"کیا بات ہے شارق، کیا بات ہے بیٹے!" میرے والد پریشانی کے عالم میں بولے۔ اور میں نے اوپر اشارہ کر دیا۔ میرے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ چچا نے رحمت کو ساتھ لیا اور سیڑھیوں سے اوپر جانے لگے۔ میرے والد مجھے سہارا دے کر برآمدے میں پڑے ہوئے تخت تک لے گئے۔ والدہ گلاس میں پانی لینے دوڑ گئیں۔ اور پھر اوپر سے رحمت کی چیخ سنائی دی۔ اور والد صاحب پھر چونک پڑے۔
"کیا ہو گیا، یہ کیسی مصیبت نازل ہو گئی ہے، کیا بات ہے رحمت —— ارشد علی کیا بات ہے؟" میرے والد نے چیخ کر پوچھا۔
لیکن اوپر کے ماحول کو دیکھ کر چچا کے قدم بھی نہ رک سکے۔ رحمت آگے آگے تھا اور اس کے پیچھے چچا بدحواسی سے دوڑ رہے تھے۔
"بھائی جان —— بھائی جان —— او —— اوپر —— تین —— کٹے ہوئے سر، شارق میاں کے بستر پر پڑے ہیں۔" چچا جان نے ہانپتے ہوئے بتایا۔" ان کی آنکھوں میں بھی خون کا سیلاب امنڈ رہا ہے۔"
"کٹے ہوئے سر!" والد صاحب چونک پڑے۔
"ہاں، انسانی سر —— پورا بستر خون —— سے سرخ ہو رہا ہے۔" چچا نے اسی انداز میں بتایا۔ اور والد صاحب نے میری طرف دیکھا۔ میرا ذہن ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ پھر بھی میں نے گردن ہلا کر چچا کی بات کی تائید کر دی۔ اسی وقت سناٹے میں ہمیں کسی گھر سے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ کوئی عورت بری طرح چیخ رہی تھی۔ قرب و جوار کے تمام گھروں کے لوگ جاگ

اٹھے۔ پھر دوسرے گھر میں کہرام مچا اور پھر تیسرے میں—
یہاں تک کہ پورے محلے میں ایک عجیب محشر برپا ہو گیا۔
بڑا ہیبت ناک شور ہو رہا تھا۔ اس میں رونے، چیخنے، چلانے
کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میری بہن اور بھائی بھی
جاگ اٹھے تھے اور سہمے ہوئے انداز میں پوچھ رہے تھے "کیا
بات ہے ابو میاں، کیا ہندو مسلم فساد ہو گیا ہے؟" لیکن
ہمیں خود نہیں معلوم تھا محلے پر کیا مصیبت نازل ہوئی ہے۔
بہر حال ہمارے اوپر خود مصیبت نازل تھی پھر دوسروں کی بپتا
معلوم کرنے کیا جاتے۔ کافی دیر تک ہم سب سکتے کے عالم
میں کھڑے رہے، پھر والد صاحب نے ہی بولنے کی ہمت
کی "دیکھیں تو سہی ارشد علی، وہ کیسے سر ہیں، کیا ہونے
والا ہے۔ اب ان سروں کا کیا کیا جائے۔ کیا پولیس کو اطلاع
دی جائے؟"

چچا اوپر جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ میں سب کچھ سن
رہا تھا سوچ رہا تھا سمجھ رہا تھا لیکن میری زبان پر تالا
لگا ہوا تھا۔ والد صاحب اور چچا دوبارہ اوپر چلے گئے—
ابھی وہ اوپر سے واپس بھی نہیں آئے تھے کہ اچانک ہمارا
دروازہ پیٹا جانے لگا۔ بہت سے لوگوں کی آوازیں سنائی
دے رہی تھیں۔

"یا اللہ، یا اللہ" والدہ صاحبہ کے منہ سے سہمے ہوئے
انداز میں نکلا، مجھے بھی ہوش آ گیا تھا میں دروازے کی
طرف بڑھا اور دروازہ کھول دیا۔ باہر بہت سے لوگ
لالٹینیں لئے ہوئے کھڑے تھے! ان کے چہرے غضب آلود
تھے۔

"ہم تمہارے گھر کی تلاشی لیں گے، خون کی دھاریں
تمہارے گھر کے دروازے تک آئی ہیں۔" ایک آدمی نے
گرجتے ہوئے کہا۔

میں کوئی جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ والد صاحب
اور چچا پیچھے آ گئے۔

"کیا بات ہے بھائی۔ یہ کیا شور ہے؟" والد صاحب
نے کہا۔ لیکن کئی آدمیوں نے انہیں دھکا دیا اور اندر گھس
آئے وہ لالٹین لئے ہوئے ہمارے گھر میں پھیل گئے۔

"یہ ہیں خون کے نشانات، یہ زینے کی طرف گئے
ہیں نا— چلو— اوپر چلو۔ ان میں سے ایک بھی باہر
نہ جانے پائے" کسی نے کہا۔ اور بہت سے لوگوں نے
مجھے، والد صاحب اور چچا صاحب کے علاوہ عارف کو بھی
پکڑ لیا۔ والدہ اور بہن کے ساتھ انہوں نے رعایت کی
تھی۔ انہیں ایک کمرے میں بند کر دیا۔ اور پھر چھت سے رونے
کی آوازیں سنائی دیں، کئی مرد دھاڑیں مار مار کر رو رہے
تھے، پھر کسی نے چیخ کر کہا۔

"سر اوپر موجود ہیں، قاتل یہی لوگ ہیں، مارو—
پکڑو— جانے نہ پائیں۔ اور پھر ہمارے اوپر قیامت
ٹوٹ پڑی۔ لاتیں، گھونسے، تھپڑ۔ ہر شخص حسب توفیق
مار رہا تھا۔ اور چند منٹ کے بعد ہی کچھ ہوش نہ رہا— آنکھ
ہسپتال میں کھلی۔ میں اور والد صاحب برابر برابر بستروں
پر پڑے تھے۔ والد صاحب بھی میرے ساتھ ہی ہوش میں
آئے تھے۔ پولیس کے جوان ہماری نگرانی کر رہے تھے ہماری
حالت اتنی ابتر تھی کہ ہوش میں آنے کے بعد بھی ہم زبان
نہ ہلا سکے۔ ویسے ہم نے محسوس کیا تھا کہ ہسپتال کا عملہ
تک ہمارے ساتھ نفرت کا برتاؤ کر رہا تھا۔ وہ لوگ بھی
خوف و نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔

ہوش میں آنے کے دو گھنٹے بعد مقامی سپرنٹنڈنٹ
پولیس اور دوسرے اعلیٰ افسران کے ساتھ ہمارے بیانات
لینے آیا اور سب سے پہلے ہم پر ایک روح فرسا انکشاف ہوا
وہ یہ کہ چچا صاحب رحلت کر گئے تھے۔ وہ جوش و غضب
میں بھرے ہوئے لوگوں کے حملے کی تاب نہ لا سکے اور انہوں نے

چوٹوں کی وجہ سے جاں بحق ہو گئے۔ والد صاحب کا کلیجہ خون ہو گیا تھا وہ دوبارہ بے ہوش ہو گئے۔ میں بدنصیب البتہ ہوش میں تھا، چنانچہ ایس پی نے مجھ سے سوالات کرنا شروع کر دیئے۔ اس نے ہمارے حسب نسب اور ہمارے پیشے کے بارے میں پوچھا اور پھر ایک عجیب سوال پوچھا۔

"کیا تمہارے گھر کا کوئی فرد سفلی عمل کرتا ہے؟"

"کوئی نہیں" میں نے حیرت سے جواب دیا۔

"کیا تین دن قبل تم نے بلیوں کے کٹے ہوئے سر باہر پھینکے تھے؟"

"ہاں" میں نے اعتراف کیا۔

"وہ سر کہاں سے آئے تھے؟" ایس پی نے مجھے چبھتی ہوئی نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

اور میری زبان پر تالا پڑ گیا۔ میں کوشش کے باوجود اس سلسلے میں ایس پی کو کچھ نہیں بتا سکا۔ پھر ایس پی نے ہی مجھے بتایا۔ "پڑوسیوں نے تمہارے اوپر الزام لگایا ہے کہ تم لوگ سفلی عمل کرتے ہو۔ اس سلسلے میں کچھ روز قبل تمہاری حالت بھی خراب ہو چکی ہے اور تمہارے ٹھیک ہونے کے بعد اکثر پڑوسیوں نے تمہارے گھر سے چیخنے چلانے کی آوازیں سنی ہیں۔ پھر انہیں تمہارے سفلی عمل کرنے کا ثبوت اس وقت ملا جب تمہارے گھر سے بلیوں کے کٹے ہوئے سر باہر پھینکے گئے۔ کچھ لوگوں نے تمہارے والد اور چچا کو اپنی آنکھوں سے سیاہ بلیوں کے کٹے ہوئے سر پھینکتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور پچھلی رات تمہارے پڑوس کے تین مختلف بچوں کے سر ان کے تن سے جدا کر دیئے گئے۔ ان کی بغیر سر کی لاشیں ان کے بستروں پر پڑی ہوئی تھیں۔ کسی پڑوسی کو بلیوں کے کٹے ہوئے سروں کا خیال آیا اور انہوں نے کٹی ہوئی گردنوں سے بہنے والے خون کی بوندیں تلاش کیں۔ تینوں گھروں سے خون کی بوندوں نے تمہارے گھر تک رہنمائی کی اور پھر تمہارے مکان کی چھت سے ان تینوں بچوں کے کٹے ہوئے سر برآمد ہو گئے۔ اس کے بعد وہ ہنگامہ ہوا جس کا تمہیں علم ہے۔ تمہارے چچا کے قتل کے سلسلے میں بھی کارروائی کی جا رہی ہے۔ تمہارے مکان کو پڑوسیوں نے آگ لگا دی ہے۔"

"میری ماں، بہن اور بھائی کہاں ہیں؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"سب پولیس کی زیر نگرانی ہیں۔ سب سے الگ الگ پوچھ گچھ کی جا رہی ہے۔ اب تم بتاؤ کہ سفلی عمل کون کرتا ہے اور دوسرے لوگوں کو اس کے بارے میں معلوم تھا یا نہیں؟"

اپنے گھر کی تباہی کی داستان سن کر میری آنکھوں میں تاریکی چھا گئی۔ میں کئی منٹ تک دیوانوں کی طرح پولیس والوں کی شکلیں دیکھتا رہا اور پھر میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ میں نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس کارروائی میں ہمارے گھر والوں کا ہاتھ نہیں ہے لیکن لاکھ کوشش کے باوجود میں یہ نہ بتا سکا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ جب بھی میں ایسی کوشش کرتا میری زبان اینٹھ جاتی اور ذہن تاریک ہو جاتا۔

ایس پی کافی دیر تک مجھ سے سوالات کرتا رہا اور پھر اٹھ کر چلا گیا۔ اس نے ڈاکٹروں کو ہدایت کر دی تھی کہ جونہی میرے والد کو ہوش آئے اسے اطلاع کر دی جائے۔ لیکن اس کی یہ خواہش ناکام رہی۔ والد صاحب چچا کی موت کی خبر سن کر جو بے ہوش ہوئے تو پھر ہوش میں نہ آئے اور تین دن کی مسلسل بے ہوشی کے بعد وہ بھی اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ میں بدنصیب مائل بہ صحت تھا۔ والد صاحب کی موت نے مجھے ایک شدید ذہنی جھٹکا دیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں خودکشی کر لوں، لیکن اسی شام میری والدہ کو مجھ سے ملنے کی اجازت دی گئی۔ اور ماں کی بری حالت دیکھ کر میرے دل میں زندہ رہنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ میں نے سوچا کہ

اب ان کا میرے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ اگر میں بھی مر گیا تو میری جوان بہن کا کیا ہوگا۔ چھوٹا بھائی کیا کرے گا۔ ان تمام خیالات نے مجھے سنبھالا اور میں نے والدہ کو تسلی دی والدہ کی حالت بے حد خراب تھی۔ آن کی آن میں بھرا گھر تباہ ہو گیا تھا۔

اور ——— میں جانتا تھا کہ اس تباہی میں کس کا ہاتھ ہے۔ منحوس باسدیو اپنے کہنے پر عمل کر رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ جنگل جا کر اسے تلاش کروں اور اس کی ٹانگیں چیر دوں لیکن میں جانتا تھا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا تھا شیطانی قوتوں کا مالک بوڑھا مجھ سے کہیں زیادہ طاقتور اور بااثر ہے۔ لیکن میرے دل میں باسدیو سے انتقام کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میں اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ جو شخص میری زبان اور ہاتھ تک کو کنٹرول کر سکتا ہو اس پہ میرا کیا وار چل سکتا تھا۔ ویسے بھی میں سمجھتا ہوں میں نے اچھا ہی کیا، مگر میں اس وقت باسدیو کی کہانی سناتا تو اول تو وہ اسے سچ نہ سمجھتے اور پھر ممکن ہے والد اور چچا کی موت کے بعد وہ خانہ پری کے لئے مجھے ہی سفلی علوم کا ماہر بنا دیتے اور اس کے بعد نہ جانے میرا کیا حشر ہوتا۔

پھر نہ جانے کس طرح پولیس کے اعلیٰ افسروں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اصل میں سفلی علوم میرے والد اور چچا ہی کرتے تھے اور میں اور گھر کے دوسرے لوگ اس سے بری الذمہ ہیں، چنانچہ ہمارا مقدمہ ختم کر دیا گیا، لیکن تحفظ امن کی خاطر ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم فوراً تاراگڑھ چھوڑ دیں اور یہاں سے کہیں اور چلے جائیں، پورے تاراگڑھ کے لوگ ہمارے دشمن ہو رہے ہیں اگر ہم ان کے ہاتھ لگ گئے تو وہ ہماری بوٹیاں اڑا دیں گے۔ ہم لوگوں کو خاموشی سے ٹرین میں بٹھا دیا، ٹکٹ بھی پولیس کے محکمے نے ہی فراہم کئے تھے۔ اور اس طرح ہم تاراگڑھ سے ایک چھوٹے سے قصبے چندوسی آ گئے۔

چندوسی کے چھوٹے سے اسٹیشن پر ہم بے یار و مددگار اترے تھے۔ کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ جدھر نظر اٹھاتے خود کو تنہا پاتے۔ میری والدہ اور بہن برقع میں تھیں، عارف کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ چند غنڈے قسم کے لوگ میری والدہ اور بہن کو گھورتے ہوئے گزرے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو کہنی مار کر کچھ فقرے بھی کسے تھے۔ میرا دل چاہا کہ ایک کر ان کی گردن پکڑ لوں اور اس وقت تک ماروں جب تک ان کے دانت نہ ٹوٹ جائیں۔ لیکن پھر عقل نے ساتھ دیا۔ میرے حالات ایسے تھے کہ ہر ظلم خاموشی سے سہہ لوں۔ میں والدہ اور بہن کو لے کر اسٹیشن سے نکل آیا۔ اسٹیشن پر کھڑے چند تانگے والوں نے ہمیں پکارا اور ایک تانگے والا ہمارے قریب پہنچ؛

کیا آپ بتا سکتے ہیں؟
ایک
1000
سوالات پر مشتمل
محمود خاور
کی مرتب کی ہوئی معلومات پر کتاب
ہر بکسٹال پر دستیاب ہے
قیمت ۵ روپے
منگانے کا پتہ کتاب کلب ۵ ۳۷ اردو بازار کراچی

"کہاں جاؤ گے بابو جی ۔۔۔؟" اس نے پوچھا۔
"مجھے کسی سرائے کا پتہ بتا دو بھائی!" میں نے لجاجت سے کہا۔

"آؤ بیٹھو، مائی جیواں کی سرائے بہت مشہور ہے۔ اس سے اچھی سرائے کوئی اور نہیں ہے۔"

"مگر ہمارے پاس تمہیں دینے کے لئے کچھ نہیں ہے۔" میں نے کرب سے کہا لیکن اسی وقت میری والدہ آگے بڑھیں اور انہوں نے ایک میلا سا رومال میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس میں گرہ بندھی ہوئی تھی۔ میں نے گرہ کھول کر دیکھا تو پانچ روپے کا ایک میلا سا نوٹ تھا۔ اس نے ان لوگوں سے تانگے میں بیٹھ جانے کے لئے کہا اور ہم تانگے میں بیٹھ کر مائی جیواں کی سرائے چل پڑے۔ کچی دیواروں اور پھونس کے چھپر پر مشتمل سرائے ہمارے لئے مناسب پناہ گاہ تھی۔ آٹھ آنے روز پر ہمیں ایک تنگ سی کوٹھڑی مل گئی اور ہم اس میں منتقل ہو گئے۔ سب کے حواس گم تھے، کوئی کسی سے کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ میں دوڑ کر باہر گیا اور کچھ روٹیاں اور کباب لے آیا۔ ہمیں نئے سرے سے زندگی کی ابتدا کرنی تھی، سب کچھ لٹ چکا تھا اور اب بچے ہوئے ذہنوں کو تسلی دینے کی گنجائش بھی نہیں رہ گئی تھی۔ کون کسے تسلی دیتا۔ سب کی ایک ہی کیفیت تھی۔ پانی کے ساتھ روٹی کے ٹکڑے حلق سے اتارے گئے اور رات ہونے پر ہم اوندھے سیدھے لیٹ گئے۔ ایک عجیب سی خاموشی ایک عجیب سا سناٹا۔ شاہدہ اور عارف سو گئے۔ میری والدہ بھی بظاہر سو رہی تھیں لیکن ان کی بے چین کروٹیں ان کے دل کا حال بتا رہی تھیں۔ خدایا کیا کروں۔ اس تباہی کو کیسے بھول جاؤں۔ مستقبل منہ پھاڑے کھڑا تھا اور ایک انجانا خوف رگ و پے پر مسلط تھا۔ بات یہیں ختم نہیں ہو گئی ہے دل گواہی دے رہا تھا۔ بہرحال انسان سب کچھ لٹانے کے بعد بھی جینے کی آس نہیں چھوڑتا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ صبح ہی مزدوری کی تلاش میں نکل جاؤں گا۔ اس چھوٹے سے قصبے میں ذرائع آمدنی کیا ہو سکتے ہیں، پھر بھی کوشش تو کرنی ہی تھی۔ اور یہ سرائے میری ننھیال نہیں تھی۔

رات کی بچی ہوئی روٹی اور پانی سے ناشتہ کیا اور عارف کو ہوشیار رہنے کی ہدایت کر کے گھر سے نکل آیا۔ ذہن میں ایک ہی خیال تھا، آٹھ آنے سرائے کی کوٹھڑی کا کرایہ اور کھانے کا بندوبست دونوں کام کرنے تھے۔ پورے قصبے کے ایک ایک کونے میں پھرا، مگر مزدوری تو کیا کسی نے مفت کام کرانا بھی پسند نہ کیا۔ صرف آدھی روٹی کھائی تھی، دوپہر یونہی گزری اور شام آ گئی۔ بے نیل و مرام واپس چل پڑا اور سرائے پہنچ گیا۔ سب میری واپسی کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر بجھی ہوئی آنکھوں میں روشنی کی رمق لہرائی اور پھر وہی اداسی۔ کسی نے مجھ سے ملازمت کے بارے میں نہ پوچھا۔ ان لوگوں کی خاموشی اور تکلیف دہ تھی۔ میں نے والدہ سے ایک روپیہ مانگا، آٹھ آنے تانگے والے کو دیئے تھے۔ اور ایک روپیہ سرائے کا دو دن کا کرایہ۔ گویا اب والدہ کے پاس صرف آٹھ آنے بچے تھے۔ جو تیسرے دن کے کرائے کے کام آ سکتے تھے۔ کل کچھ نہ کچھ ضرور کرنا ہو گا کہیں نہ کہیں سے پیسے پیدا کرنا ضروری ہیں۔ میں نے سوچا۔ اس رات کباب بھی نہیں آئے اور روکھی روٹی کھائی گئی۔ روٹی کھا کر میں لیٹ گیا، سب ہی کونے کھدروں میں پڑے ہوئے تھے۔ خاصی رات گزر گئی اور ۔۔۔۔ مجھے نیند آ گئی ۔۔۔ پھر آنکھ اس وقت کھلی جب سورج نکل آیا تھا۔ والدہ اور بہن بھی جاگ گئی تھیں۔ عارف غائب تھا۔ میں نے سوچا شاید بیت الخلاء گیا ہو گا۔ مگر کافی دیر تک جب وہ واپس نہیں آیا تو میں نے ماں سے پوچھا۔ انہوں نے بھی لاعلمی ظاہر کی۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت تو ایک لمحہ بھی وسوسے سے خالی نہیں تھا۔

میں کوٹھڑی سے نکلنے ہی والا تھا کہ عارف اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ڈبل روٹیاں اور مکھن تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تام چینی کی کیتلی میں چائے بھی لایا تھا۔

میں حیران رہ گیا: "کہاں سے لائے ہو عارف؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بھائی جان، اتفاق سے میری پتلون کی پچھلی جیب میں ایک دس روپے کا نوٹ مل گیا، نہ جانے کب کا پڑا تھا۔" عارف نے بتایا اور مجھے بے حد مسرت ہوئی یقین نہ کرنے کی بات نہیں تھی۔ کیونکہ درحقیقت اب سے صرف چند دن پہلے ہماری حالت ایسی تھی کہ ہم دس روپے کا نوٹ بہ آسانی بھول سکتے تھے۔

"مکھن نہ لاتے عارف، باقی پیسے احتیاط سے رکھنا۔" میں نے کہا اور ہم سب نے مل کر ناشتہ کر لیا۔ باہر والا خالی کیتلی اور پیسے لے کر چلا گیا۔ ابھی اسے گئے ہوئے ایک منٹ بھی نہ گزرا تھا کہ ایک کرخت دار آواز سنائی دی:

"اوئے چھوکرے باہر آؤ۔" اور پھر ایک گندی سی گالی سنا دی۔ اور پھر دوسری آواز: "باہر آؤ نہیں تو میں اندر آجاؤں گا۔"

میں جلدی سے باہر نکلا اور ایک موٹا تازہ آدمی دھوتی اور بنیان پہنے کھڑا تھا۔ اس کی بڑی بڑی مونچھوں اور چوڑے چکلے جسم نے مجھے مرعوب کر دیا۔ اور میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

"اس چھوکرے کو نکالو، وہ میرا دس روپے کا نوٹ چرا کر لایا ہے۔"

"چرا کر لایا ہے، کہاں سے چرا کر لایا ہے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

میری والدہ اور بہن بھی حیرانی سے باہر نکل آئی تھیں۔ اس مصیبت کے عالم میں انہیں پردے کا خیال نہیں رہا تھا۔ حالانکہ عام حالات میں ہم لوگ پردے کے بہت قائل تھے۔ البتہ

نڈر

سڑک سنسان تھی، اندھیرا پھیل چلا تھا۔ وہ پتہ نہیں کدھر سے یکایک میرے سامنے آ دھمکا اور میرے کپڑے اتارنے لگا۔ مگر میں نے احتجاج نہیں کیا، مجھے بھلا کیوں ڈر لگتا، میں جانتی تھی کہ وہ میرے کپڑے پہن ہی نہیں سکتا۔ ۔ ۔ ۔ ؟

عارف باہر نہیں نکلا تھا۔

"میں کوٹھڑی میں سو رہا تھا، میرے بازو والے نے تمہارے لڑکے کو اندر جاتے دیکھا تھا۔ جب میں نے اپنا کرتا دیکھا تو اس میں سے دس کا نوٹ غائب تھا۔ لڑکے سے پوچھو، میری کوٹھڑی میں کیوں گیا تھا؟"

"عارف!" میں نے گرج کر عارف کو آواز دی۔ اس دوران مونچھوں والے نے اندر نظریں دوڑائیں اور اس کی نگاہ شاہدہ پر رک گئی۔ میں اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک نہیں دیکھ سکا تھا جس کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا۔ میں نے دوبارہ عارف کو آواز دی اور وہ سہما ہوا سا باہر آ گیا۔ اس کے چہرے سے احساسِ جرم ٹپک رہا تھا۔ میں غصے میں دیوانہ ہو گیا اور عارف پر پل پڑا، لات، گھونسے اور تھپڑ۔ پھر مونچھوں والے ہی نے مجھے پکڑا۔ اس کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

"رہنے دو یار بچہ ہے۔" اس نے نرم لہجے میں کہا اور پھر عارف سے بولا: "تمہیں پیسے کی ضرورت تھی بابو تو مجھ سے بولتے، دس بیس روپے اور لے لو، مگر چوری بری بات ہے، چھوڑو بس، اب اسے مت مارنا۔"

"نکال کتنے پیسے بچے ہیں۔" میں نے کہا اور عارف کی

جیب سے آٹھ روپے کچھ آنے نکال لئے۔ اٹھ آنے والدہ سے
لے کر اس میں ملائے اور پھر میں نے لجاجت سے مونچھوں
والے سے کہا:

"یہ پیسے لے لیجئے، میں کل تک آپ کے باقی پیسے بھی
دے دوں گا۔"

"ارے پیسوں کی کیا بات کرتے ہو بابو، ہاتھ کا میل ہے!
میں نے تو اس لئے بچے کو ڈانٹا تھا کہ آئندہ ایسا نہ کرے۔" وہ
شاہدہ کو دیکھ کر اکڑتے ہوئے بولا۔

"یہ تمہاری شرافت ہے بھائی۔ یہ پیسے لے لو۔"

"بھگوان کی سوگند پیسے نہیں لوں گا۔ میں تمہارا پڑوسی
ہوں اور میرا نام دیپ چند ہے۔ شائد تم لوگ کچھ پریشان ہو۔"
ہمدردی کے دو بول سننے کو کان ترس گئے تھے۔
اس کے لہجے میں میری آنکھوں میں آنسو نکل آئے۔ والدہ
اور شاہدہ اندر چلے گئے تھے۔ دیپ چند نے میرے کندھے
پر ہاتھ رکھ کر کہا:

"آؤ، میری کھولی میں چلو، بات چیت کریں گے ـــ"
بات چیت کرنے سے ہی تعلقات بڑھتے ہیں اور میں نہ
چاہتے ہوئے بھی اس کی کوٹھڑی کی طرف بڑھ گیا۔ راستے
میں اس نے باہر والے کو آواز دے کر چائے لانے کے لئے
کہا اور مجھے لے کر اندر پہنچ گیا۔

"بیٹھو بھیا، یہاں تو یہی ٹوٹی چارپائی ہے۔" اور میں
بیٹھ گیا۔ "تمہارا نام نہیں معلوم ہوا۔"

"میرا نام شارق ہے۔"

"مسلمان ہو؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر، صورت سے پریشان
معلوم ہوتے ہو، میں تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہوں؟" اس نے
کہا۔ میں تو تنکے کا سہارا غنیمت سمجھ رہا تھا۔ اس نے اسے
بتایا کہ "نوکری کے لئے پریشان ہوں، کل پورے دن مارا
مارا پھرا ہوں۔"

"کچھ پڑھے لکھے ہو؟" اس نے پوچھا۔ اور میں نے
گردن ہلا دی۔

"ٹھیک ہے، میرے ساتھ چلو۔ میں بلڈنگیں بنوانے
کا کام کرتا ہوں۔ یہاں ایک کارخانہ بن رہا ہے ـــ میں
مزدوروں کی نگرانی کرتا ہوں، سب کام میرے ہاتھ میں ہے،
مگر پڑھا لکھا نہیں ہوں، ٹھیکیدار شہر گیا ہوا ہے تم مزدوروں
کا کام لکھا کرو، تین روپے روز ملیں گے۔ دو تین مہینے کا
کام ہے۔"

خوشی سے میری باچھیں کھل گئیں۔ میں اچھے وقت میں
چار پانچ روپے کے سگریٹ پی لیتا تھا لیکن یہ تین روپے
میرے لئے بہت بڑی نعمت تھے۔ میں نے سوچا فی الوقت
گزارہ کروں، تھوڑا سا ذہن قابو میں آئے تو ان رسائل سے
رابطہ قائم کروں جن کے لئے میں کہانیاں لکھ رہا تھا، مجھے
یقین تھا کہ وہ میری مدد کریں گے، لیکن فی الحال تو مجھے
ایسا لگتا تھا جیسے مجھے قلم پکڑنا بھی نہ آتا ہو۔ میرے ذہن و
دماغ پر تو قنوطیت یاسدیو کا قبضہ تھا۔ دیپ چند سے میں
بہت متاثر ہوا، اس کے ساتھ چائے پینے کے بعد میں واپس
اپنی کوٹھڑی میں آیا اور والدہ کو اس کے بارے میں بتایا کہ
وہ ہندو ہوتے ہوئے بھی کتنا شریف اور مہربان ہے۔
عارف ابھی تک ایک کونے میں منہ دیئے رو رہا تھا ـــ
مجھے اس پر غصہ تھا، اس لئے میں نے اس کی طرف توجہ
نہیں دی اور پھر میں ملازمت کرنے کے لئے تیار ہو کر دیپ
چند کے پاس پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم چل پڑے۔
درحقیقت تمام مزدور دیپ چند کے زیر تحت کام کرتے
تھے۔ وہاں مجھے معلوم ہوا کہ دیپ چند غنڈہ قسم کا آدمی
ہے اور یہاں اس کا کافی رعب ہے، بہرحال شام تک میں

اس کے ساتھ رہا۔ اور شام کو جب مجھے تین روپے ملے، تو میری خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ میں اور دیپ چند ساتھ ہی سرائے واپس آئے تھے۔

"سن میرے یار، پیسہ آنی جانی چیز ہے، تو ابھی ایسا کر مجھ سے بیس پچیس روپے لے اور کھانے پینے کا انتظام کرے۔ بازار کا کیا تک کھائے گا۔ دیکھ منع مت کرنا دیپ چند یاروں کا یار ہے۔" اس نے تیس روپے زبردستی میری جیب میں ٹھونس دیئے۔ دیپ چند مجھے فرشتہ معلوم ہوا تھا۔ میں اس کے احسان کے بوجھ سے دبا جا رہا تھا۔ جب میں نے والدہ کو اس کے بارے میں بتایا تو وہ بھی اس کی بہت ممنون ہوئیں۔

چار پانچ دن کے بعد دیپ چند نے پیش کش کی کہ اگر میں چاہوں تو عارف کو بھی مزدوروں میں لگا سکتا ہوں۔ ایسے بھی تین روپے روز ملیں گے۔ مگر اس بات پر میرا دل تڑپ اٹھا۔ ابھی میں زندہ ہوں۔ عارف کی تعلیم چھوٹ گئی تھی۔ لیکن حالات سہارا دیتے تو اس کی تعلیم دوبارہ جاری ہو سکتی تھی۔ میں نے دیپ چند سے معذرت کی اور کہا کہ میں اسے پڑھانا چاہتا ہوں، بہت جلد میرے حالات بہتر ہو جائیں گے۔

"پرواہ مت کرنا پارٹنر، اگر تو چاہے تو میں اسے کسی اسکول میں داخل کرا دوں۔"

"نہیں دیپ چند، تمہارے احسانات ویسے ہی کیا کم ہیں، میں بہت جلد حالات سنبھالنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔

سرائے میں رہتے ہوئے ہمیں بیس روز ہو گئے تھے۔ والدہ نے سلیقہ مندی سے کام لیتے ہوئے خاصے پیسے بچا لئے اور پھر ایک دن انہوں نے دیپ چند کے چالیس روپے واپس کرنے چاہے۔

اچھے

ایک لڑکی نے اپنے شیدائی کا استقبال کرتے ہوئے کہا:

"میرے پاپا اور ممی اتنے اچھے ہیں کہ بس تمہیں کیا بتاؤں، تمہیں بھی وہ یقیناً بہت اچھے لگیں گے۔ وہ رات کا فلم شو دیکھنے گئے ہوئے ہیں۔"

"آپ مجھے غیر سمجھتی ہیں ماں جی، وہ پیسے بھی آپ کے شارق کے تھے، ویسے میں ایک رائے دے سکتا ہوں — پندرہ بیس روپے مہینے پر ہمیں کوئی چھوٹا سا مکان کرائے پر مل جائے گا، آپ کہیں تو میں تلاش کر لوں، اس طرح سرائے میں کب تک زندگی گزاریں گے، اگر دل چاہے تو مجھے بھی کسی کونے میں جگہ دے دیں۔"

"تم نے میرے دل کی بات کہی ہے بیٹا، میں خود جوان لڑکی کے ساتھ یہاں رہتے ہوئے ہولتی ہوں، اگر تم ایسا کر دو تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے، میں مکان تلاش کر لوں گا۔" دیپ چند نے کہا اور اس دن وہ میرے ساتھ کام پر نہیں گیا۔ شام کو البتہ وہ پہنچا اور اس نے مجھے خوش خبری سنائی کہ مکان مل گیا ہے۔ بیس روپے مہینہ کے چھوٹے سے مکان میں دو کمرے تھے، ایک کمرہ میں نے اور دیپ چند نے لے لیا اور دوسرا اماں، شاہدہ اور عارف کے لئے ہو گیا اور ہم نے نئے سرے سے زندگی شروع کر دی۔ میری والدہ بہت عابدہ تھیں، سب لوگوں کی دلآزاری کی وجہ سے انہوں نے گزرے ہوئے واقعات کا کبھی تذکرہ نہیں کیا تھا، لیکن یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ انہیں ان حادثات کا غم نہ ہو، ان کی

قہقہے ہی قہقہے ہنگامے ہی ہنگامے جاسوسی ہی جاسوسی

محمود خاور کی لکھی ہوئی بچوں کی عمران سیریز کا

ہنگامہ نمبر

عمران کا ہنگامہ

یہ خاص نمبر دو حصوں پر مشتمل ہے

ایک حصے کی قیمت ۳۰ روپے

مکمل دو حصوں کی قیمت ۶۰ روپے

بچوں کی عمران سیریز کا ہنگامہ نمبر ایک یادگار نمبر ہے

دوستو اگر یہ نہ پڑھا تو کچھ نہ پڑھا

فوراً حاصل کر لو ورنہ پھر نہ ملے گا

رنگا رنگ کتاب گھر ۳۷ - اردو بازار کراچی - فون ۲۱۶۳۶۱

صحت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ میں اس بات کو محسوس کرتا تھا لیکن ماں کے لیئے بس کر بھی کیا سکتا تھا۔ ان کا غم ایسا نہیں تھا کہ دوا دارو سے ٹھیک ہو جاتا۔

دیپ چند نے اب مزدوروں کی ساری ذمہ داری مجھ پر چھوڑ دی تھی۔ اب وہ پورے دن کام پر بھی نہیں جاتا تھا۔ اس کے علاوہ میری تنخواہ میں ایک سو پیر روز کا اضافہ بھی اس نے کرا دیا تھا۔ وقتی طور پر زندگی ایک راہ پر آ گئی تھی۔ حاسد پر بھی شائد مجھے بھول گیا تھا۔ مجھے تباہ کرنے کے بعد اس کے دل کو سکون مل گیا ہوگا۔ میں سوچتا تھا لیکن میرا یہ خیال کس قدر غلط تھا۔ تباہی سست قدمی سے میری طرف بڑھ رہی تھی۔ ابھی تو بہت کچھ ہونا باقی تھا۔

ایک دن ماں نے مجھے بتایا کہ عارف میرے جانے کے بعد گھر میں نہیں رُکتا، نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ میں نے سختی کی تو وہ زندگی میں پہلی بار میرے مقابل آ گیا۔

"میں اب بچہ نہیں ہوں بھائی جان، مجھے بھی زندگی میں کچھ کرنا ہے۔ آپ لوگوں کے ساتھ رہ کر تو زندگی آزار بن گئی ہے۔"

"میں کب کہتا ہوں عارف کہ تو کچھ نہ کر، مجھے بتا تو سہی تو کیا کرنا چاہتا ہے؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

"جب کر لوں گا تب بتا دوں گا۔" اس نے کہا اور میری نگاہ اس کی پھولی ہوئی جیب پر پڑ گئی۔ نہ جانے کیوں مجھے شبہ ہوا تو میں نے اس کی جیب دیکھی، اس کی جیب میں سگریٹ کا پیکٹ ماچس اور دس دس روپے کے تین نوٹ تھے۔ نوٹ دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"کیا تو سگریٹ پیتا ہے؟" میں نے پوچھا اور وہ چپ رہا۔ "یہ نوٹ کہاں سے آئے ہیں؟" میں نے پھر کہا، مگر وہ پھر بھی خاموش رہا۔ مجھے اس کی پہلی چوری یاد آ گئی اس کی خاموشی نے اور پارہ چڑھا دیا۔ دل تو دکھا ہی ہوا تھا میں پھر اسے مارنے کھڑا ہو گیا۔ عارف نے تھوڑی دیر تک تو خاموشی سے مار کھائی، مگر پھر اس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا:

"بس، بہت ہو چکا بھائی جان، میری اور آپ کی راہیں الگ الگ ہیں، جو آپ کا دل چاہے آپ کریں، اور جو میرا دل چاہے گا میں کروں گا۔"

میں نے عارف کی تیوریوں سے اندازہ لگا لیا کہ اگر میں نے اب اس کے ایک بھی تھپڑ مارا، تو وہ مجھ سے مقابلہ کر لے گا۔

"نکل جا ذلیل یہاں سے، کمینے کتے تو مجھ سے مقابلہ کرے گا۔ تو اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتا، میں تجھے غلط راہوں پر نہیں دیکھ سکتا۔"

"ٹھیک ہے، میں خود بھی آپ لوگوں کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا۔" اس نے کہا اور پیر پٹختا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ والدہ بت کی طرح ساکت کھڑی تھیں۔ انہوں نے عارف کو نہیں روکا اور کئی منٹ تک اسی طرح کھڑی رہیں، پھر ان کے منہ سے یہ دردناک الفاظ نکلے:

"خدایا، یہ دن بھی دکھانا تھا۔" اور اس کے ساتھ ہی وہ بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑیں۔ شاہدہ اور میں ان کی طرف دوڑ پڑے اور انہیں اٹھا کر چارپائی پر لٹایا۔ کافی دیر کی کوشش کے بعد انہیں ہوش آ سکا لیکن اب انہوں نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور خاموش لیٹی رہیں ان کے دل پر گہرا صدمہ تھا۔ عارف کے اس طرح جانے کا مجھے بھی افسوس تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ پشیمان ہو کر شام تک واپس آ جائے گا۔

شام اور پھر رات ہو گئی، لیکن عارف واپس نہیں آیا۔
دیپ چند نے گھر میں غیر معمولی خاموشی دیکھی تو پوچھ بیٹھا۔
اور میں نے اسے تفصیل بتا دی۔ اب تو وہی ہمارا ہمدرد رفیق
تھا، کوئی بات اس سے چھپی نہ تھی۔ والدہ اور یہاں تک کہ
شاہدہ نے بھی اس سے پردہ ترک کر دیا تھا۔ اس نے تفصیل
سنی تو سنجیدہ ہو گیا۔ کئی منٹ تک خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"میں تمہارا ہمدرد ہوں شارق۔ کئی دن سے تمہیں یہ
بات بتانے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن ہمت نہ پڑی۔۔۔
تمہارا بھائی برے لڑکوں کی صحبت میں پڑ گیا ہے۔ میں
نے خود بھی ایک بار اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی، لیکن
وہ مجھ سے مقابلے کے لئے اتر آیا۔ میں نے تم سے اس لئے
نہیں کہا کہ تمہیں صدمہ ہو گا۔ وہ خاص طور سے ایک
لڑکے رشید کے ساتھ رہتا ہے اور رشید بہت بدنام لڑکا
ہے بلکہ ایک دفعہ تو وہ جیب تراشی کے الزام میں بھی
پکڑا جا چکا ہے۔"

میں نے یہ بات سنی تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

میں نے دیپ چند سے پوچھا کہ وہ رشید کا گھر جانتا ہے۔
تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بہرحال ہم دونوں رشید
کے گھر پہنچے، وہاں پر رشید کا باپ لال پیلا ہو رہا تھا۔ ہماری
آواز سن کر گھر سے نکلا اور دیپ چند نے اس سے رشید
کے بارے میں پوچھا۔

"وہ حرامی کا پلا گھر سے ماں کا زیور اور نقدی لے
کر اپنے ایک بدمعاش دوست عارف کے ساتھ بھاگ
گیا ہے۔" رشید کے باپ نے بتایا۔

"کہاں بھاگ گیا ہے؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"یہی معلوم ہوتا تو میں اس سالے کی گردن پکڑ کر
واپس نہ لے آتا، مگر تم کون ہو؟"

اور دیپ چند نے میرے بارے میں بتا دیا۔ رشید
کا باپ یہ سن کر آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے لپک کر
میرا گریبان پکڑ لیا اور بولا۔

"تیرے حرامی بھائی نے میرے لونڈے کو خراب کیا
ہے۔ اب میں سب کچھ تجھ سے وصول کروں گا۔"

مگر اس سے پہلے کہ وہ میرے دو چار ہاتھ جھاڑتے
دیپ چند نے اسے روکا اور جیب سے ایک لمبا چاقو
نکال کر کھول لیا۔ چاقو دیکھ کر رشید کے باپ کے ہوش
ٹھکانے آ گئے۔ دیپ چند نے الٹا اس کو دھمکایا کہ اگر
عارف کا پتہ نہ چلا تو وہ رشید کے باپ کی آنتیں نکال
دے گا۔ اور ہم وہاں سے چلے آئے۔ میرے ہاتھ پاؤں
بے جان ہو رہے تھے، دست راست بھی ٹوٹ گیا تھا۔
مجھے اپنے بھائی سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں لیکن
اب میں تنہا تھا۔ ماں کی حالت الگ خراب تھی۔ اگر
اسے تفصیل بتاتا تو شاید اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔ میں نے
دیپ چند کو بھی منع کر دیا کہ وہ ماں سے کچھ نہ کہے اور
اس نے وعدہ کر لیا۔

رات کو کسی نے کچھ نہ کھایا۔ دوسرے دن بھی میں
ناشتہ کئے بغیر گھر سے چلا آیا۔ ماں پر عارف کی جدائی
کا بہت صدمہ تھا۔ ان کی حالت روز بروز بگڑتی گئی لیکن

راجہ نواز اصغر
کی ناقابل فراموش "آپ بیتی"
"نروان کی تلاش"
اب کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے
ہر بک سٹال پر دستیاب ہے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ ۳۷۔ اردو بازار کراچی

وہ بڑی صابر تھیں۔ میں نے ان جیسی آج تک صابرہ نہیں
دیکھیں۔ اتنی بڑی تباہی پر بھی میں نے انہیں خاموش ہی
دیکھا تھا۔ اور اب انہوں نے عارف کے سلسلے میں بھی زبان
بند کر لی تھی۔ وقت سسک کر گزر رہا تھا۔ عارف بھول جانے
والی چیز نہیں تھا۔ لیکن ہم سب خاموش رہتے تھے۔ اور اس
گھٹن کا سب پر بڑا اثر پڑ رہا تھا۔ اور اس رات ——
کرب کے عالم میں کروٹیں بدلتے بدلتے میری آنکھ لگ گئی۔
نہ جانے کتنی دیر سویا تھا کہ کسی نے میرا پاؤں پکڑ کر ہلایا اور
میں نے آنکھیں کھول دیں۔ چند منٹ تک تاریکی چھائی رہی
اور پھر میری آنکھوں نے ایک انسانی ہیولا دیکھا۔ ایک
لمبا تڑنگا آدمی، جو ریچھ کی طرح سیاہ تھا —— اور ——
اس کے کندھوں کے بعد کچھ نہ تھا۔ میں اچھل کر اٹھ گیا۔
اس منحوس سر کٹے کو میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اور اس
وقت جب اس نے مجھے سروں کا تحفہ پیش کیا تھا، دوبارہ
اسے دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا! وہ میں خوفزدہ
نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"باسدیو مہاراج نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے ——
انہوں نے کہا ہے کہ اگر اب بھی تمہارا دل تباہی سے بھر
گیا ہو تو وہ تمہیں شما کرنے کو تیار ہیں۔ ان کی اچھا پوری
کر دو اور اس کشٹ سے نجات حاصل کرو۔"

"باسدیو کا نام سن کر میرے دل سے خوف نکل گیا۔
اور شدید نفرت ابھر آئی۔ میں نے دانت پیس کر کہا۔

"کیا وہ بوڑھا کتا میرے والد اور چچا کو واپس کر سکتا ہے؟
اگر ایسا ہے تو میں اس کی خواہش پوری کرنے کو تیار ہوں۔"

"مرے ہوؤں کو زندہ کرنا باسدیو مہاراج کے بس
میں نہیں ہے۔ اگر آئندہ تمہارے اوپر کوئی آفت ہی نہیں
آئے گی۔"

"تب اس غلیظ شیطان سے کہہ دیا کہ اب جب کہ
میں تباہی کا شکار ہو ہی گیا ہوں، تو اس سے تعاون
کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں اس پر لعنت
بھیجتا ہوں۔"

"تب پھر مہاراج کے دوسرے تحفے کا انتظار کرو۔"
اس نے کہا۔

"ہاں، ہاں، دیکھتا ہوں وہ کتنے تحفے مجھے دیتا ہے۔
میں بھی اپنا صبر آزما رہا ہوں۔" میں نے گرج کر کہا۔ اور
سر کٹا غائب ہو گیا۔ میرے دل سے اس بھیانک خبیث
کو دیکھ کر خوف نکل جانے کی وجہ سے شدید نفرت تھی۔
لیکن اس کے جانے کے بعد میں نے ارد گرد کے ماحول
کا جائزہ لیا۔ اس نے سوچا کہ اس کی آواز سے دیپ
چند کیوں نہیں جاگا —— لیکن —— یہ دیکھ کر
میرے جسم سے پسینہ چھوٹ گیا کہ میں اپنے کمرے میں
نہیں ہوں بلکہ اپنے مکان کے پچھواڑے ایک گندے نالے
کے قریب اگی ہوئی گھاس پر پڑا ہوں۔ نہ جانے میں
وہاں کیسے آ گیا تھا۔ لیکن شیطانی قوتوں کے مالک
بوڑھے کے لئے یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

میں گھر واپس چل پڑا۔ سب لوگ اسی طرح سو
رہے تھے۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میرے کمرے
میں دیپ چند اسی طرح بے خبر سو رہا تھا —— میں اپنی
چارپائی پر لیٹ گیا اور میرے دل میں خوف نے گھر
کر لیا۔ باسدیو کے پہلے تحفے نے میرے والد اور چچا کی
جان لے لی تھی اور ہمیں دربدر کر دیا تھا۔ دوسرا تحفہ
کیا کرے گا۔ رات بھر میں نہ سو سکا۔ مجھے اپنے چاروں
طرف بھیانک شکلیں نظر آ رہی تھیں۔ سینکڑوں وسوسے
میرے دل میں سمائے ہوئے تھے۔ صبح میری شکل اتری
ہوئی تھی۔ لیکن یہ گھر تو تباہی مصیبتوں کا شکار، میری
شکل کی طرف کون توجہ دیتا۔ حسب معمول میں کام پر چلا

گیا، وہاں بھی میری طبیعت نہ لگی ڈیپ چند تھوڑی دیر کے لئے آیا تھا اور پھر وہ آوارہ گردی کرنے چلا گیا۔ اس شام میں جلد واپس آ گیا طبیعت گری گری تھی۔ ویسے بھی دیپ چند کی وجہ سے مجھے بڑی مراعات حاصل تھیں۔

گھر کا معمول حسب دستور تھا ماں بستر پر پڑی تھی۔ اور کمرے سے شاہدہ کے گنگنانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ گنگناہٹ مجھے کچھ خوشگوار معلوم ہوئی۔ شاہدہ کی خوشی سے مجھے خوشی ہوئی تھی۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ اور نہ جانے کیوں مجھے کچھ عجیب سا لگا شاہدہ نے بڑے سلیقے سے بال سنوارے تھے اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی سرخی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ بھونچکی سی رہ گئی اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا مگر میری آواز سے اس کی ڈھارس بندھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"آج تو بڑی تیاریاں ہو رہی ہیں، کہاں جا رہی ہو؟"

"وہ ــــ بھیا جان ــــ پڑوس میں زرینہ ہے ــــ اس کی منگنی ہے۔" وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں بولی۔ اور پہلی بار میں نے سوچا کہ میری بہن بھی جوان ہے۔ مجھے اس کی شادی بھی کرنی چاہیئے شاہدہ نے برقع اوڑھا اور باہر نکل گئی۔ ماں بے چاری تو کسی معاملے میں مداخلت کرتی ہی نہیں تھی۔ میں پلنگ پر لیٹ گیا اور نہ جانے کیوں میرے ذہن میں پھر شاہدہ رینگ آئی۔ میں نے اس کی کیفیات پر غور کیا، مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ کیوں اتر گیا تھا۔ اور پھر اس کے لہجے کی بوکھلاہٹ ــــ کیا بات تھی ــــ جوان بہن کی یہ کیفیت میرے لئے ہولناک تھی یہ نہیں کون سی عزت دی تھی خدا نخواستہ رہی بھی

بھی مٹی میں مل جائے۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ شاہدہ
سے کہوں گا کہ مجھے یہ آزادی پسند نہیں ہے۔ لیکن اس
کے ساتھ ہی ایک خیال میرے ذہن میں کوندا۔ شاہدہ
نے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگائی تھی، لپ اسٹک کہاں سے
آئی۔ گھر میں تو کسی نے لا کر دی نہیں ہوگی۔ نہ جانے کیوں
یہ کرید میرے ذہن میں بڑھ گئی اور میں ایک مجرمانہ
حرکت کرنے سے باز نہ رہ سکا۔ میں نے شاہدہ کے ٹین
کے ٹرنک کو کھول کر دیکھا اور ایک بار پھر میرے پیروں
تلے سے زمین نکل گئی۔

جب ہم لوگ تارا گڑھ سے چلے تھے تو ہمارے پاس
تن کے کپڑوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ یہاں رہ کر دو چار
سادہ سادہ کپڑے بنائے گئے تھے۔ مگر شاہدہ کے ٹرنک
میں کئی ریشمی کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ اعلیٰ
درجے کی تین چار باڈیاں بھی تھیں اور میک اپ کا قیمتی
سامان بھی موجود تھا۔ یہ سب کہاں سے آیا؟ میرے ذہن
میں ہتھوڑے پڑنے لگے۔ پھر میں نے خود کو سنبھالا اور تمام
سامان اسی طرح رکھ کر میں والدہ کے پاس پہنچا۔ میں نے
انہیں جگایا اور وہ آنکھیں کھول کر مجھے دیکھنے لگیں۔

"میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں امی۔"

"کیا بات ہے۔" انہوں نے کراہتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا شاہدہ کے جہیز کے لئے آپ نے کچھ خریدا ہے؟"

"نہیں بیٹے، ابھی تک کچھ نہیں۔ مگر میں سوچ رہی ہوں
کہ کچھ کروں۔ میں نے کچھ پیسے جمع کئے ہیں کسی دن بازار
جا کر کچھ خریداری کروں گی۔"

"مگر امی، شاہدہ کے ٹرنک میں تو کافی سامان ہے؟"

"کیسا سامان ——؟" والدہ نے پوچھا۔ اور میں نے
ٹرنک لا کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ والدہ کی آنکھوں میں
تاریکی چھا گئی تھی۔ "مجھے نہیں معلوم شارق کہ یہ سامان کہاں
سے آیا۔" انہوں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا میں شاہدہ سے پوچھوں امی؟"

"تم مت پوچھنا بیٹے، میں خود پوچھوں گی۔" امی
نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا اور میں گردن جھکائے وہاں
سے چلا آیا۔ ایک بار پھر میرا دل ہل گیا۔ اگر شاہدہ رہی سہی
عزت بھی لٹا بیٹھی تو کیا ہوگا۔ اور پھر میرے ذہن میں
ایک نیا خیال آیا۔ میں گھر سے نکل آیا۔ جس لڑکی کے
بارے میں شاہدہ نے بتایا تھا اس کا مکان زیادہ دور نہیں
تھا۔ میں اسی طرف جا رہا تھا۔ مکان پر پہنچ کر میں نے
دروازہ بجایا۔ اور ایک ادھیڑ عمر شخص باہر نکل آیا۔

"میں آپ کے پڑوس میں رہتا ہوں۔" میں نے
تعارف کرایا۔

"میں جانتا ہوں شارق میاں، آپ تو اتنے مصروف
رہتے ہیں کہ کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ گھر سے البتہ
جاتی رہتی ہیں۔"

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔ "کیا آج آپ کی لڑکی کی
منگنی ہے؟"

"منگنی، ارے میاں کہاں، بیٹی کا باپ ہونا تو عذاب
ہے۔ لڑکے آج کل کہاں ملتے ہیں، زرینہ ماشاءاللہ جوان
ہے مگر —— اگر تمہاری نظروں میں کوئی لڑکا ہو تو بتانا۔
مجھے کچھ نہیں چاہئے، بس لڑکا محنتی اور ہاتھ پاؤں کا
درست ہو۔ بڑے میاں اپنی ہانکے جا رہے تھے اور میرا
دماغ سن ہو رہا تھا۔ میں نے آخری سہارا لینے کے لئے کہا۔

"براہِ کرم ذرا شاہدہ کو بھیج دیجئے، کہہ دیجئے اس کا
بھائی بلانے آیا ہے۔"

"شاہدہ تمہاری بہن معلوم کرتا ہوں۔ میرے سامنے تو
نہیں آئی۔" بڑے میاں اندر چلے آئے اور پھر چند سیکنڈ
کے بعد واپس آ کر بولے۔ "نہیں میاں وہ یہاں نہیں آئی۔"

میرے دل پر ایک زوردار گھونسا پڑا تھا، لیکن ان کے سامنے مَیں نے اظہار نہ ہونے دیا اور وہاں سے واپس چلا آیا۔ میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ آخر شاہدہ کہاں گئی۔ اس کے بکس میں سامان کہاں سے آیا۔ شام سات بجے شاہدہ واپس آئی اور بہت خوش تھی۔ اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ لیکن جن حالات سے مَیں گزر رہا تھا، ان کے تحت مجھے خود کو ٹھنڈا رکھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ مَیں نے اس سے کچھ نہ کہا۔ البتہ پہلی بار مَیں نے شاہدہ کو دوسری نظروں سے دیکھا۔ مجھے اس کے جسم میں چند تبدیلیاں نظر آئیں۔ اس کا نوخیز سینہ ڈھل رہا تھا۔ پیٹ بھی کچھ بے ڈول ہو گیا تھا۔ مَیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا، اور پھر اندر سے مجھے والدہ کے چیخ سنائی دی۔ مَیں دوڑتا ہوا اندر گیا تو والدہ کی بہت بُری حالت تھی۔ شاہدہ کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔ مَیں والدہ کو سنبھالنے لگا، انہیں پانی وغیرہ پلایا اور وہ آنکھیں بند کر کے بستر پر پڑ گئیں۔ میرے لاکھ پوچھنے پر بھی انہوں نے کوئی بات نہیں بتائی تھی۔

رات کو دیپ چند آ گیا۔ اس کے منہ سے شراب کی بُو آ رہی تھی۔ یہ بُو مَیں نے اکثر محسوس کی تھی لیکن ظاہر ہے مجھے دیپ چند سے پوچھنے کا حق نہیں تھا۔ وہ بستر پر لیٹا اور سو گیا۔ مَیں نے رات آنکھوں میں کاٹی۔ اور پھر نہ جانے رات کتنی باقی تھی کہ میری آنکھ لگ گئی۔ ذہن بالکل ناکارہ ہو گیا تھا۔ سوتے میں بھی بھیانک خواب دیکھتا رہا۔ اور جب صبح جاگا تو بدن ٹوٹ رہا تھا۔ منہ کا مزہ خراب تھا۔ دیپ چند شاید رفع حاجت کو گیا تھا۔ مَیں منہ دھو کر والدہ کے پاس پہنچ گیا، لیکن ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی میں اچھل پڑا۔ والدہ دل پر ہاتھ رکھے تڑپ رہی تھیں۔

"امّی امّی!" مَیں بدحواس ہو کر چیخا اور انہیں پلانے کے لئے پانی لایا۔ بمشکل انہوں نے سنبھالا لیا اور سیدھی ہو گئیں۔ "پانی پی لیجئے امّی!" مَیں نے کہا اور انہوں نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا۔

"شارق بیٹے، ہماری — ہماری تباہی مکمل ہو گئی ہے۔ اب زندگی کا بوجھ نہیں سنبھالا جاتا — شاہدہ — شاہدہ حاملہ ہے، وہ — وہ حمل — دیپ — دیپ چند کا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہیں امّی!" مَیں بدحواس ہو کر چیخا۔

"صبر — صبر — صبر کرو شارق — اللہ تعالیٰ امتحان —" اور ان کی آواز خرخراہٹ میں تبدیل ہو گئی۔ مَیں نے انہیں جھنجھوڑا لیکن ان کے جسم پر تشنج طاری تھا۔ اور پھر وہ تشنج بھی ختم ہو گیا، ان کی آنکھیں پھیلی رہ گئی تھیں۔ میں ان کی لاش سے لپٹ گیا اور بلک بلک کر رونے لگا۔ شاہدہ نہ جانے کہاں تھی وہ میرے رونے کی آواز سن کر بھی نہیں آئی۔ نہ جانے کب تک میں روتا رہا۔ پھر ذرا سنبھلا تو مَیں نے شاہدہ کو آوازیں دیں لیکن کوئی جواب نہ ملا — میرے ہوش گم تھے، والدہ کی اچانک موت اور پھر ایک ہمدرد ایک دوست کی دغابازی، مگر غلطی میری ہی تھی۔ مَیں نے جوان بہن کے گھر میں ہوتے ہوئے دیپ چند کی مدد قبول ہی کیوں کی تھی۔ میں شاہدہ کو تلاش کرتا ہوا باہر نکل آیا۔ اتنی صبح وہ کہاں چلی گئی تھی۔ پھر نہ جانے مجھے کیا خیال آیا اور مَیں نے کمرے میں جا کر شاہدہ کا ٹرنک دیکھا، لیکن — ٹرنک غائب تھا۔ مجھے چکر آ گیا۔ پھر اپنے کمرے میں جا کر مَیں نے دیپ چند کا سامان تلاش کیا — اور وہ بھی مجھے نہ ملا۔

اب کسی خوش فہمی کی گنجائش نہیں تھی۔ میرے دماغ کی

نہیں بھیجی جا رہی تھیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کپڑے پھاڑ
کر دیوانہ وار قہقہے لگاتا ہوا باہر نکل جاؤں۔ لیکن یہ بھی
میرے بس کی بات نہیں تھی۔ گھر میں ماں کی بے گور و کفن
لاش پڑی تھی۔ اس نے ماں کے سامان میں پیسے تلاش کئے
شاہدہ نے یہی کرم کیا تھا کہ ماں کے کفن کے پیسے نہیں
لے گئی تھی۔ چند پڑوسیوں کو اطلاع کر کے میں نے کفن
دفن کا انتظام کیا۔ بہت سے پڑوسیوں نے مجھ سے
شاہدہ کے بارے میں پوچھا مگر میں انہیں کیا جواب دیتا۔
لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ میری خاموشی سے کچھ
لوگ اندازہ لگا چکے تھے کہ شاہدہ گھر میں موجود نہیں ہے۔
اور ممکن ہے بڑھیا کی موت بھی اسی کی گمشدگی سے
ہوئی ہے۔

ماں کو مٹی کے نیچے دفن کرنے کے بعد میں اس بھری
دنیا میں یکہ و تنہا رہ گیا تھا۔ اب زندگی کا کوئی مقصد نہیں
تھا۔ دیپ چند نے بھی دھوکا دیا تھا۔ عارف چلا گیا تھا،
شاہدہ دغا دے گئی تھی۔ زندگی ایک بوجھ بن گئی تھی ——
میرے کانوں میں رہ رہ کر سر کٹے کے الفاظ گونج رہے تھے۔
باسدیو مہاراج کا دوسرا تحفہ وصول کرو۔ بلاشبہ یہ دوسرا
تحفہ بھی پہلے تحفے سے کم نہیں تھا۔ اچھی بات ہے ملعون
بوڑھے۔ تیرے دل کی حسرت حسرت ہی رہے گی۔ میں
بھی تیری خواہش پوری نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے فیصلہ
کر لیا کہ میں اپنی زندگی ختم کر لوں۔ اتنے صدمے برداشت
کئے تھے کہ زندگی ایک ناسور بن گئی تھی، کوئی امنگ،
کوئی خواہش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ میں دیوانوں کی طرح
مارا مارا پھرتا رہا۔ گھر واپس جانے کا سوال ہی نہیں تھا کیسا
گھر کس کا گھر۔ آخر میں ریلوے لائن کے سہارے سہارے
چلنے لگا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ چلتا رہوں گا اور جونہی
دور سے کوئی گاڑی نظر آئے گی، اپنی گردن پٹڑی پر رکھ
دوں گا۔ اسی طرح میں چندوسی سے کافی دور نکل آیا۔
خاصی رات ہو گئی تھی، چاروں طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔
میں چلتا رہا۔ اور پھر اچانک دور سے مجھے روشنی نظر آئی۔
ٹرین آ رہی تھی۔ میری زندگی کا اختتام تھا۔
میں رک گیا۔ انجن کی چنگھاڑ دل ہلا رہی تھی۔ لیکن جسے
زندگی سے دلچسپی نہ ہو اس کے لئے یہ سب چیزیں بیکار
ہیں۔ میں پٹڑی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ آنکھوں میں والدہ اور
والد کا تصور تھا۔ اور گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے
آخری بار کلمہ پڑھا اور گردن پٹڑی پر رکھ دی۔ کانوں
میں بادلوں کی سی گرج سنائی دے رہی تھی۔ ٹرین کی
دھڑ دھڑاہٹ سے پٹڑی ہل رہی تھی اور ٹرین قریب
آتی جا رہی تھی، قریب اور قریب، میرے کانوں نے انجن
کی سنسناہٹ سنی، اب وہ مجھ سے چند گز دور تھا، صرف
چند گز دور —— اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

. . . . اور پھر میرے کان سن ہو گئے۔ انجن کی ہیبت
گڑگڑاہٹ مجھ سے صرف چند فٹ دور تھی۔ میرا ذہن تاریک ہو گیا
چشم تصور سے میں نے اپنی گردن ریل کی پٹڑیوں کے درمیان اور
بقیہ جسم دوسری طرف تڑپتے دیکھا لیکن —— پھر ایک عجیب سا
احساس ہوا۔ مجھے یہ سب سوچنے کا موقع کیسے مل گیا۔ انجن تو مجھ
سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر تھا اور اب اس کے آہنی پہیوں کو
میری گردن چھو لینی چاہئے تھی۔ لیکن —— اس کی گڑگڑاہٹ
مجھے اپنے سر پر محسوس ہو رہی تھی۔ اور میری گردن کو کوئی تکلیف
نہیں پہنچی تھی۔ ایک سیکنڈ —— دس سیکنڈ —— تیس سیکنڈ،
اور پھر ایسا محسوس ہوا جیسے ٹرین گزر چکی ہے۔ کان بدستور سائیں،
سائیں کر رہے تھے اور اعضا مفلوج تھے۔

ایک منٹ تک میں ہاتھ بھی نہیں ہلا سکا۔ یہ کیا ہوا۔ کیا
میں زندہ ہوں، مگر کیسے —— مجھے یاد ہے کہ یہ سنگل لائن تھی۔

یہ بھی نہیں سوچا جا سکتا کہ ٹرین کسی دوسری لائن سے گزر گئی ہو پھر کیا میں زندہ ہوں، کیا میری گردن شانوں سے جڑی ہوئی ہے؟ بمشکل تمام میں نے ایک ہاتھ کو حرکت دی اور اپنی گردن ٹٹولی۔ بلاشبہ میری گردن موجود تھی، میرے حواس واپس آ گئے۔ اور میں دونوں ہاتھوں کا سہارا لے کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ کیسے ہوا؟ کیسے ہوا؟ پوری ٹرین میری گردن سے گزر گئی، لیکن میرا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ میں حیران و پریشان یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور میں چونک کر پلٹا ——

اندھیرے میں کوئی میری طرف آ رہا تھا، کوئی انسانی سایہ۔ میں اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اور پھر میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میری تاریکی سے مانوس آنکھوں نے سائے کو نامکمل محسوس کر لیا تھا۔ اس کے شانوں پر گردن نہیں تھی۔ سیاہ ننگ دھڑنگ، میرا جانا پہچانا جسم تھا۔ یہ باسدیو کا ہرکارہ تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ میرے نزدیک پہنچ گیا۔ اس کی گردن سے بدستور گاڑھا خون ابل رہا تھا۔ میں خوف کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔ چاروں طرف سناٹا، تاریکی اور اس بھیانک ماحول میں ایک ایسا انسان جس کی گردن غائب تھی، مجھ سے صرف چند گز کے فاصلے پر اپنے قدموں پر کھڑا تھا۔ میری رگوں میں خون منجمد ہونے لگا اور پھر اس کے وحشت ناک قہقہے نے میرے رہے سہے اوسان خطا کر دیئے۔

"تو خودکشی کرنا چاہتا ہے مورکھ —— پرنت تو یہ بھول گیا کہ تجھے مہاراج باسدیو کا کام کرنا ہے۔ تو ان کی آگیا کے بنا مر بھی نہیں سکتا۔ اگر تو مر گیا تو مہاراج اس مسجد میں کیسے پہنچیں گے۔ اس کارن تجھے زندہ رہنا ہے۔ اب بھی مہاراج کی بات مان لے جو کچھ ہو گیا ہے اس سے آگے نہ ہو گا۔"

باسدیو کا نام سن کر میری رگوں میں خون کھول اٹھا۔ تھوڑی دیر پہلے میں اس سرکٹے سے خوف زدہ تھا لیکن باسدیو کے نام نے میرے انگ انگ میں چنگاریاں بھر دیں —— مجھے اپنے خاندان کی تباہی یاد آ گئی۔ اور میں غیظ کے عالم میں بولا:

"اس نابکار بوڑھے نے اب چھوڑا کیا ہے؟ میں اپنی زندگی کے لئے اس کی ناپاک خواہش کبھی پوری نہیں کروں گا۔ دیکھتا ہوں وہ میرا کیا کر لیتا ہے۔"

"مہاراج سے بیر نہ باندھ مورکھ، ابھی صرف تیرا کٹم تباہ ہوا ہے، مگر اب تیری وجہ سے انیک کٹم تباہ ہوں گے۔ سنسار تجھ سے نفرت کرے گا اور تو اپنے آپ سے نفرت کرے گا۔"

"میں اس وقت کے لئے خود کو زندہ نہیں رکھوں گا۔ اس بوڑھے خبیث سے کہہ دے کہ وہ اپنی خوفناک قوتوں کو آخری حد تک آزما لے۔ میں اس کا مقابلہ کروں گا۔" میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ اور بے سر کا خبیث چند سیکنڈ کھڑے رہنے کے بعد واپس لوٹ گیا۔ وہ میرے سامنے چند قدم چلا اور پھر

پیارے پیارے بچوں کیلئے

محمود خاور کی خوبصورت کتابیں

جاسوسی ناول
میرا کون ہے 5 روپے
عجیب آواز 5 روپے
تین قیدی 5 روپے
ناکام منصوبہ 5 روپے
سلیمان پر کیا گزری 5 روپے
حامد کی آپ بیتی 5 روپے
ننھے شیطان 5 روپے

ٹارزن
ٹارزن کی مصیبت 5/50 روپے
ٹارزن اور بھیڑیو 5 روپے
ٹارزن اور کالا شیر 5 روپے
ٹارزن کے دشمن 6/50 روپے
ننھا ٹارزن 4/50 روپے
عقلمند شہزادہ 5 روپے

معلومات
کیا آپ جانتے ہیں روپے
بچوں کی معلومات روپے
بچوں کا انسائیکلوپیڈیا (زیر طبع)

لطیفے
ہنسو اور ہنساؤ 5 روپے
ذرا مسکرایئے 6 روپے
مسکراہٹیں اور لطیفے 6 روپے
مسکراتے رہو 5 روپے

پراسرار ناول
انوکھی بلا (اول) 4/50 روپے
بلا کا شکنجہ (دوم) 6/50 روپے
خون کی پیاس (اول) 4/50 روپے
پراسرار کتا (دوم) 4/50 روپے
ڈریکولا 10 روپے
ڈریکولا ٹو 2/- روپے

عمرو عیار کے مزیدار ناول
عمرو عیار کی طاقت 6/50 روپے
عمرو عیار اور تلی بادشاہ 6/50 روپے
عمرو عیار کی ٹکر 6/50 روپے
عمرو عیار اور بھوتوں کا مقابلہ 8/- روپے
عمرو عیار اور سرخانی مہر 8/50 روپے
عمرو کا تم (خاص نمبر) 18/- روپے

ان کے علاوہ بے شمار دلچسپ کہانیاں
اور بڑوں کے لئے دینی کتابیں
ملنے کا پتہ
رنگارنگ کتاب گھر 27 اردو بازار کراچی 2163619

اچانک غائب ہو گیا۔ میرے دل سے تمام خوف اور وحشت نکل گئی تھی اور میرا وجود نفرت کی آگ میں سلگ رہا تھا۔ باسدیو کتنا مجھے مرنے بھی نہیں دے رہا تھا۔ پوری ٹرین مجھ پر سے گزر گئی تھی۔ مگر میری گردن کو کوئی گزند نہ پہنچی تھی۔ یقیناً یہ اسی خبیث کا کارنامہ تھا۔ پھر اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ خودکشی ــــ صرف خودکشی ــــ اس نے کہا ہے کہ میری وجہ سے بہت سے خاندان تباہ ہوں گے۔ میں یہ گناہ نہیں کرنا چاہتا تھا! ور اس سے بچنے کا طریقہ صرف خودکشی تھا۔ لیکن خودکشی کس طرح کی جائے ــــ باسدیو یقیناً میری راہ میں روڑے اٹکائے گا۔ کچھ بھی ہو میں اپنا وجود فنا کر دوں گا۔ میں اس کی ناپاک خواہش کبھی نہیں پوری کروں گا۔ میں نے سوچا اور میرے قدم ریل کی پٹڑی کے سہارے اٹھنے لگے ہیں۔ بے مقصد آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک انسان جو مرنے کا فیصلہ کر چکا ہو، اس کے سامنے دنیا کی ہر مشکل ہیچ ہوتی ہے میں نے فیصلہ کیا کہ میں چلتا رہوں گا۔ اس وقت تک جب تک ٹانگوں میں دم ہے۔ اس دوران میں نہ کچھ کھاؤں گا نہ پانی پیوں گا۔ اس طرح تو مر سکوں گا۔ دیکھتا ہوں اس طرح وہ کتا مجھے کیسے بچائے گا۔ میں چلتا رہا ــــ اور رات ڈھلتی رہی۔ اُف کیسی طویل اور بھیانک رات تھی۔ تنہائی، ویرانی، اب اس ویران رات میں ایک ایسے دل کا تصور کر سکتے ہیں جو زخموں سے چور چور ہو، جس میں مرنے کی آرزو ہو، لیکن موت جس سے دور بھاگ رہی ہو۔ کوئی امنگ نہیں تھی، کوئی خواہش نہیں تھی، ویرانی دل کی ویرانی۔ اور تاریک رات، میرا ذہن سونے لگا، پاؤں پتھر کے ہو گئے، رفتار کم ہو گئی اور پھر قدم مشکل اٹھنے لگے، میرے سینے میں درد ہونے لگا تھا، زبان سوکھے چمڑے کی طرح ہو گئی تھی اور میں اس کیفیت سے خوش تھا۔ موت قدم بہ قدم میرے نزدیک آ رہی تھی! ور میں اس شکاری کی طرح محتاط تھا۔ جو جال لگائے شکار کی گھات میں بیٹھا ہو اور اسے خوف ہو کہ اس کی ذرا سی آہٹ سے شکار ہوشیار نہ ہو جائے۔ ہاں میں موت کو شکار کر رہا ہوں۔ اور پھر مجھے اپنے لڑکھڑا کر گرنے کا احساس ہوا۔ ہوش کا آخری خیال بڑا مسرت افزا تھا۔ شاید میں مر رہا تھا۔ شاید!

اور پھر جب ہوش آیا، تو میں نے خود کو جنت میں پایا۔ میں نے اردگرد کے ماحول پر نگاہ دوڑائی، ایک خوبصورت کمرہ تھا۔ چاروں طرف قیمتی پردے لٹکے ہوئے تھے۔ انتہائی خوبصورت فرنیچر سجا ہوا تھا۔ میں خود ایسی مسہری پر دراز تھا۔ جس کا گدا شاید ہوا سے بنا ہوا تھا۔ میرے جسم کی ہر جنبش سے نرم گدا نیچے دب جاتا۔ یقیناً یہ جنت ہے، تو مجھے اس موذی باسدیو سے نجات مل گئی اور مجھے میری مصیبتوں کے صلے میں جنت ملی ہے۔ یہاں مجھے میری والدہ اور والد بھی مل گئے وہ بھی ایسے ہی کسی کمرے میں ہوں گے۔ میں نے اپنے جسم پر نگاہ دوڑائی، میں ایک انتہائی قیمتی لبادہ پہنے ہوئے تھا جو نرم و نفیس کپڑے کا تھا۔ میں مسہری پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور مجھے ایک حور نظر آئی۔ بلاشبہ وہ حور تھی، لیکن دنیاوی لباس میں۔ اس نے گہرے سبز رنگ کی ساڑی باندھی ہوئی تھی۔ سر میں چنبیلی کے پھول گندھے ہوئے تھے۔ بڑی بڑی حسین آنکھوں پر پلکوں کی حسین جھالر یاقوت سے تراشے ہوئے ہونٹ، سرو قد، اس کے ہونٹوں پر دلآویز مسکراہٹ تھی۔ آہستہ آہستہ وہ میرے قریب پہنچ گئی اور اس کی مترنم آواز گونجی۔

"شارق!" اس آواز اور اس لہجے میں بڑی مٹھاس تھی۔ میں اس کے حسن سے مسحور ہو گیا تھا۔ اس کی پکار کا جواب بھی نہ دے سکا۔ میرے لئے یہ تصور کیا کم روح افزا تھا کہ مرنے کے بعد مجھے جنت ملی ہے۔ "کیسی طبیعت ہے؟" اس نے پوچھا جواب نہ دینا خلاف آداب و اخلاق تھا، چنانچہ میں نے اسے بتایا کہ "ٹھیک ہوں۔" اس نے ایک طرف دیوار میں لگا ہوا ایک بٹن دبایا اور ایک اور خوبصورت لڑکی اندر آ گئی۔

"شارق صاحب کے لئے پھلوں کا رس لے آؤ۔" اس نے کہا اور آنے والی واپس چلی گئی۔ چند لمحات کے بعد وہ ایک خوبصورت ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر آ گئی۔ جس پر ایک نفیس بلوریں جگ اور گلاس رکھے ہوئے تھے۔ سبز ساڑی والی نے اپنے مخروطی ہاتھوں سے گلاس میں انڈیل کر مجھے دیا۔ اور بے اختیار میرا ہاتھ آگے بڑھ گیا۔ رس پیتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اس سے کیسے گفتگو کروں، کیسے کروں۔ وہ بدستور مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ رس پینے کے بعد میں نے گلاس ٹرالی میں رکھ دیا اور ہونٹ خشک کر کے بولا:

"شکریہ، میں تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"میرا نام سستا ہے شارق صاحب، آپ مجھے اپنی ادنیٰ خادمہ سمجھئے۔"

"سستا" میں نے حیرت سے سوچا۔ ایسے نام تو ہندی میں ہوتے ہیں۔ اس نام کی جوڑ لیکن میں اس سے زیادہ نہیں سوچ سکا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ "آیئے، باہر چلیں۔" اور میں بے اختیار اٹھ گیا۔ نرم قالین پر سلیپر پڑے ہوئے تھے۔ جو میرے پیروں میں بالکل ٹھیک تھے۔ میں اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ایک چکنی راہداری سے گزر کر ہم ایک بڑے ہال میں پہنچ گئے۔ لیکن ہال میں قدم رکھتے ہی میرا دل دھک سے ہو گیا۔ یہ —— یہ تو کسی طوائف کے گھر کا ماحول تھا۔ ہال میں قیمتی قالین بچھا ہوا تھا، چھت میں بے حد نفیس فانوس روشن تھے۔ ایک طرف گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے جن کے سہارے بہت سے اوباش شکل نوجوان اور ادھیڑ عمر آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر پان کی دھڑی تھی اور آنکھوں میں شراب کی سرخی۔ دوسری طرف سازندے بیٹھے اپنے ساز درست کر رہے تھے۔ دو اور خوبصورت لڑکیاں جو صورت شکل میں سستا میں کافی مشابہت رکھتی تھیں، دوزانو بیٹھی تھیں اور ان کے پیچھے ایک موٹی بھسی عورت خوب میک اپ کئے موجود تھی۔

ہمارے اندر داخل ہوتے ہی بہت سی بیہودہ آوازیں گونج اٹھیں:

"قتل کر دیا بائی جی ——"

"ہم تو انتظار میں شہید ہو گئے جانِ من۔"

"شروع کرو کہ دلِ مضطر کو سکون نصیب ہو۔"

میں حیران و پریشان اس پورے ماحول کو دیکھ رہا تھا۔ سستا مجھے لئے ہوئے ایک علیحدہ قالین کی طرف بڑھ گئی۔ جو خاص طریقے سے سجایا گیا تھا۔ اور پھر اس نے مجھے وہاں بٹھا دیا۔ میں اس ماحول پر سخت حیران تھا۔ میں اسے جنت سمجھ رہا تھا، لیکن —— لیکن میں یہاں کیسے آ گیا۔ سستا آگے بڑھ گئی۔ میں نے ہال پر ایک نگاہ ڈالی۔ بہت سے لوگ کینہ توز نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ شاید انہیں سستا کا مجھ سے التفات پسند نہیں آیا تھا۔ اس وقت ساز بج اٹھے۔ اور کئی منٹ تک سازندے سُر درست کرتے رہے۔ پھر سستا نے ایک گیت شروع کر دیا۔ گیت کسی کی آمد پر مسرت کا اظہار تھا۔ سستا کی مسحور کن آواز نے سماں باندھ دیا۔ میرا دل بے اختیار اس کی طرف کھنچنے لگا۔ سستا ایک ایک بول پر مجھے مخاطب کر رہی تھی۔ اور دوسرے لوگ اس بات پر بے چین تھے۔

سستا بے حد حسین تھی۔ اس کی آواز بہت دلکش تھی۔ میرے ساتھ اس کا برتاؤ عجیب تھا لیکن اس کے باوجود میں اپنی الجھن نہیں دبا سکتا تھا۔ آخر میں یہاں کیسے آ گیا۔ میں تو شاید ریلوے لائن کے سہارے چلتے ہوئے بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ پھر —— پھر —— ادھر سستا کا گیت مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور دوسری طرف میری حیرانی قائم تھی اور مجھے احساس بھی نہ ہوا کہ گیت کب ختم ہو گیا۔ میں تو اس وقت سستا کی طرف متوجہ ہوا جب وہ ایک تماشائی کی کسی فرمائش پہ کہہ رہی تھی:

"مجھے افسوس ہے آج اس سے زیادہ خدمت نہ کرسکوں گی۔ آپ اگر چاہیں تو نیتا اور کلا سے سن سکتے ہیں۔"

"مگر ہم تو تمہارے دیوانے ہیں جانِ من۔" ایک بڑی بڑی مونچھوں والے نے کہا۔

"افسوس میرے مہمان آئے ہوئے ہیں، ورنہ خدمت کرتی۔"

"کہاں کے راج کمار ہیں یہ؟" ایک اور آدمی نے میرا مضحکہ اڑایا۔

"آئیے شارق صاحب۔" ستشا نے ان کی بات کا جواب دیئے بغیر میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔ اور پھر وہ دوسرے لوگوں کو بڑبڑاتے چھوڑ کر مجھے واپس میرے کمرے میں لے آئی۔ مجھے مسہری پر بٹھا کر وہ واپس پلٹی اور اس کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ بند کرکے وہ میرے پاس آکر میرے برابر بیٹھ گئی۔ "اگر آپ حکم دیں تو کچھ پیش کروں شارق صاحب۔"

"میں تم سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آرام کریں۔" اس نے میرے سینے پر اپنے نازک ہاتھوں سے دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ اور میں لیٹ گیا۔ وہ میرے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اس کا قرب میرے رگ و پے میں ایک عجیب سی سنسنی پیدا کر رہا تھا۔ لیکن حالات ایسے متحیّر کن تھے کہ میں کسی بھی مسئلے پر سنجیدگی سے نہیں سوچ سکتا تھا۔ "کیا سوالات کرنا چاہتے ہیں؟"

"تم کون ہو؟ میں یہاں کیسے آیا؟ تم میری ایسی خاطر مدارت کیوں کر رہی ہو؟ تم مجھے کیسے جانتی ہو؟" میں نے بیک وقت بہت سے سوالات کر ڈالے۔

"میں آپ کو اپنا نام بتا چکی ہوں۔ میرے گرو دیو نے مجھے آگیا دی ہے کہ میں آپ کی مہمانداری کروں اور انہوں نے آپ کو میرے پاس پہنچایا ہے۔ میں اپنے گرو کی ادنیٰ خادم ہوں! اور ان کی آگیا کا پالن کر رہی ہوں۔ ویسے آپ میری حیثیت جان چکے ہیں۔"

"مگر تمہارے گرو کون ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"سنت مہا سنت گیانی باسدیو مہاراج۔" اس نے بڑی عقیدت سے کہا۔ اور میں اس طرح اچھل پڑا۔ جیسے بچھو ڈنک مار رہا ہو۔ تو وہ باسدیو کی چیلی تھی اور باسدیو نے اب کوئی نیا چکر چلایا تھا۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرا چہرہ غصّے سے سرخ ہو گیا۔

"باسدیو نے مجھے یہاں کیوں پہنچایا ہے؟" میں نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

"گرو جی کو آپ پر دیا آگئی۔ سنا ہے آپ ریل کی پٹڑی کے کنارے بے ہوش پڑے تھے۔"

"دیا آگئی" — میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "اسے مجھ پر دیا نہیں آگئی، بلکہ اس نے میرے اوپر ایک اور نیا جال پھینکا ہے، لیکن میں اس جال کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ وہ خبیث مجھے کسی طرح رام نہیں کر سکتا۔" میں کھڑا ہو گیا۔

"شارق بابو، دھیرج کریں، بیٹھ جائیں۔" ستشا نہایت لوچ دار آواز میں بولی۔ اس نے میرا بازو پکڑ لیا تھا لیکن میں نے سختی سے اس سے بازو چھڑا لیا۔

"میں ایک منٹ یہاں نہیں رکوں گا۔ میں خودکشی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ دیکھتا ہوں وہ مجھے کہاں تک روکے گا۔ میں اس کی شیطانی قوتوں کے آگے بے بس ہوں، لیکن موت بے بس نہیں ہے، کبھی نہ کبھی ضرور آئے گی۔"

"شارق بابو، تھوڑی دیر کے لئے غصہ تھوک دیں، میری بات سن لیں، اس کے بعد میں آپ کو جانے سے نہیں روکوں گی۔ یوں بھی رات کافی گزر گئی ہے، اس وقت آپ کہاں جائیں گے۔ آپ کو یہاں رکنے میں یوں بھی اعتراض

نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ یہ ایک طوائف کا مکان ہے اور آپ آج رات میرے مہمان ہیں۔"

"مگر مجھے یہاں یاسدیو لایا ہے اس لئے" میں نے کہنا چاہا لیکن سشما نے میری بات کاٹ دی۔

"یہاں کوئی کسی کو نہیں لاتا سب اپنے قدموں سے چل کر آتے ہیں۔ آپ سمجھ لیجئے کہ آپ بھی ایک طوائف کے کوٹھے پر رات گزارنے آئے ہیں۔ میں نے آپ کی وجہ سے سب گاہکوں کو ناراض کر دیا ہے، آپ میری اتنی سی بات بھی نہیں مانیں گے۔" سشما نے التجا بھرے لہجے میں کہا۔

اس کی آواز میں ایسا گداز تھا کہ میرا غصہ قدرے دھیما پڑ گیا اور میں مسہری پر بیٹھ گیا۔ سشما ایک طرف بڑھ گئی۔ اس نے ایک الماری سے اعلیٰ درجے کی شراب کی بوتل نکال کر اور دو گلاس میز پر رکھے اور پھر ایک دوسری الماری کی طرف بڑھ گئی۔ میں اس کی حرکتوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس نے الماری سے ایک انتہائی خوبصورت اور جھلملاتا ہوا گاؤن نکالا اور میرے سامنے ہی ساڑھی کے بل کھولنے لگی۔

میرا دل ایک لمحے کے لئے پھر دھڑکا اور نظریں خود بخود جھک گئیں۔ جھکی ہوئی نظروں سے میں نے سشما کی ساڑھی ایک طرف پڑے ہوئے دیکھی، بلاؤز بھی اتر گیا۔ اور پھر سشما میرے قریب پہنچ گئی۔ اس نے بوتل اور گلاس میرے سامنے چھوٹی سی سنٹر ٹیبل پر رکھ دیئے۔ اور پھر وہ میرے نزدیک بیٹھ گئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور میری آنکھیں جل اٹھیں، جسم میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ سشما نے جو لباس پہنا تھا وہ جسم کو چھپانے کے لئے نہیں بلکہ اسے اور حسین اور پُرکشش بنا کر پیش کرنے کے لئے تھا۔ گلابی رنگ کے باریک گون کے نیچے اس کے جسم کے تمام خطوط نمایاں تھے۔ سنگ مرمر کے سے تراشے ہوئے جسم کے نقوش جنہیں دیکھ کر کوئی ذی ہوش خود پر قابو نہ رکھ سکے۔ پھر اس نے بوتل کھول کر دونوں گلاسوں میں شراب انڈیلی اور ایک گلاس ہاتھ میں اٹھا کر میرے زانوؤں پر لیٹ گئی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی مستی چھلک رہی تھی۔ اس کا گداز اور ریشم کی طرح ملائم اور چکنا جسم میرے جسم سے مس ہو رہا تھا۔ گلاس میرے منہ کے نزدیک پہنچ گیا۔

"میں شراب نہیں پیتا۔" میں نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میرے ہاتھوں سے بھی نہیں" وہ خمار آلود لہجے میں بولی۔

"نہیں سشما میں شراب نہیں پیوں گا۔" میں نے سخت اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اور اس کی آنکھوں میں اداسی تیرنے لگی۔ وہ جس انداز میں مجھ سے پیش آ رہی تھی، اس کو دیکھتے ہوئے مجھے اس کی اداسی پر افسوس ہوا۔ لیکن مجھے یاد تھا کہ وہ یاسدیو کی داسی ہے۔ اس کے علاوہ در حقیقت میں شراب جیسی چیز سے دور تھا اور جن حالات سے گزر رہا تھا ان کے تحت مجھے ایسی چیزوں سے بچنا تھا اس لئے میں نے خود کو قابو میں رکھا۔ سشما نے گلاس میز پر رکھ دیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چند منٹ گردن جھکائے بیٹھی رہی پھر بولی؛

"کچھ پوچھوں شارق بابو، برا تو نہیں مانو گے؟"

"پوچھو" میں نے کہا۔

"گرودیو آپ سے کیا چاہتے ہیں؟" وہ آہستہ سے بولی۔

میں نے چند لمحات سوچا اور پھر اسے تفصیل بتانے کا فیصلہ کر لیا۔ کم از کم اس طرح مجھے اس بوڑھے شیطان کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ پھر میں نے اسے تفصیل بتا دی، وہ گردن جھکائے سنتی رہی اور میرے خاموش ہونے کے بعد بھی کئی منٹ تک خاموش رہی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی، پھر وہ آہستہ لہجے میں بولی:

"آپ گرودیوکی اچھا پوری کیوں نہیں کر دیتے شارق بابو، آپ کو معلوم نہیں گرودیو کیسی مہان شکتی کے مالک ہیں۔ آپ کی زندگی بن جائے گی شارق بابو۔ مجھے آپ سے محبت ہوگئی ہے، میں چاہتی ہوں۔ ۔ ۔ ۔"

"بکواس مت کرو سشما، تم مجھ سے ایسی بات کہہ رہی ہو، جس کے لئے میں نے اپنا پورا گھرانہ تباہ کرا لیا ہے، میرے باپ، چچا، ماں، بہن، بھائی خوف ناک تباہی کا شکار ہو گئے ہیں۔ اب صرف میں ہوں۔ میں اپنی تنہا زندگی بتا کر کیا کروں گا۔ اور پھر باسدیو کی مدد تو میں قیامت تک نہیں کروں گا۔ میں دیکھوں گا وہ اپنی شکتی سے کیا کرتا ہے۔ میں اس وقت تک اس سے ڈرتا تھا جب میرے ماں باپ بہن بھائی زندہ تھے اب میں اس ذلیل بوڑھے سے بالکل نہیں ڈرتا۔" میں غصّے اور رنج سے بھرے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا۔

"مان جاؤ شارق بابو۔ میرے کاکن مان جاؤ، تمہیں میری محبت کا واسطہ۔" سشما نے میری گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ اس کے پورے جسم کا بوجھ میرے اوپر آپڑا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو ایک نوجوان مرد ہونے کی وجہ سے میں خود پر قابو نہ پا سکتا۔ سشما کا خود سپردگی کا انداز ایسا ہی ہیجان خیز تھا۔ لیکن اس وقت مجھے اپنے والد، والدہ بہن اور بھائی یاد آگئے تھے اس لئے میں نے پوری طاقت سے اسے ڈھکیل دیا۔

"اگر تم نے اس ذلیل بوڑھے کا نام دوبارہ لیا، تو میں ابھی اسی وقت یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تم مجھے کسی طرح نہیں روک سکتیں۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ وہ مجھے مجبور کر دے گا کہ میں اس کی بات مان لوں، میں دیکھوں گا کہ وہ مجھے کس طرح مجبور کرتا ہے۔" میں نے طیش کے عالم میں کہا اور اچانک سشما ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ وہ مجھے خونخوار نظروں سے گھور رہی تھی اور پھر میں نے ایک بھیانک لرزہ خیز منظر دیکھا۔

سشما کے چہرے کے خدوخال حیرت انگیز طور پر بدلنے جا رہے تھے۔ اس کے مرمریں جسم پر جھریاں پڑنے لگیں۔ دودھ کی طرح سفید رنگ مٹیالا ہوتے لگا۔ سر پہ بکھرے ہوئے گھنگریالے بال میلے اور گندے بالوں میں تبدیل ہونے لگے اور ——— صرف ایک منٹ کے بعد ——— سشما کی جگہ باسدیو میرے سامنے کھڑا تھا۔ ہاں وہی منحوس شیطان جس نے مجھے اس حال کو پہنچا دیا تھا۔ گو یہ تبدیلی میرے لئے سخت حیران کن اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی تھی لیکن باسدیو کو دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ بھی مجھے خوف ناک انداز میں گھور رہا تھا۔

"نادان بالک، کب تک اپنی ہٹ پہ ڈٹا رہے گا۔ تھوڑی سی زندگی ہے اسے عیش سے گزار دے۔ اب تک جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھول جا۔ میں پوری دنیا تیرے قدموں میں ڈال دوں گا میری بات مان لے۔"

"بوڑھے کتّے، آج تو میرے ہاتھوں سے نہیں بچ سکے گا۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔ اور دوسرے لمحے میں اس پر جھپٹ پڑا۔ میں نے اس کی گردن دونوں ہاتھوں سے دبوچ لی نہ جانے کہاں سے میرے ہاتھوں میں اتنی قوت آگئی۔ اس نے لاکھ ہاتھ پاؤں مارے لیکن خود کو میری گرفت سے آزاد نہ کرا سکا۔ اور اس کے حلق سے کئی کریہہ چیخیں نکل گئیں۔ وہ میرے آہنی شکنجے میں تڑپتا رہا اور پھر اس کا جسم سرد پڑ گیا تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ چیخوں کی آواز باہر تک گئی تھی۔ میں نے بہت سے قدموں کی چاپ سنی اور پھر دروازہ پیٹا جانے لگا۔ میں کسی سے خوفزدہ نہیں تھا۔ میں نے حقارت آمیز نگاہ بوڑھے کے مردہ جسم پہ ڈالی اور دروازے کی طرف بڑھ گیا ———

دروازے پر تمام سازندے، دونوں لڑکیاں جو سستما کی بہنیں تھیں اور موٹی نائکہ کھڑی تھی۔ انہوں نے خوفزدہ انداز میں مجھے دیکھا اور بوڑھی نائکہ بولی:

"کیا بات ہے سستما کیوں چیخ رہی تھی؟"

"سستما،" میں نے حقارت سے کہا۔ "دیکھ لو اپنی سستما کو، میں نے تم لوگوں کا طلسم توڑ دیا ہے۔ میں نے بوڑھے شیطان کو موت کی نیند سلا دیا ہے اور اگر تم لوگ بھی اس کے چیلے ہو تو میں تم سے بھی نپٹنے کے لئے تیار ہوں۔"

نائکہ نے بوڑھے باسدیو کی لاش کو دیکھا اور ایک دلدوز چیخ مار کر بولی:

"ہائے میری بچی۔ ہائے ظالم نے میری بچی کی ہتھیا کر ڈالی۔" دونوں لڑکیاں بھی چیختی ہوئی اندر لپکیں اور میں نے حیرانی سے پلٹ کر دیکھا۔ ایک بار پھر میری سٹی گم ہو گئی۔ وہ سستما ہی کی لاش تھی۔ وہی گداز اور حسین جسم، وہ حسین چہرہ لیکن اب اس کے چہرے پر مردنی تھی۔ حسین آنکھیں ادھ کھلی تھیں اور تکلیف کے آثار منجمد تھے۔ ابھی میں حیران ہی تھا کہ اچانک میرے سر پر ایک زوردار ضرب پڑی، حواس تو پہلی ضرب میں غائب ہو گئے تھے، لیکن ڈوبتے ہوئے ذہن کی آخری یادداشت وہ ٹھوکریں، لاتیں اور گھونسے تھے، جو میرے جسم کے مختلف حصوں میں ہتھوڑوں کی طرح برس رہے تھے۔ یہ سازندے تھے جو مجھے مار رہے تھے۔ دوسری بار ہسپتال میں آنکھ کھلی، پولیس کی زیر نگرانی تھا اور قتل کا مجرم۔ دوسرے دن میرے بیانات لئے گئے اور میں نے بیان دے دیا۔ پھر ایک طویل چکر چلا جس کا تذکرہ فضول ہے۔ میرا کوئی وکیل نہیں تھا۔ سرکاری وکیل نے مجھے ایک خطرناک مجرم قرار دیا تھا۔ جو جان بچانے کے لئے پاگل پن کا ڈھونگ رچا رہا تھا۔ اور سستما کو باسدیو بنا رہا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ شیطان باسدیو میرے ہاتھوں ہلاک نہیں ہوا اور اس نے ایک خطرناک چال چلی ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی خودکشی کا تصور پھر میرے ذہن میں رینگ آیا۔ اور تیسری پیشی میں میں نے اپنا بیان بدل دیا۔ میں نے اپنے اوپر بڑے گھناؤنے الزامات لگائے۔ سستما کو بالکل بے قصور قرار دیا۔ اور عدالت دنگ رہ گئی۔ پھر مجھے سزائے موت ملنے میں کوئی دقت نہ رہ گئی۔ میں جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں موت کے دن کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن مجھے اب بھی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ باسدیو پھر کوئی چال نہ چلے، وہ میری زندگی بچانے کا عہد کر چکا ہے اور وہی ہوا ——— وہ میری زندگی کی آخری رات تھی۔ دوسری صبح سات بجے مجھے سزائے موت دی جانے والی تھی۔ مجھے خوشی تھی کہ میری منحوس زندگی ختم ہو رہی ہے۔ اور اب باسدیو کی کچھ نہ چلے گی۔ رات کا آخری پہر تھا اور میں جیل کی تاریک کوٹھری کے ایک کونے میں پڑا سورج کی پہلی شعاع کا انتظار کر رہا تھا۔ سورج کی کرن جو میرے دکھوں کا خاتمہ کرنے والی تھی۔

دفعتاً مجھے اپنے قریب ہی کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ سانسوں کی آواز تھی۔ میں نے تاریکی میں ہاتھ آگے بڑھا کر ٹٹولا اور میرا ہاتھ کسی چپچپی چیز سے ٹکرایا۔ یہ کیا ہے میں نے سوچا اور ہاتھ کو ناک کے قریب لے گیا۔ اف کیسی شدید بدبو اٹھ رہی تھی اس سے میری طبیعت مالش کرنے لگی مگر میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا ہے۔ میں نے پھر ہاتھ آگے بڑھایا اور چپچپی چیز پھر میرے ہاتھ سے لگی۔ مگر اس بار میں نے ہاتھ ہٹانے کے بجائے اسے ٹٹولا ——— اور مجھے کسی انسانی جسم کا احساس ہوا۔ میری حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اس کوٹھری میں تو میں اکیلا تھا میں نے جلدی جلدی اس جسم پر ہاتھ گھمایا اور میرے جسم کا رواں رواں خوف سے کھڑا ہو گیا۔ بلاشبہ وہ انسانی جسم تھا لیکن اس کے شانوں سے گردن غائب تھی۔

اور تپتی ہیں سے گردن سے بہنے والا خون تھا۔ میں اچھل کر کھڑا ہو گیا! اور میرے کانوں میں ایک منحوس قہقہہ گونج اٹھا۔

"پہچان گئے؟" قہقہے کے بعد آواز سنائی دی اور یہ آواز میں بخوبی پہچانتا تھا۔ یہ اس سرکٹے کی آواز تھی جو بابو کا ہرکارہ تھا۔ خوف کی وجہ سے میرے منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ "مہاراج تمہیں موت کے گھاٹ نہیں اترنے دیں گے شارق بابو۔ تمہیں ان کا کام اوش کرنا ہے اب بھی سمے ہے کیوں جیون کھو رہے ہو — مہاراج کا کام کر دو، اور سنسار کو اپنے لئے سورگ بنا لو، بولو تیار ہو؟"

"ہرگز نہیں۔" میں نے غصہ اور نفرت سے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں اس موذی کے لئے کچھ نہیں کروں گا۔"

"ابھی تمہارے بھاگ ہیں اور کٹھنائیں ہیں، ٹھیک ہے یہاں سے نکلو اور گرو دیو کی قوت کا تماشہ دیکھو۔"

"میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا اور میرے کانوں میں سرکٹے کا گھناؤنا قہقہہ گونج اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک تیز بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور میرے ہوش جواب دینے لگے۔ پھر مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔ میرا ذہن تاریک ہو گیا۔ اور نہ جانے کب مجھے ہوش آیا۔ کئی منٹ تک مجھے احساس نہ ہوا کہ میں کہاں ہوں۔ میں یوں ہی پڑا آسمان کو گھورتا رہا اور میرے مکمل حواس واپس آگئے۔ مجھے احساس ہوا کہ میرے نیچے کوئی نرم شے ہے میں نے اس شے کو ٹٹولا اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ گھاس ہے۔ میرے منہ سے ایک کراہ نکلی! اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ ایک خوبصورت پائیں باغ تھا۔ سامنے ہی ایک سفید رنگ کی چھوٹی سی عمارت نظر آ رہی تھی۔ میں نے اپنے جسم پر نگاہ ڈالی اور حیران رہ گیا۔ میرے جسم پر جیل کے کپڑے نہیں تھے۔ بلکہ سفید پائجامہ اور قمیض تھی۔ البتہ میری ڈاڑھی وغیرہ اسی طرح بڑھی ہوئی تھی۔ میرا سر بری طرح چکرانے لگا۔ یہ شدید بھوک اور پیاس کا احساس تھا۔ دفعتاً مجھے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی اور اس سے قبل کہ میں پلٹ کر دیکھتا ایک نسوانی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

"ارے یہ کون ہے؟" میں نے پلٹ کر دیکھا — تین نوجوان لڑکیاں سامنے موجود تھیں، وہ سب عمدہ لباس میں تھیں اور مجھے دیکھ کر سخت حیران نظر آ رہی تھیں، پھر ان میں سے ایک جو سب سے زیادہ تیز طرار تھی آگے بڑھی اور کمر پہ ہاتھ رکھ کر سخت لہجے میں بولی:

"تم کون ہو جی، اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"معاف کیجئے، غلطی سے چلا آیا۔ جا رہا ہوں —" میں نے لجاجت سے کہا اور لڑکی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ارے لیسنی — یہ — یہ تو دولہا بھائی ہیں۔" دوسری دونوں لڑکیاں بھی تیزی سے آگے بڑھ آئیں — اور پھر انہوں نے شور مچا دیا۔ "دولہا بھائی آگئے — دولہا بھائی آگئے —"

تینوں لڑکیاں مجھ سے بری طرح لپٹ گئیں۔ انہیں اپنی نسوانیت کا احساس بھی نہیں رہا تھا۔ میں ان کے جوش کے سامنے کچھ بھی نہیں کر سکا، تاہم میں نے بمشکل خود کو ان سے چھڑایا اور بمشکل کہہ سکا:

"سنئے — سنیے تو سہی — آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے — میں — میں۔" لیکن لڑکیوں نے میری ایک بھی بات پر توجہ نہیں دی — وہ بدستور "دولہا بھائی آگئے، دولہا بھائی آگئے" کی رٹ لگائے ہوئے تھیں۔ پھر عمارت کے صدر دروازے میں مجھے کچھ

الگ نظر آئے۔ یہاں ہنگامہ دیکھ کر اور شاید لڑکیوں کی آواز سن کر وہ بھی اس طرف دوڑے اور میرے نزدیک پہنچ گئے۔ ان میں ایک معمر بزرگ جو خاصی وجیہہ شخصیت کے مالک تھے، ایسی ہی ایک خاتون اور ایک نوجوان لڑکا شامل تھے۔ معمر بزرگ کو دیکھ کر لڑکیوں نے مجھے چھوڑ دیا اور اپنے لباس درست کرنے لگیں۔ معمر خاتون پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں، پھر ان کی آنکھوں میں سے آنسو نکل پڑے اور وہ زار و قطار روتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئیں۔

"تم نے میری بچی کو مار ڈالا یوسف میاں، تم نے میری بچی کو مار ڈالا" وہ روتے ہوئے کہے جا رہی تھیں۔ میں بوکھلاہٹ میں اپنی بھوک اور کمزوری بھی بھول گیا۔ پورے خاندان کو کیسی غلط فہمی ہو رہی ہے۔ پھر معمر بزرگ آگے بڑھے اور انھوں نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا:

"آؤ بیٹے، غلطی انسان سے ہوتی ہے۔ میں تمہاری اعلیٰ ظرفی کی قدر کرتا ہوں، تم واپس آ گئے یہ ایک انسانی فرض تھا اس سے تمہاری سبکی نہیں ہوتی ہے۔"

"لیکن جناب" میں نے کچھ کہنا چاہا۔

"باقی گفتگو اندر چل کر ہو گی آؤ۔ دیکھو کیسے کمزور ہو گئے ہو۔ حلیہ خراب کر لیا ہے ذرا سی بات پر۔" انھوں نے میری بات کاٹ دی۔ اور میں ناچار ان کے ساتھ چل پڑا۔ نوجوان البتہ خاموش تھا۔ اس کی آنکھوں میں البتہ عجیب سی کیفیت تھی۔

وہ سب مجھے اندر لے گئے۔ معمر بزرگ نے ایک لڑکی کو ہدایت کہ میرا لباس وغیرہ نکال دے، نوجوان کو شیو کے سامان کی ہدایت کر کے مجھے زبردستی غسل خانے میں دھکیل دیا گیا۔ میں اس نئی افتاد پر سخت حیران و پریشان تھا، لیکن پھر میں نے وقتی طور پر حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ میں ان نیک لوگوں کو مناسب موقع پر صورت حال سے آگاہ کروں گا جو شدید غلط فہمی کے شکار ہو گئے ہیں۔

شیو اور غسل سے فارغ ہو کر میں نے لباس تبدیل کیا جو میرے جسم پر بالکل ٹھیک تھا، شاید میری ہی جسامت کے کسی آدمی کا تھا۔ غسل خانے کے باہر لوگ میرے منتظر تھے۔ لڑکیاں مجھے دیکھ کر مسکرانے لگیں اور پھر وہ مجھے ایک کمرے میں لے گئیں جو ڈائننگ روم تھا، جہاں میز پر چنی ہوئی تھی جس پر ناشتے کا سامان رکھا تھا۔ یہاں میں نے کوئی تکلف نہیں کیا اور تیزی سے ہاتھ کی صفائی دکھا تا رہا۔ لڑکیاں میرے اوپر ایک آدھ فقرہ چست کر دیتی تھیں اور بزرگ مسکرانے لگتے۔ انہوں نے کئی بار لڑکیوں کو سرزنش بھی کی۔

اچھی طرح سیر ہو کر میں کرسی کی پشت سے ٹک گیا اور پھر معمر خاتون مجھ سے بولیں "اب اس کم بخت جلی کی خبر بھی لے لو یوسف میاں، جو تمہارے لئے گیارہ مہینے سے تڑپ رہی ہے ہم نے لاکھ کوشش کی مگر وہ شرمندگی کی وجہ سے تمہارے سامنے نہیں آ رہی۔"

"میں آپ سے تنہائی میں کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں محترم۔" میں نے بزرگ سے کہا۔

"یوسف میاں، میری درخواست ہے پہلے تو اس سے مل لو، اس کے بعد ہم اطمینان سے گفتگو کریں گے۔" بزرگ کہنے لگے۔

"لیکن آپ سب ایک بہت بڑی غلط فہمی کے شکار ہیں۔" میں بمشکل کہہ سکا۔

"ابا میاں، ان کا دل ابھی تک صاف نہیں ہے۔" نوجوان غصیلے لہجے میں بولا۔ "انھوں نے باجی کو زندہ درگور کر دیا۔ اگر ابھی تک ان کا دل صاف نہیں ہوا تو ان سے پوچھئے کہ یہ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"تو میرے سامنے بکواس کیوں کرتا ہے مردود، نکل جا یہاں سے، تم سب نے مل کر ہی میری بچی کا مقدر خراب کیا ہے۔ یوسف میاں، آخری درخواست ہے کہ تم پہلے رقیہ سے مل لو،

اس کے بعد تم جو کچھ کہو گے میں سن لوں گا۔ اس کی حالت دیکھ لو شاید اس کے بعد تم کوئی مناسب فیصلہ کر لو۔" بزرگ اٹھتے ہوئے بولے۔

نوجوان پہلے ہی باہر چلا گیا تھا، بزرگ بھی باہر نکل گئے میں حیران و پریشان کھڑا رہ گیا۔ اسی وقت خاتون کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

"اتنی سنگدلی اچھی نہیں ہے بیٹے، میری بچی پر رحم کرو۔" وہ پھر رونے لگیں اور اسی وقت لڑکیاں ان سے بولیں؛

"آپ جائیے امی، ہم ان سے نپٹ لیں گے، آپ باہر جائیے۔" اور بڑی بی دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

"اب بتائیے، آپ شرافت سے مانیں گے یا نہیں۔" ایک لڑکی شوخی سے بولی۔

"پلیز، میری بات تو سنو۔ کاش، میں حقیقتاً وہی ہوتا جو آپ لوگ سمجھ رہے ہیں، میں تو ——— میں تو ایک بدنصیب انسان ہوں جو آپ لوگوں کے لئے بھی مصیبت بننے آ گیا ہے۔"

"ہمیں یہ مصیبت بخوشی قبول ہے، آپ ہمیں خود سے چھوٹا اداکار نہ سمجھیں، ہم آپ سے اچھی اداکاری کر سکتے ہیں۔" ایک لڑکی بولی۔

"تب پھر ایک بات سن لیں،" میں نے زچ ہو کر کہا۔ "اگر بعد میں آپ کو اپنی غلط فہمی کا احساس ہو تو مجھے مجرم نہ گردانیے میں تو دیانتداری سے سب کچھ بتائے دے رہا ہوں۔"

"ایسے یہ ایسے نہیں مانیں گے، اٹھا کے چلو۔" ایک لڑکی نے کہا اور سب مجھ پر جھپٹ پڑیں۔

"چل رہا ہوں، میں چل رہا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا، ورنہ درحقیقت وہ مجھے اٹھانے کے لئے تیار تھیں۔ لڑکیاں ہنستی قہقہے لگاتی مجھے ایک طرف لے چلیں، میں اپنی بدنصیبی پر دل ہی دل میں رو رہا تھا۔ کاش درحقیقت میں اسی ماحول کا ایک فرد ہوتا کیسی خوبصورت زندگی ہوتی۔ لیکن میری نحوست ان لوگوں کو بھی لپیٹ میں لے لے گی۔ لڑکیاں مجھے لئے ہوئے ایک کمرے کے دروازے میں پہنچ گئیں اور پھر انہوں نے دروازہ کھول کر مجھے اس طرح اندر دھکیل دیا جیسے شب عروسی میں دولہا کو پہلی بار دلہن کے کمرے میں بھیجا جاتا ہے۔ ان شریر لڑکیوں نے دروازہ بھی باہر سے بند کر دیا تھا۔

میں نے گھبرائی ہوئی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے کا مالک انتہائی نفیس ذوق کا مالک تھا۔ اعلیٰ درجے کا قالین بچھا ہوا تھا۔ دروازے، کھڑکیوں پر دیواروں کے رنگ کی خاصیت سے پردے پڑے ہوئے، ایک جانب ایک مسہری تھی جس پر دو تکیے موجود تھے۔ مسہری کی بائیں جانب چنبیلی اور چمپا کے پھولوں سے سجا ہوا ایک گلدستہ موجود تھا جس سے اٹھنے والی بھینی بھینی خوشبو نے پورے کمرے کو معطر کر رکھا تھا۔ اور ——— کمرے کے انتہائی سرے پر بنی ہوئی کھڑکی کے سامنے ایک نسوانی پیکر موجود تھا اس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ گہرے نیلے رنگ کی ساٹن کے غرارے اور سفید قمیص میں ملبوس نسوانی پیکر انتہائی متناسب الاعضا تھا اس کے سیاہ بال چوٹی کی شکل میں کمر سے نیچے تک لٹکے ہوئے تھے۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا لیکن نسوانی پیکر میری طرف نہیں مڑا۔

"سنیے۔" میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا اور نسوانی جسم میں ہلکی سی تھرتھراہٹ ہوئی اور پھر آنسوؤں سے لبریز چہرہ میرے سامنے آ گیا۔ اف، وہ حسین کتابی چہرہ کیسا گداز لئے ہوئے تھا۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ بھی براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی اور ان آنکھوں نے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔

"سب لوگ ——— سب لوگ میری طرف سے غلط فہم

میں مبتلا ہیں ۔ میں یوسف نہیں ہوں ۔ میرا نام شارق ہے براہ کرم
آپ ان سب کو یقین دلائیے۔" وہ بدستور مجھے دیکھتی رہی اور
پھر دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

" مجھے معاف کر دو یوسف ـــــ مجھے معاف کر دو،
بہت بڑی سزا دے دی ہے تم نے مجھے، اللہ اب اور سزا
نہ دو ـــــ مجھے معاف کر دو۔" وہ بلک بلک کر رو رہی
تھی اور میں تقدیر کے چکر پر ہنس رہا تھا۔ یہ آخری سہارا
بھی ٹوٹ گیا تھا، وہ مجھ سے لپٹی روتی رہی اور میرا دل
پگھلتا رہا۔ اب ان لوگوں کو سمجھانے کا اور کوئی طریقہ میرے
ذہن میں نہیں آرہا تھا۔ میرے ہاتھ بے اختیار اس کے سر پر
پہنچ گئے اور وہ پرسکون ہوتی گئی۔ پھر میں نے اسے مسہری
پر بٹھا دیا اور خود بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ وہ میری گود
میں سر رکھ کر لیٹ گئی اور میرے جذبات میں ہلچل پیدا ہو گئی۔
ایک جوان اور خوبصورت لڑکی مجھ سے اس قدر محبت کا اظہار
کر رہی تھی۔ حالات سے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ مجھے اپنا
شوہر سمجھ رہی ہے جو اس سے کسی بات پر ناراض ہو کر چلا گیا
تھا۔ گویا مجھے اس کے جسم اس کی ہر چیز پر تصرف کا اختیار
ہے لیکن میں اس معصوم لڑکی کو گناہ کی دلدل میں نہیں دھکیل
سکتا تھا۔ دفعتاً مجھے سشما کا خیال آیا، اس نے بھی تو مجھ سے
محبت جتائی تھی۔ وہ بھی تو اس لڑکی سے زیادہ خوب صورت
تھی۔ لیکن بعد میں وہ کیا نکلی ـــــ میں نے اپنی آنکھوں سے
دیکھا تھا، باسدیو کی لاش سشما کی لاش میں بدل گئی تھی۔ میں
نے اسے باسدیو سمجھ کر ہی مارا تھا۔ میرے دل میں وحشت بیدار
ہونے لگی۔ کہیں یہ لڑکی بھی تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوسرے لمحے میں
نے اس کے سر کو اپنی گود سے ہٹا دیا۔

" بڑا سکون مل رہا ہے یوسف ـــــ مجھے اسی طرح
رہنے دو ـــــ کب سے اس گود کے لئے ترس رہی تھی ـــــ"
وہ دوبارہ میری گود میں سر رکھتے ہوئے بولی اور اس بار میں اس کا
سر نہ ہٹا سکا لیکن میرے دل میں ابھی شبہ باقی تھا۔ دوسری
کوئی شکل باقی نہیں رہی تھی جس کے ذریعے میں ان لوگوں کو
اپنی حقیقت کا یقین دلا سکتا!" رفیعہ۔ میں نے اسے
مخاطب کیا کیونکہ اس کا یہی نام میرے سامنے لیا گیا تھا!

" ہوں۔" اس نے محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔!

" تم مسلمان ہو نا۔؟" میں نے کہا اور وہ سوالیہ نظروں
سے مجھے دیکھنے لگی "تم مسلمان ہو رفیعہ کلمہ پڑھو۔ براہ کرم کلمہ
پڑھو۔" میں نے نمرو رحمے کر کہا اور اس نے جلدی سے کلمہ پڑھ
لیا۔ تب میرے دل کو تسلی ہوئی کہ وہ باسدیو کا کوئی دوسرا
روپ نہیں ہے۔" شکریہ رفیعہ۔! اب جو کچھ میں پوچھوں مجھے
اس کا جواب دو۔ وعدہ کرو تم کوئی سوال نہیں کرو گی!"

" کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو یوسف!"

" رفیعہ خدا کے لئے۔ کیا تم میرا اتنا سا کہنا نہیں مان سکتیں!"

" تمہارا کہنا نہ مان کر تو گیارہ ماہ سزا بھگتتی رہی ہوں"

" باقی گفتگو بعد میں ہو گی۔ پہلے تم میرے سوالات
کا جواب دینے کا وعدہ کرو۔" اور اس نے وعدہ کر لیا۔!

" تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا۔؟ اس سوال پر اس
نے مجھے حیرت سے دیکھا۔

" ڈیڑھ سال۔"

" تمہارے والد کا کیا نام ہے؟

شرارت سے باز نہیں آؤ گے تم۔ اس نے محبوبانہ انداز
میں کہا۔ اور میں نے اسے پھر ٹوک دیا۔" کیوں مجھے بیوقوف
بنا رہے ہو۔ ابا میاں کا نام حکیم حسام الدین ہے!" شکریہ!
یوسف کا اپنا مکان کہاں ہے؟

" بنائے جاؤ تم مجھے احمق۔ میں اب تمہارے سوالات
کے جواب تمہاری مرضی کے مطابق دوں گی۔ اس نے مسکراتے
ہوئے کہا۔" ہاں تو یوسف صاحب کا کوئی مکان نہیں ہے۔ دنیا
بھر میں ان کا میرے علاوہ اور کوئی نہیں ہے وہ ابا میاں

کی درخواست پر ہمارے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ اور کچھ بتاؤں
وہ میری حماقتوں سے ناراض ہو کر گیارہ ماہ قبل یہاں سے
چلے گئے تھے اور آخر میری پشیمانی اور محبت انھیں دوبارہ
یہاں کھینچ لائی۔۔ وہ شوخ لہجے میں بولی

واہ رفیعہ۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ میں تمہارا شوہر
نہیں ہوں ممکن ہے اس کا ہمشکل ہوں۔ کیا تم مجھے شادی
کی یا میری اور کوئی تصویر دکھا سکتی ہو۔!"

"ضرور دکھا سکتی ہوں۔ اور یہ بھی بتا سکتی ہوں کہ
آپ بہت بڑے ڈرامہ نگار ہیں اور کوئی بھی مذاق انتہائی
سنجیدگی سے کرتے ہیں۔ اس نے کہا اور ایک طرف بڑھ
گئی پھر اس نے الماری سے ایک تصویر نکالی اور میرے
سامنے ڈال دی۔ میں نے بے صبری سے تصویر دیکھی اور
دنگ رہ گیا۔ اس تصویر میں رفیعہ میرے ساتھ کھڑی تھی۔
ہاں وہ میں ہی تھا اگر خود مجھے وہ تصویر دکھائی جاتی تو میں
حیران رہ جاتا کہ میں نے وہ تصویر کب کھنچوائی۔ ایسی
مشابہت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی ان غریبوں کی غلط فہمی
غلط نہیں تھی لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ کسی صورت اسے
ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ میں نے ایک گہری سانس
لے کر اسے واپس کر دی۔ اسی وقت باہر سے دروازہ کھلنے
کی آواز سنائی دی۔ اور پھر تینوں شریر لڑکیاں اندر گھس
آئیں۔ وہ تینوں رفیعہ کی چھوٹی بہنیں تھیں۔ اندر آ کر
وہ شرارت آمیز گفتگو کرتی رہیں۔ اور مجھے اور رفیعہ کو
چھیڑتی رہیں۔ پھر باہر سے ہمارا بلاوا آ گیا۔ ان لوگوں کو
سمجھانے کی میری تمام کوششیں ناکام ہو گئی تھیں چنانچہ
میں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ رات
کے کھانے کے بعد وہ لوگ مجھ سے ان گیارہ ماہ کی
مصروفیات کے بارے میں پوچھتے رہے لیکن انھوں نے
کہہ دیا تھا کہ اب وہ یہ بات سننے کے بالکل تیار نہیں
ہیں کہ میں یوسف نہیں ہوں! چنانچہ ان سے کوئی بات
میں نہیں کر سکا! اور پھر مجھے رفیعہ کے ساتھ اس کے کمرے
میں ہی سونے کے لئے آنا پڑا۔ رفیعہ لباس تبدیل کر کے
مسہری پر میرے پاس آ گئی اس کی آنکھوں سے نشہ چھلک
رہا تھا گیارہ ماہ کی دوری کے بعد وہ مجھ میں سما جانا چاہتی
تھی۔ میں بھی انسان تھا اور پھر خود اسے گناہ پر مائل نہیں
کر رہا تھا میں نے تو اپنی صفائی پیش کرنے کی لاکھ کوشش
کی تھی لیکن وہ مانے ہی نہیں۔ ایسی صورت میں اگر میں بھی
جذباتی ہو جاتا تو یہ میرا گناہ نہ ہوتا۔ لیکن یہ لوگ اتنے
سیدھے مخلص اور معصوم تھے کہ میرے ضمیر نے یہ دھوکہ
برداشت نہ کی۔ رفیعہ اپنے شوہر سے عشق کرتی تھی اگر اسے
زندگی کے کسی حصے میں اس کا نتیجہ مل گیا تو شاید وہ حساس
لڑکی خود کو اس گناہ پر کبھی معاف نہ کر سکے۔ چنانچہ جونہی
رفیعہ نے اپنی باہیں میری گردن میں ڈالیں میں نے قدرے
سختی سے کام لے کر اسے خود سے علیحدہ کر لیا اور وہ چونک
پڑی۔ چند لمحے حیران نظروں سے میری جانب دیکھتی رہی
پھر مسکراتے لہجے میں بولی۔ تو تم اب بھی اپنا مذاق جاری
رکھو گے یوسف! تم میرے جذبات کو اتنی بے رحمی سے پامال
کر دو گے!"

"سنو رفیعہ! تم جوان ہو، خوبصورت ہو۔ میں بھی انسان
ہوں فرشتہ نہیں ہوں۔ میرے دل میں تمہیں حاصل کرنے
کی خواہش ہے لیکن ایک انسان ہونے کی حیثیت سے
میں نہیں چاہتا کہ تمہاری یہ غلط فہمی زندگی کے کسی حصے میں
تمہیں خودکشی پر مجبور کر دے۔ تم اور تمہارے گھر کے سادہ
دل لوگ اس پر زندگی بھر افسوس کرتے رہیں۔ میں آخری
بار نہایت سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ میں یوسف نہیں
ہوں۔ میرا نام شارق برنی ہے۔ ایک بدنصیب انسان
ہوں اور مجھے خطرہ ہے کہ تم لوگ بھی میری بدنصیبی کی لپیٹ
میں نہ آ جاؤ۔!

رفیعہ ایک جھٹکے سے میرے پاس سے ہٹ گئی!

اب شاید اسے کچھ یقین آتا جا رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔!

"میں اپنا پورا خاندان اس نحوست کی نذر کر چکا ہوں۔ تمہاری دکھائی ہوئی تصویر دیکھنے کے بعد میں تمہیں قصوروار نہیں سمجھتا کیونکہ درحقیقت تمہارے شوہر میں اور مجھ میں حیرت انگیز مشابہت ہے" میں نے تم لوگوں کو اپنے بارے میں بتانے کی لاکھ کوشش کی میں نے ایک لمحے کے لئے تمہیں دھوکے میں نہیں رکھا لیکن تم میں سے کوئی میری بات سننے کے لئے تیار نہیں تھا! اسلئے مجھے یہاں سے چلا جانے دو میں تمہارے خاندان پر نحوست نہیں لانا چاہتا۔!

رفیعہ اب بھی دہشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اب بے اطمینانی کے آثار پیدا ہونے لگے تھے جنہیں میں نے بخوبی محسوس کر لیا اور جلدی سے بولا "مجھ سے خوف مت کھاؤ۔ ایک عورت ہونے کی حیثیت سے تم میرے لئے مقدس ہو۔ تم نے محسوس کیا ہوگا کہ ابھی تک میں نے تمہاری غلط فہمی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی ہے۔

میرے ان الفاظ سے رفیعہ کی دہشت قدرے کم ہوئی لیکن اس کے انداز سے غم زدہ اندوہ جھلکنے لگا! اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "پھر۔ تم کون ہو۔؟

"میں تمہیں اپنا نام بتا چکا ہوں۔ میرا نام شارق بزمی ہے افسانہ نگار تھا لیکن پھر میری زندگی پر نحوست کا سایہ پڑ گیا اور میں دربدر ہوگیا ماں باپ، بہن بھائی سب کو کھو بیٹھا اور اب زمانے کی ٹھوکروں میں ہوں۔ میری دعا ہے کہ تمہارا یوسف واپس آجائے اور مجھے مسرت ہے کہ ایک مرد ہونے کی حیثیت سے میں نے بھرم قائم رکھا۔ یوسف کے آجانے کے بعد تمہیں پچھتانا نہیں پڑے گا!

"میں تمہاری شکر گزار ہوں۔ اس نے ڈوبتی آواز میں کہا اور سسکیاں لینے لگی۔ پھر آنسو پونچھ کر بولی "اگر دنیا میں تمہارا کوئی نہیں ہے تو تم ہمارے پاس رہو۔ تمہیں یہاں سے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے!"

"نہیں نیک دل خاتون۔ آپ اس نحوست کا تصور نہیں کر سکتیں جو میرے اوپر مسلط ہے۔ میں آپ کی خوشیاں نہیں چھینوں گا!

یہاں کون خوش ہے! رفیعہ نے ہونٹ سکوڑ کر کہا اور پھر میں ان باتوں کو نہیں مانتی۔ انسان بذات خود کچھ نہیں ہے۔ نحوست انسان کی اپنی کوتاہیوں کی پیداوار ہوتی ہے۔ آپ یہیں رہیں گے۔ میں آپ کو آپ کی داستان سنانے کے لئے مجبور نہیں کروں گی لیکن مجھے تجسس ضرور رہے گا! میں گردن جھکا کے اس نیک دل لڑکی کی گفتگو سنتا رہا۔ کتنے عظیم تھے یہ لوگ۔ لیکن انہیں کیا معلوم کہ میرے اوپر کونسی نحوست ہے۔ میں باسدیو کے الفاظ سے خوفزدہ تھا اس نے مجھے وارننگ دی تھی کہ میری وجہ سے بہت سے خاندانوں پر مصیبت نازل ہوگی۔

میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ میرا یہاں رہنا کسی طرح درست نہیں ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تمہیں میری بات کا یقین آگیا۔ اب مجھے یہاں سے چلا جانے دو۔ یہی میرے اور تمہارے لئے مناسب ہے۔!

براہ کرم ضد مت کرو۔ کل صبح تم ابا جان سے ملاقات کر کے جانا۔ میں انہیں سب کچھ بتا دوں گی۔ ویسے کیا تم مجھے یہ بھی نہیں بتاؤ گے کہ اس طرف، میرا مطلب ہے اس کوٹھی میں کیسے آنکلے!

"آہ خاتون۔ یہ بتانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ممکن ہے میری بات پر تمہیں یقین بھی نہ آئے۔ اس لئے پر خاموشی ہی اختیار کرو۔!" بہرحال میں تمہارے کہنے سے صبح کا انتظار کروں گا صبح کو میں یہاں سے چلا جاؤں گا

میرے لیے کسی دوسری جگہ کا بندوبست کر دو۔!"
"تم اس کمرے میں آرام کرو۔ میں اپنی بہنوں کے کمرے میں سو جاؤں گی۔ رفیعہ نے کہا اور دوسرا لباس پہننے چلی گئی۔ پھر وہ خاموشی سے کمرے سے نکل گئی۔ میرا دل پھر غم کی تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ کیسا بدنصیب ہوں میں۔ خوشیاں مجھ سے کس قدر دُور چلی گئی ہیں۔ رات کا بقیہ حصہ میں نے کروٹیں بدلتے گزارا۔ مجھے منحوس باسدیو پر شدید غصہ آگیا تھا۔ ایک آدھ بار میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ کیوں نہ میں اس ذلیل کی بات مان کر اپنی مصیبتیں دور کر لوں۔ میں نے سنجیدگی سے سوچا کہ آخر وہ میرے ذریعہ ہی کیوں اس ویران مسجد میں داخل ہونا چاہتا ہے وہ ایسی زبردست قوتوں کا مالک ہے جو چاہے کر سکتا ہے لیکن وہ مسجد میں کیوں نہیں داخل ہو سکتا۔ تمام واقعات میری نظروں میں گھوم گئے مسجد کے دروازے میں شیر نظر آنا۔ شعلے بھڑک اٹھنا اور پھر ایک ناقابلِ عبور خندق بن جانا۔ گویا کچھ قوتیں اسے مسجد میں داخل ہونے سے روک رہی ہیں۔ وہ کونسی قوتیں ہیں یقیناً وہ قوتیں باسدیو سے زیادہ طاقتور ہیں لیکن پھر وہ قوتیں میری مدد کیوں نہیں کرتیں ایک بے گناہ انسان ان کے اور باسدیو کے
جھگڑے میں پھنس کر برباد ہو رہا ہے۔ اگر وہ قوتیں مجھے نہیں بچا سکتیں تو کیوں نہ میں باسدیو کے لئے کام کروں۔ یہ نیا خیال تھا جو میرے ذہن میں آیا تھا۔ میں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ میری ضد بیکار تھی۔ کوئی اجنبی قوت مجھے باسدیو سے نفرت پر مجبور کر رہی تھی۔ ورنہ جو زندگی مجھے ملی تھی اس سے باسدیو کی اطاعت۔

لیکن میں ابھی یہیں تک سوچنے پایا تھا کہ اچانک جیسے میرے ذہن پر تالا لگ گیا۔ میرا دماغ تاریک ہو گیا اور پھر صبح تک میں سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہا۔ میں اسے نیند کی کیفیت بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ بس ایک عجیب عالم تھا۔ اور اس عالم سے نہ جانے کب میں نکلتا کہ دروازے پر ہونے والی دھڑ دھڑاہٹ نے مجھے اس پر اسرار نیند سے بیدار کر لیا۔ دروازہ بہت زور زور سے بجایا جا رہا تھا! میں جلدی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے پر حکیم صاحب اور ان کا نوجوان لڑکا کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر بدحواسی چھائی ہوئی تھی۔ نوجوان کے ہاتھ میں ایک تصویر تھی۔ حکیم صاحب نے وہ تصویر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ تمہاری تصویر ہے یوسف میاں۔! میں نے تصویر دیکھی اور کہا۔

"جی ہاں۔ یہ میری ہی تصویر ہے۔

"مگر وہ تو تمہارا نام شارق لے رہے ہیں حکیم صاحب گھبرائے ہوئے لہجے میں بولے

"کون! میں نے بدحواسی سے پوچھا

"پولیس والے۔ انھوں نے چاروں طرف سے کوٹھی گھیر لی ہے۔ انسپکٹر اور کچھ دوسرے پولیس والے ڈرائنگ روم میں تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ ذرا رفیعہ کو جگا دو۔ حکیم صاحب نے کہا۔ میں سکتے میں رہ گیا تھا میرے کانوں میں باسدیو کے الفاظ گونج رہے تھے۔ تمہاری وجہ سے کچھ دوسرے خاندان بھی مصیبت کا شکار ہوں گے! تو ان لوگوں پر بھی مصیبت نازل ہو گئی۔

"رفیعہ، رفیعہ ـــ" حکیم صاحب کمرے کی طرف منہ کرکے رفیعہ کو آواز دینے لگے۔ اور رفیعہ دوسرے کمرے سے نکل آئی۔

"کیا بات ہے ابا جان؟" اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اور حکیم صاحب چونک کر اس کمرے کی طرف دیکھنے لگے جدھر سے رفیعہ کی آواز سنائی دی تھی۔ بیٹی کو دوسرے کمرے سے نکلتے دیکھ کر ان کے چہرے پر قدرے اطمینان کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ رفیعہ کی آنکھیں سرخ اور چہرہ بھرا بھرا یا ہوا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ رات بھر نہیں سو سکی ہے۔

"پولیس آئی ہے اور ـــ اور ان کا نام شارق لے رہی ہے، کیا ـــ کیا یہ یوسف نہیں ہے؟"

"پولیس آئی ہے" رفیعہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔ اس کا رنگ بھی فق ہو گیا تھا۔ اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں اب ہوش میں آ گیا تھا چنانچہ ان دونوں کو اسی طرح چھوڑ کر میں ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ حکیم صاحب کے کہنے کے مطابق ڈرائنگ روم میں ایک انسپکٹر اور دوسرے لوگ موجود تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انسپکٹر کھڑا ہو گیا اس کے چہرے پر طنز کے آثار تھے۔

"ہوں ـــ تو تم یہاں چھپے ہوئے ہو" اس نے کہا اور سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ سپاہیوں نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ اتنی دیر میں حکیم صاحب اور گھر کے دوسرے لوگ بھی ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ خواتین باہر کھڑی ہو گئی تھیں۔

"ہمیں افسوس ہے حکیم صاحب، آپ ایک معزز انسان ہیں لیکن ایک خطرناک مجرم آپ کے گھر سے برآمد ہوا ہے اس لئے ہم آپ کو بھی پولیس اسٹیشن لے جانے پر مجبور ہیں۔ میں ذاتی طور پر صرف اتنی رعایت کر سکتا ہوں کہ آپ کو ہتھکڑیاں لگا کر نہ لے جاؤں۔" انسپکٹر نے کہا اور حکیم صاحب کچھ نہ بول سکے۔

"مگر یوسف میاں کا قصور کیا ہے حکیم صاحب؟" حکیم صاحب کی بیگم لرزتے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"اس کا نام یوسف نہیں شارق ہے محترمہ، اس نے ایک رقاصہ کو قتل کیا ہے اور جیل توڑ کر فرار ہوا ہے۔ جیل سے فرار ہونے کی کوشش میں اس نے تین پولیس والوں کو زخمی کیا جن میں سے ایک چل بسا، اس طرح یہ دوہرے قتل کا مجرم ہے۔"

انسپکٹر نے جواب دیا اور یہ جواب سن کر بیگم صاحبہ دھم سے نیچے گر پڑیں۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھیں۔ بہرحال دو پولیس والے حکیم صاحب کے بازو پکڑ کر انہیں باہر لے چلے۔ باقی مجھے باہر لے آئے جہاں پولیس جیپ کھڑی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم حوالات میں تھے۔ مجھے اپنی گرفتاری پر ذرہ برابر افسوس نہیں تھا لیکن غریب حکیم صاحب تو بے گناہ تھے۔ وہ صرف میری نحوست کا شکار تھے۔ میں ان کے لئے کیا کروں۔ حکیم صاحب سکتے کی کیفیت میں تھے۔ وہ حوالات کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اور دوسرے قیدیوں نے انہیں مخاطب کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ حکیم صاحب کی اس حالت پر میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا لیکن میں مجبور تھا۔ اب تو بد نصیبی کو گالیاں اور کوسنے دیتے دیتے بھی دل اکتا گیا تھا۔ کوئی فائدہ نہیں تھا۔

شام تک حکیم صاحب کی ضمانت ہو گئی اور وہ چلے گئے۔ مجھے البتہ دوسرے روز پھر جیل بھیج دیا گیا۔ اس بار میرے اوپر خطرناک قیدی کی چھاپ لگی ہوئی تھی اور جیل میں میرے ہتھکڑیوں کے علاوہ بیڑیاں بھی ڈال دی گئی تھیں۔

حکیم صاحب کی ضمانت ہونے سے میں قدرے مطمئن ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح بری ہو جائیں گے۔ رہی میری بات تو میرا کیا ہے میرے لئے قید اور آزادی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ مجھے اس دوہرے قتل کے الزام پر کوئی تردد نہیں تھا۔ کوئی تو صورت ایسی ہو کہ میں موت کو گلے لگا سکوں۔ چوتھے روز عدالت میں میری پیشی ہوئی۔ حکیم صاحب اور ان کے اہل خاندان بھی آئے تھے۔ بے چارے حکیم صاحب کو

کٹہرے میں کھڑے دیکھ کر مجھے بہت دُکھ ہوا۔ رفیعہ اور حکیم صاحب کی دوسری لڑکیاں بھی تھیں، سب خوف بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ بہرحال میرا بیان لیا گیا اور سب سے پہلے حکیم صاحب سے میری شناسائی یا رشتے کے بارے میں سوال کیا گیا۔

"میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" میں نے صاف آواز میں کہا۔ "جیل سے بھاگنے کے بعد میں ان کے ہاں پہنچا، میں نے انہیں اپنا نام یوسف بتایا اور ایک فرضی کہانی سنا کر ان لوگوں کو موم کر لیا۔ انہوں نے ترس کھا کر مجھے اپنے ہاں پناہ دے دی۔ میرا ارادہ تھا کہ موقعہ ملتے ہی ان کے یہاں سے قیمتی اسباب لے کر فرار ہو جاؤں اس سلسلے میں میں ان کے قیمتی سامان کا کھوج لگا رہا تھا۔"

میں نے صاف محسوس کیا کہ میرے اس بیان سے حکیم صاحب اور ان کے اہل خاندان دنگ رہ گئے تھے اس کے علاوہ حکیم صاحب کی پوزیشن بالکل صاف ہو گئی تھی۔ چنانچہ مجسٹریٹ کے حکم سے حکیم صاحب کو باعزت بری کر دیا گیا اور اس کے بعد آئندہ کے لئے تاریخ پڑ گئی۔ دوسرے دن جیل میں ایک سپاہی نے بتایا کہ کچھ لوگ مجھ سے ملاقات کے لئے آئے ہیں اور میں حیران رہ گیا۔ پوری دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے مجھ سے کون ملنے آسکتا تھا میرا خیال حکیم صاحب کی طرف گیا۔ ممکن ہے وہ لوگ میرے بیان پر میرا شکریہ ادا کرنے آئے ہوں۔

اور میرا خیال درست ہی نکلا۔ حکیم صاحب کا پورا خاندان مجھ سے ملنے آیا تھا۔ میں نے انہیں دیکھ کر گردن جھکا لی۔

"شارق بیٹے!" حکیم صاحب رندھے ہوئے گلے سے بولے۔

"مجھے رفیعہ کی زبانی تمہاری عظمت کے بارے میں معلوم ہوا اور اس کے بعد تم نے عدالت میں میرے بارے میں جو بیان دیا اس سے تمہاری شرافت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مجھے بتاؤ میرے بیٹے میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

"میرے لئے۔" میں نے جذبات سے پھٹتے ہوئے سینے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "صرف دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میری مشکل آسان فرمائے۔ میں موت کا خواہش مند ہوں، صرف موت ہی میری مصیبت کا خاتمہ کر سکتی ہے۔" اور میرے ان الفاظ پر رفیعہ سسک پڑی، دوسری لڑکیوں کی آنکھیں بھی پُرنم تھیں۔

"مایوس نہ ہو بیٹے، مایوسی کفر ہے، بدقسمتی سے ہماری غلط فہمی کی وجہ سے ہم تم سے تمہارے بارے میں کچھ نہیں معلوم کر سکے۔ بہرحال مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ کیا درحقیقت تم نے کسی رقاصہ کو قتل کیا ہے اور کیا تم جیل سے فرار ہوئے تھے؟"

"میں نے یہ دونوں کام کئے ہیں، لیکن ——— عالم ہوش میں نہیں۔ ایک منحوس قوت میرے اوپر مسلط ہے، مگر اس پر کون یقین کر سکتا ہے اور میں یقین کرانا بھی نہیں چاہتا۔ اگر میں ایک الزام سے بری ہو جاؤں تو دوسرے سینکڑوں الزامات میرے اوپر عائد ہوتے رہیں گے۔ میرے لئے صرف موت کی دعا کریں محترم۔" باوجود ضبط کے میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اور حکیم صاحب بھی رو پڑے۔

"میں تمہارے لئے اس شہر کا سب سے بڑا وکیل کروں گا، تم فکر مت کرو، میں تمہیں نہیں مرنے دوں گا۔"

"خدا کے واسطے، خدا کے واسطے، میری درخواست ہے، آپ کو خدا کی قسم میرے لئے کچھ نہ کریں، ورنہ ——— ورنہ آپ بھی اس شیطانی قوت کے عتاب کے شکار ہو جائیں گے۔ آپ نہیں جانتے، آپ کچھ بھی نہیں جانتے۔" میں نے لرز کر کہا، لیکن حکیم صاحب پھر بھی مجھے تسلیاں دیتے رہے اور ملاقات کا وقت ختم ہو گیا اور وہ چلے گئے۔

اور میں اس تاریک کوٹھڑی میں موت کا انتظار کرنے لگا۔ دوسری پیشی پر حکیم صاحب نے حسب وعدہ میرے لئے ایک قابل وکیل کو کیا اور وکیل نے پیشی سے ایک دن قبل مجھ سے ملاقات کی۔ اس نے مجھ سے معلومات حاصل کیں لیکن میں نے اس سے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ البتہ عدالت میں وہ پھر

میرے پاس آیا۔
"کیونکہ آپ زندگی کے گاہک ہو، مجھے تفصیل بتاؤ
تاکہ میں۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"دنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں بچا سکتی وکیل صاحب —
آپ بلا وجہ زحمت کر رہے ہیں، براہ کرم اپنا وقت ضائع نہ
کریں۔" میں نے خشک لہجے میں کہا اور وکیل نے حکیم صاحب
کو میرے بارے میں بتایا جو خود بھی کمرۂ عدالت کے باہر تھے۔
حکیم صاحب نے خود مجھ سے گفتگو کی لیکن میں نے ان سے
بھی وہی الفاظ کہے۔ بہر حال وکیل صاحب اور حکیم صاحب
میرے بیانات تک ہار گئے اور میں نے اپنے بیان میں صاف
صاف کہہ دیا کہ میں نے جان بوجھ کر دونوں قتل کئے ہیں اور
پوری پوری سزا کا مستحق ہوں۔ وکیل صاحب اور حکیم صاحب
کی گردن لٹک گئی۔

میرے مقدمے کی پھر تاریخ پڑ گئی اور میں دوبارہ جیل
آگیا۔ میری منحوس زندگی کے شب و روز اسی طرح گزر رہے تھے
کہ ایک روز میری زندگی پھر ایک شدید طوفان سے دوچار
ہوگئی۔ میرا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ اور ذہن و دل میں
ہل چل مچ گئی۔ اس روز مجھے تھوڑی دیر کے لئے جیل کی کوٹھڑی
سے باہر نکالا گیا تھا تاکہ چہل قدمی کر لوں۔ میرے ہاتھ بدستور
پشت پر بندھے ہوئے تھے لیکن بیڑیاں کھول دی گئی
تھیں۔ گو میرا جرم بہت شدید تھا۔ جیل کے حکام مجھ سے نفرت
کرتے تھے، کیونکہ ان کی دانست میں میں نے جیل کے ایک
محافظ کو قتل اور دو کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ لیکن خود جیل کے
اندر میرا رویہ ایسا تھا کہ انہیں کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ اس
لئے نفرت کے باوجود مجھے بھی دوسرے قیدیوں کی سی مراعات
حاصل تھیں۔ میں چہل قدمی کرتا ہوا دوسرے بیرک کی طرف
جا نکلا اور میں نے دیکھا کہ دو سپاہی ایک نئے قیدی کو کوٹھڑی
کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ایسے مناظر جیل کے لئے نئے نہیں
ہوتے لیکن نہ جانے میرا دل کیوں دھڑک اٹھا۔ میں نے اس نئے
قیدی کو دیکھنے کی کوشش کی اور اسے دیکھ بھی لیا۔

لیکن اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں تاریکی پھیل گئی۔ مجھے بڑے
زور کا چکر آگیا اور میں زمین پر بیٹھ گیا۔ آہ، میرے خدا — وہ
عارف تھا۔ میرا چھوٹا بھائی۔ جو مجھ سے ناراض ہو کر گھر سے بھاگ
آیا تھا۔ جو غلط صحبت میں پڑ کر بگڑ گیا تھا۔ اور آخر اس کی صحبت
رنگ لائی اور وہ جیل تک پہنچ گیا۔ میں نے جب بھی ٹھنڈے دل
سے اپنے خاندان کی تباہی کے بارے میں سوچا تو اس میں صرف میرا
ہی ہاتھ کارفرما نظر آیا۔ باسدیو نے میری وجہ سے اس پورے
خاندان کو برباد کر دیا تھا۔ اگر ابتدا نہ ہوتی تو ہم تارا گڑھ میں
اپنے خوبصورت مکان میں ہوتے۔ میں کہانیاں لکھ رہا ہوتا،
عارف پڑھ رہا ہوتا اور شاہدہ کی شادی کسی عمدہ جگہ ہو گئی ہوتی
جو کچھ ہوا میری وجہ سے ہوا۔ میرا دل چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر
رو پڑوں لیکن میں نے بمشکل خود کو سنبھالا۔ یہاں بیٹھ کر رونا
بھی حماقت تھی۔ دوسرے لوگ یا تو بزدل سمجھتے یا پاگل۔

تھوڑی دیر کے بعد میں اپنی کوٹھڑی میں آگیا۔ لیکن میرا
دل عارف کے لئے تڑپ رہا تھا۔ عارف میرا بھائی وہ جیل میں
کیوں آیا تھا، اسے یہاں نہیں آنا چاہیئے۔

لیکن میرے سوچنے سے کیا ہو سکتا تھا۔ اس رات میں بری
طرح تڑپتا رہا۔ ایک لمحہ نیند نہیں آئی تھی۔ دوسرے دن میں نے
مختلف ذرائع سے عارف کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع
کر دیں۔ اور شام تک مجھے عارف کی کہانی معلوم ہو گئی۔ عارف
ایک جیب کترے کی حیثیت سے پکڑا گیا تھا۔ لیکن اس کا جرم
صرف جیب تراشی نہیں تھا۔ بلکہ جیب تراشی کے دوران جب
کچھ لوگوں نے اسے پکڑ لیا تو اس نے اپنی جان بچانے کے لئے ایک
شخص کے چاقو گھونپ دیا جس سے وہ ہلاک ہو گیا۔ اور اب عارف
پر دوہرا الزام تھا یعنی جیب تراشی اور قتل —— اور اس جرم
میں اسے پھانسی تک ہو سکتی تھی۔

عارف کو پھانسی ہو جائے گی، میرے ذہن میں بم پھٹ پڑا۔
یہ ناممکن ہے، مجھے کچھ بھی ہو جائے، لیکن عارف بے گناہ ہے۔
اسے پھانسی نہیں ہونی چاہیئے۔ مَیں تو زندگی سے بیزار تھا لیکن
عارف نے ابھی کیا دیکھا ہے۔ نہیں۔ مَیں اپنے بھائی کو پھانسی
نہیں ہونے دوں گا۔ یہ ناممکن ہے کہ میری زندگی میں اسے
پھانسی ہو جائے لیکن میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں، مجھے
کیا کرنا چاہیئے۔ میں سر جھکا کر سوچنے لگا اور اچانک میرے
اندر سے ایک نیا انسان ابھرنے لگا۔ ایک باغی انسان۔
جو بے حد نڈر، بے حد چالاک اور سفاک تھا۔ میں اس نئے
انسان کو دیکھ کر خود بھی حیران تھا لیکن آہستہ آہستہ میرا
اپنا وجود تحلیل ہو گیا اور وہ نیا انسان پوری طرح بیدار
ہو گیا۔ "یہ دنیا ظالموں کی جنت ہے، مظلوم کو ہر جگہ ٹھکرایا
جاتا ہے پھر کیوں نہ ظالم بنا جائے، مظلوم بننے کی کیا
ضرورت ہے، مظلوم کی کوئی آواز نہیں ہوتی، وہ صرف پسنے
کے لئے پیدا ہوتا ہے۔"

اور اس نئے انسان نے جو ظالم سفاک تھا میرے اوپر
پوری طرح قابو پا لیا۔ میرے سوچنے کا انداز بدل گیا۔ میں عارف
کو ضرور بچا لوں گا۔ مجھے اعتماد ہو گیا۔ اور پھر مَیں رات ہونے
کا انتظار کرنے لگا۔

رات ہو گئی۔ جیل کی دنیا خاموش ہو گئی۔ نہ جانے کتنے
جاگ رہے تھے، رو رہے تھے، کیا کر رہے تھے۔ میں کھڑا ہو گیا
جیل کی کوٹھری تاریک تھی لیکن باہر روشنی تھی۔ رات کی
ڈیوٹی کے دو محافظ ہماری بیرک میں ٹہل رہے تھے پھر ایک
محافظ کے قدموں کی آواز مجھے اپنی کوٹھڑی کی طرف آتی محسوس
ہوئی اور میں اپنے ڈرامے کے لئے تیار ہو گیا۔ میں نے دانتوں
سے اپنی کلائی میں کاٹ لیا اور تھوڑا سا خون نکل آیا، پھر
میں کوٹھڑی کے سلاخوں والے دروازے کے قریب ہی زمین
پر لیٹ گیا اور میرے حلق سے اذیت ناک کراہیں نکلنے لگیں۔
لیکن میں نے اس کا خیال رکھا تھا کہ شور زیادہ نہ ہونے پائے۔
ورنہ دوسرے قیدی بھی جاگ اٹھتے اور میرا کام مشکل ہو جاتا۔
میری کوشش بار آور رہی اور ڈیوٹی گارڈ میری طرف متوجہ
ہو گیا۔ اس نے ایک بڑی ٹارچ کی روشنی میرے اوپر ڈالی اور
جلدی سے دروازے کے قریب پہنچ گیا۔

"کیا بات ہے، تمہیں کیا تکلیف ہے؟" اس نے
ہمدردی سے پوچھا۔

"سانپ، میرے سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ سانپ،
ادھر —— بھاگ گیا ہے۔" میں نے ڈوبتے لہجے میں کہا اور
اپنی کلائی سامنے کر دی۔ اس نے جلدی سے چابی نکال کر
دروازہ کھولا اور مجھے باہر لے جانے کے لئے سنبھالا۔ شاید وہ مجھے
جیل کے ہسپتال لے جانا چاہتا تھا لیکن اس غریب کو ہمدردی
کی قیمت مہنگی پڑی۔ میں نے اس کی گردن پکڑ لی اور اس وقت
تک دباتا رہا جب تک اس کا دم نہ نکل گیا۔ نہ جانے کہاں
سے میرے ہاتھوں میں وہ عفریتی قوت آ گئی تھی۔

سپاہی کو قتل کر کے میں نے اس کی رائفل سنبھالی اور
کارتوسوں کی پیٹی سے کچھ کارتوس نکال کر جیب میں ٹھونسے
اور باہر نکل آیا۔ پھر میں چھپتا چھپاتا آگے بڑھا۔ دوسرے
محافظ کے قدموں کی چاپ زیادہ دور نہیں تھی۔ میں راہداری
کے موڑ پر پہنچ گیا جس سے مڑتے ہی وہ کوٹھڑی تھی جس میں
عارف قید تھا۔ میں نے ذرا سی گردن نکال کر دوسری طرف
دیکھا۔ سپاہی مجھ سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ اس کا
رخ دوسری طرف تھا۔ میں نے رائفل کی سنگین سیدھی کی اور
پوری قوت سے اس کی پشت میں گھسیڑ دی۔ اس کے ساتھ
ہی میں نے رائفل چھوڑ دی اور لپک کر سپاہی کا منہ بھینچ
لیا۔ دوسرا بے گناہ بھی میرے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ لیکن اب
مجھے کسی بات کا افسوس نہیں تھا۔ میں ظالم بن گیا تھا۔ میں نے
اس مردہ سپاہی کی کمر ٹٹولی اور چابیوں کا گچھا نکال لیا۔ اور

پھر میرے ہاتھ پھرتی سے وہ چابی تلاش کرنے لگے جو عارف کی
کوٹھڑی کا دروازہ کھولتی۔

عارف کی کوٹھڑی کے تمام قیدی شاید سو رہے تھے، کیونکہ آہٹ سن کر بھی کسی نے کوئی آواز نہیں نکالی۔ کئی چابیوں سے کوشش کرنے کے بعد آخر ایک چابی سے تالا کھل گیا اور میں اندر داخل ہوگیا۔ میں نے سپاہی کی ٹارچ لے لی تھی اور پھر اندر گھس کر میں نے ٹارچ جلائی۔ عارف ایک کمبل پر لیٹا سو رہا تھا۔ میں جھکا اور آہستہ سے اسے جھنجھوڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے کان کے قریب سرگوشی کی۔

"عارف ـــــ عارف جاگ جاؤ ـــــ یہ میں ہوں ـــــ تمہارا بھائی شارق۔" اور عارف جاگ گیا۔ وہ چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ "اٹھو۔ وقت نہیں ہے، پوری طرح ہوشیار ہو جاؤ۔" میں نے کہا اور عارف جلدی سے اٹھ گیا۔ میں نے اس کا بازو پکڑا اور باہر نکل آیا۔ عارف نے مُردہ سپاہی کو دیکھا اور اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اس نے نہایت صفائی سے اس کے جسم میں گھسی ہوئی رائفل کھینچ لی اور میں نے دوسری رائفل سنبھال لی۔ عارف نے بھی بالکل میرے انداز میں کارتوس حاصل کئے۔ اور اس کے بعد ہم جیل کے دوسرے حصے کی طرف چل پڑے۔ میں جیل کے چپے چپے سے واقف تھا، چنانچہ میں عارف کو ایک ایسے حصے میں لے آیا جہاں درخت لگے ہوئے تھے اور یہ درخت جیل کی چار دیواری کے ساتھ تھے۔ جیل کے سرچ ٹاور پر لائٹ گھوم رہی تھی اور سپاہی ہوشیار تھے۔ ہم دونوں درختوں پر چڑھ کر چار دیواری پر پہنچے اور اب نیچے اترنے کا مسئلہ تھا۔

"آپ نیچے کود سکتے ہیں بھائی جان۔" عارف نے سرگوشی کی۔

"ہاں، میں تو سب کچھ کر لوں گا مگر تم؟"

"میری فکر نہ کریں، مجھے ایسے کاموں کی پوری مہارت ہے۔" عارف نے کہا اور دونوں پنجے جوڑ کر کود گیا۔ ذرا سی بھی آواز نہیں تھی۔ میں نے بھی نیچے چھلانگ لگا دی۔ لیکن میں اناڑی تھا اور اگر عارف مجھے نہ سنبھالتا تو میرے کافی چوٹ لگتی۔ اب ہمیں آخری کام کرنا تھا یعنی ان روشنیوں سے بچ کر نکل جانا۔ پھر دونوں انتہائی مہارت سے روشنیوں کی زد سے بچتے ہوئے جیل سے دور نکل آئے اور پھر ہم نے پوری قوت سے دوڑنا شروع کر دیا۔ ہماری حالت بہت مخدوش تھی، کیونکہ ہمارے جسموں پر قیدیوں کے کپڑے تھے۔ اور ہاتھوں میں پولیس سے چھینی ہوئی رائفلیں۔ تاہم ہم دوڑتے رہے اور پھر کافی دور چل کر ہمیں روشنی نظر آئی۔ یہ کوئی رہائشی علاقہ تھا۔ ہم اس علاقے میں پہنچ گئے۔ ایک چھوٹا سا خوبصورت اور فیشن ایبل بازار تھا۔ دکانیں بند تھیں، نیون سائن جگمگا رہے تھے۔ بہت دور ایک چوکیدار نظر آ رہا تھا جو موٹا سا ڈنڈا ہاتھ میں لئے ایک الیکٹرک پول کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ میری نگاہ ایک نیون سائن پر رک گئی اور میں نے عارف کو مخاطب کیا۔

"عارف، وہ نیون سائن دیکھ رہے ہو۔" عارف نے میرے اشارے پر اس طرف دیکھا۔

"جی ہاں۔" اس نے جواب دیا۔

"ہمیں کپڑوں کی اشد ضرورت ہے۔"

"اوہ، میں ابھی مہیا کرتا ہوں۔" عارف نے کہا اور رائفل سنبھال کر چل پڑا۔

"سنو تو، تالا کیسے کھولو گے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ صرف چوکیدار پر نگاہ رکھیں، میں سب کچھ کر لوں گا۔" عارف نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ پھر میں ایک دکان کی آڑ میں چوکیدار پر نظریں جما کر کھڑا ہو گیا۔ اور عارف اس دکان کے قریب پہنچ گیا۔ صرف چند منٹ کے بعد میں

نے دکان کا شٹر کھلنے کی ہلکی سی آواز سنی اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔ عارف اپنے کام میں کافی ماہر ہو گیا ہے تالا کھولنے میں اسے ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگا۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد عارف واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت سوٹ کیس تھا۔ جسم پر قمیص اور پتلون، البتہ رائفل اس نے پہنی ہوئی تھی۔

"آئیے بھائی جان" وہ بولا اور ہم وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ کافی دور پہنچ کر اس نے کہا۔ "اب آپ لباس تبدیل کر لیں۔"

"سوٹ کیس میں کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرے اور آپ کے ناپ کے مزید کپڑے" میں نے اچھی خاصی رقم بھی لے لی ہے اندر ایک تجوری میں موجود تھی۔" عارف نے اطمینان سے جواب دیا۔ اور میں نے گردن ہلا دی اس وقت مجھے کوئی افسوس نہیں ہو رہا تھا، نہ جانے میری فطرت میں کونسی درندگی حلول کر گئی تھی۔ میں نے بھی لباس تبدیل کیا اور پھر عارف سے کہا۔

"اب ہم خطرے سے نکل آئے ہیں، یہ رائفلیں بے کار ہیں انہیں پھینک دو۔"

"ان کی تو اشد ضرورت تھی بھائی جان، لیکن آپ کا کہنا بھی درست ہے، میرا خیال ہے ہمیں یہاں سے سیدھے اسٹیشن چلنا چاہئے تاکہ اطلاع ہونے سے قبل نکل جائیں۔"

"ٹھیک رائے ہے۔" میں نے کہا اور ہم اسٹیشن کی طرف چل پڑے، عارف کی نظریں سڑک کے دونوں سمت کچھ تلاش کر رہی تھیں، پھر اسے تھوڑے فاصلے پر ایک ٹرک کھڑا نظر آیا جس کے قرب و جوار میں کوئی نہیں تھا۔

"آپ رکئے میں ابھی آیا۔" اس نے کہا اور ٹرک کی طرف دوڑ گیا۔ میں اس کی حرکت کے بارے میں کچھ نہیں سمجھ سکا تھا لیکن جب ٹرک اسٹارٹ ہو کر میرے قریب پہنچ گیا تب میں سمجھا اور پھر میں بھی عارف کے پاس بیٹھ گیا اور ٹرک اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ ابھی تک ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں کچھ کہنے سننے کا موقع نہیں ملا تھا۔ راستے میں بھی ہم دونوں خاموش رہے۔ اسٹیشن سے کافی فاصلے پر ہم نے ٹرک چھوڑ دیا اور نیچے اتر کر اسٹیشن کی طرف چل پڑے۔ سب سے پہلی ٹرین ہاپوڑ جا رہی تھی۔ ہم نے ہاپوڑ کے ٹکٹ خریدے اور کمپارٹمنٹ میں پہنچ گئے اور جب ٹرین چل پڑی تو ہم نے سکون کا سانس لیا۔ فی الحال ہم پولیس کی زد سے نکل آئے تھے۔

کمپارٹمنٹ تقریباً خالی تھا۔ اکا دکا مسافر تھے جو گہری نیند سو رہے تھے۔ آرام سے بیٹھنے کے بعد پہلی مرتبہ میں نے بھرپور نظروں سے عارف کو دیکھا۔ عارف کا چہرہ اب بھی معصوم تھا۔ لیکن آنکھوں میں ایک سفاک کیفیت پیدا ہو گئی تھی کشادہ پیشانی اس کی ذہانت کی نشاندہی کرتی تھی۔ اس کی کشادہ پیشانی دیکھ کر ہمارے چچا جان مرحوم کہتے تھے کہ عارف جو کام بھی کرے گا اس میں مہارت حاصل کرے گا۔ لیکن افسوس اس نے کونسے کام میں مہارت حاصل کی تھی۔

عارف گردن جھکائے بیٹھا تھا، تھوڑی دیر کے بعد اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "آپ جیل کیسے پہنچ گئے تھے بھائی جان — اور —" اس نے الفاظ ادھورے چھوڑ دیئے۔

میں کئی منٹ تک اسے دیکھتا رہا۔ میری زبان سے کوئی لفظ نہ نکلا تو اس نے بے قرار ہو کر پوچھا۔ "امی کیسی ہیں شاہدہ خیریت سے ہے؟" اس کے اضطراب پر میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ عارف کو مجھ سے ناراض ہو کر اور بدتمیزی کر کے نکل گیا تھا لیکن اب اس کی طرف سے میرے دل میں ذرا سی بھی کدورت نہیں تھی، کیونکہ میں تو ان تمام حالات کا محرک یاسر ہی کو سمجھتا تھا۔ چند لمحات میں نے خود پر کنٹرول کرنے میں صرف کئے پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"دنیا بالکل بدل گئی ہے عارف، امی جان اس دنیا میں نہیں ہیں، شاہدہ دیپ چند کے ساتھ بھاگ گئی اور اس کا کوئی پتہ نہیں۔"

"امی مر گئیں بشش شاہدہ،" عارف کے منہ سے لرزتی ہوئی

آواز نکلی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ میں پتھر کے بت کی طرح ساکت بیٹھا رہا۔ اس کے لئے تسلی کا ایک لفظ بھی میرے منہ سے نہیں نکلا۔ عارف کافی دیر تک خاموشی سے روتا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔

"مگر یہ سب کچھ کیسے ہوا بھائی جان؟"

"ہماری بدقسمتی سے عارف۔" میں نے کہا اور شروع سے آخر تک عارف کو تفصیل سنا دی۔ دیپ چند کے بارے میں سن کر عارف کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ پھر اس نے میرے بارے میں پوچھا کہ میں جیل کیسے پہنچ گیا۔ میں نے تھوڑی سی ضروری ردوبدل کے ساتھ اسے اپنی کہانی سنا دی۔ منحوس شیطان باسدیو کے بارے میں عارف کو کچھ نہیں بتایا تھا اس سے فائدہ بھی کیا۔ ویسے میرا دل باسدیو کے تصور سے لرز اٹھتا تھا۔ کافی دن سے باسدیو کی طرف سے کوئی شیطانی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ نہ جانے وہ کیا پروگرام بنا رہا تھا اور میں ہر لمحے اس کی طرف سے ہونے والے کسی نئے وار کا منتظر تھا۔

"میں بڑا بدقسمت ہوں بھائی جان۔ بڑا بے غیرت ہوں، ایک ذلیل انسان میری بہن کو لے گیا اور میں زندہ ہوں۔ آپ لاہور اتر جائیے بھائی جان، مجھے میری قسمت پر چھوڑ دیجئے۔ میں دیپ چند کو تلاش کروں گا، میری زندگی کا اب یہی مقصد ہے۔"

"تم مجھ سے اپنی جان چھڑانا چاہتے ہو عارف، ٹھیک ہے میں منع نہیں کروں گا۔ میرا اب اس دنیا میں کون ہے ۔۔۔ تمہاری وجہ سے زندگی کی تھوڑی سی خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ تم جیل سے نکل آئے ہو۔ اب آگے خدا کی مرضی۔"

"یہ بات نہیں ہے بھائی جان، بخدا میرا دل آپ کو چھوڑنے کے لئے نہیں چاہتا لیکن ۔۔۔ میں ۔۔۔ میں دیپ چند کو ۔۔۔"

"میں بھی اس کی تلاش میں تمہاری مدد کروں گا۔" میں نے کہا اور عارف تیار ہو گیا۔ رات کے آخری حصے میں ہم دونوں سو گئے اور پھر صبح نو بجے ہم لاہور اسٹیشن پر اتر گئے ہماری حیثیت خاصی اچھی تھی ایک تانگے میں بیٹھ کر ہم کسی ہوٹل کی تلاش میں نکل پڑے اور ایک گھنٹے کے بعد ہم ایک درمیانے درجے کے ہوٹل کے ایک اچھے خاصے کمرے میں مقیم تھے۔ ہم نے ہوٹل میں ناشتہ کیا اور آرام کرنے لیٹ گئے۔

دوپہر کو ایک بجے میری آنکھ کھلی تو عارف کمرے میں موجود نہیں تھا۔ میں نے غسل کیا اور کپڑے بدل کر عارف کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی لیکن میں عارف کے آجانے کے بعد کھانا کھانا چاہتا تھا۔ تین بجے تک عارف واپس نہ آیا تو میرے دل میں ہول اٹھنے لگا۔ میں سخت پریشان ہو کر کمرے سے نکل آیا۔ ہم لوگ جیل سے فرار ہو جانے والے خطرناک قیدی تھے۔ یقیناً ملک کے چپے چپے میں ہماری تلاش شروع ہو چکی ہو گی۔ ابھی میں اپنے کمرے سے زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ مجھے عارف نظر آیا۔ اس کے ہونٹوں پر مجھے دیکھ کر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کہاں چلے گئے تھے عارف؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"ویسے ہی ذرا گھومنے نکل گیا تھا بھائی جان۔ آپ نے کھانا کھایا؟"

"ابھی نہیں، بھلا کھانے میں دل لگتا۔ آؤ۔" میں نے کہا اور پھر ہم نے بیرے کو بلا کر کھانا منگوایا۔ عارف کسی بات پر مسکرا رہا تھا۔ "کیا بات ہے، مسکرا کیوں رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارے بارے میں ریڈیو سے اعلانات نشر ہو رہے ہیں پورے ملک کے لوگوں کو بار بار ہماری طرف سے ہوشیار کیا جا رہا ہے۔ ہمیں انتہائی خطرناک مجرم قرار دیا گیا ہے۔" عارف نے بتایا۔ اور نہ جانے کتنے عرصے کے بعد میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ ہم نے کھانا کھایا اور پھر کافی دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ پھر عارف نے مجھ سے پوچھا "ہماری دوسری منزل کونسی ہو گی بھائی جان۔ ہم ملک کے کونے کونے میں دیپ چند کو تلاش کریں گے یقیناً شاہدہ بھی اس کے ساتھ ہو گی پھر شاہدہ کو لیکر اس ملک سے نکل جائیں گے اور کسی دوسرے ملک میں جا کر نئی

زندگی کا آغاز کریں گے۔"
عارف کی بات پر میرے دل میں حسرتیں تڑپ اٹھیں، نئی زندگی کے آغاز کا تصور بہت حسین تھا۔ لیکن ـــ میری ایسی قسمت کہاں تھی۔ میرے اوپر سایہ فگن نحوست دوسروں کی زندگی کو تہہ و بالا کر سکتی تھی۔ انہیں سکھ نہیں دے سکتی تھی۔ میں نے عارف کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر ایسا ہو گیا تو میں خاموشی سے ان دونوں کی زندگی سے نکل جاؤں گا۔

ناگپور میں ہم تین دن تک رہے، پھر ہم نے بمبئی جانے کا پروگرام بنایا۔ بمبئی بہت بڑا شہر ہے ہم وہاں کے ماحول میں بڑی آسانی سے گم ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ہم بمبئی چل پڑے۔ راستے میں ہم حتی الامکان پولیس کی نگاہوں سے بچتے رہے۔ لیکن اس وقت ہم دونوں ہی خوفزدہ ہو گئے جب ہم نے ایک مسافر کے ہاتھوں میں دبے ہوئے اخبار میں اپنی تصویریں دیکھیں۔ گو یہ تصویریں واضح نہیں تھیں۔ ہمارے حلیے میں کافی فرق ہو گیا تھا لیکن دل کا چور کہاں جاتا۔ ہم نے وہ کمپارٹمنٹ بدل دیا اور دوسرے کمپارٹمنٹ میں چلے گئے۔ بہ صورت بمشکل سفر طے ہوا اور ہم بمبئی پہنچ گئے۔ درحقیقت بمبئی کی آغوش بہت کشادہ تھی وہاں کے لوگ ایک دوسرے سے سروکار نہ رکھتے تھے سب اپنے حال میں مگن تھے اس لئے کسی نے ہماری طرف کوئی توجہ نہیں کی اور وہ ایک خوبصورت سے ہوٹل میں مقیم ہو گئے۔

بمبئی عارف کے کام کے لئے بھی بہت موزوں تھی، چنانچہ عارف نے جیبیں بھر لیں اور اب ہم اعلیٰ سے اعلیٰ ہوٹل میں قیام کر سکتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ عارف یہ رقم کہاں سے مار رہا ہے لیکن میں اسے منع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہم دونوں عیش نہیں کر رہے تھے، بلکہ ایک مشن پر کام کر رہے تھے ہمیں ہر قیمت پر شاہدہ کو تلاش کرنا تھا۔ اور اس کی وجہ سے خود کو پولیس سے بھی روپوش رکھنا تھا۔ چنانچہ ہم نے اپنے حلیے بالکل بدل لئے، اب ہم کوئی رئیس زادے معلوم ہوتے۔ انتہائی اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں رہتے، عارف نے فرنچ کٹ داڑھی رکھ لی اور میں نے بھی گھنی مونچھیں رکھ لی تھیں جس سے ہماری شکل کافی بدل گئی تھی۔

ہمارا کام بمبئی کے کونے کونے کی تلاش تھا۔ آئندہ پروگرام ہم نے دہلی کا رکھا تھا۔ خیال تھا کہ پہلے تمام بڑے بڑے شہروں میں دیپ چند کو تلاش کیا جائے اس کے بعد چھوٹے شہروں کا انتخاب کیا جائے۔ ہم بھٹکتے رہے، ڈیڑھ ہفتے کے قریب ہو گیا تھا اور ہم نے بمبئی کا کونہ کونہ چھان مارا میں اور عارف الگ الگ بھی گھومتے تھے۔

پھر ایک شام مجھے اپنے ہوٹل آئے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ عارف اندر آیا۔ اس کا چہرہ جوش سے چمک رہا تھا اور آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ "کیا بات ہے؟" میں نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔ میرا خیال تھا کہ شائد پولیس کو ہمارا سراغ مل گیا لیکن عارف نے جو کچھ بتایا وہ مختلف تھا۔

"دیپ چند مل گیا ہے بھائی جان۔" اس نے کہا اور میں جوش سے کھڑا ہو گیا۔

"کہاں ہے، کیا اس کے ساتھ شاہدہ بھی تھی؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"یہ تو نہیں معلوم، میں نے صرف اسے دیکھا ہے، ایک مقامی فلم کمپنی کے ڈائرکٹر کے ساتھ تھا۔ پہلے وہ ڈائرکٹر کی کوٹھی میں گیا اور اس کے بعد وہاں سے اکیلا ایک مکان میں ـــ میں نے وہاں تک اس کا تعاقب کیا اور پھر پڑوسیوں سے معلوم کر لیا کہ دیپ چند یہیں رہتا ہے۔ میرا دل تو چاہ رہا تھا بھائی جان کہ وہیں دیپ چند سے نپٹ لوں، لیکن پھر سوچا کہ آپ کو اس نیک کام سے الگ کیوں رکھا جائے۔ اٹھئے اب انتظار کی تاب نہیں ہے۔"

میں بھی کھڑا ہو گیا اور ہم دونوں نیچے اتر کر ایک ٹیکسی

میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔ میرے دل میں ہل چل مچی ہوئی تھی۔ شاہدہ میری بہن تھی، محبت کرنے والی بہن، میں بھی اس پر جان چھڑکتا تھا۔ یہ دوسری بات تھی کہ حالات نے ہم سب کو ایک دوسرے کے لئے اجنبی بنا دیا تھا لیکن خون کی محبت کیسے ختم ہو سکتی تھی۔ اب اتنے عرصے کے بعد شاہدہ سے ملنے کے خیال نے میرے ذہن میں بے چینی پیدا کر دی تھی۔ شاہدہ کی محبت پہلے سے سوا ہو گئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اسے اس کی بھول پر خلوص دل سے معاف کر دوں گا۔ غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔ اور پھر یہ صرف اس کی غلطی نہیں تھی بلکہ منحوس باسد بو کا میرے خاندان سے انتقام تھا اس نے سب کے ذہن بدل ڈیئے تھے۔

باسد بو کے تصور نے میرے ذہن میں پھر لرزہ طاری کر دیا۔ اب وہ شیطان کونسی چال سوچ رہا ہو گا۔ اس کی طرف سے جان ہر وقت سولی پر چڑھی رہتی تھی۔ نہ جانے کون سے اقدام پر اس کی کونسی چال ہو اور یہ تصور بڑا پریشان کن تھا۔ تاہم میں نے دل میں خدا سے دعا کی کہ مجھے اس کے شر سے محفوظ رکھے اب تو میرا سب کچھ برباد ہو چکا تھا اگر سکون کے چند سانس مل جائیں تو کونسی بڑی بات ہو جائے گی۔ مجھے اپنی زندگی نہیں چاہیے تھی، لیکن میرے بہن اور بھائی جو اب میرے خاندان کے آخری فرد تھے وہ تو سلامت رہیں۔

ٹیکسی اس علاقے میں پہنچ گئی جہاں دیپ چند رہتا تھا اور عارف نے ڈرائیور کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ بل ادا کر کے ہم دونوں نیچے اترے اور دھڑکتے دل سے دیپ چند کے مکان کے دروازے پر پہنچ گئے۔ عارف نے دروازے پر دستک دی۔ اور اندر سے آواز آئی "کون ہے؟"

آواز دیپ چند کی تھی میں نے صاف پہچان لی۔ عارف نے کوئی جواب نہ دیا اور دوبارہ دستک دی۔

"ابے کون ہے؟" دیپ چند نے اس بار کرخت آواز میں کہا اور پھر ایک موٹی سی گالی دے کر شاید اٹھ گیا۔ چند منٹ کے بعد ہی دروازہ کھل گیا اور ہمیں اس کی شکل نظر آئی، لیکن وہ ہمیں نہیں پہچان سکا۔

"کیا بات ہے بابو جی؟" اس نے بغور ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہمیں تم سے کچھ بات کرنی ہے، کاروباری بات ہے۔" عارف نے کہا۔

"آجاؤ ——— اندر آجاؤ۔ مجھے بھی پیسے کی سخت ضرورت ہے۔" دیپ چند نے پیچھے ہٹ کر کہا۔ اس کے منہ سے شراب کی بدبو آ رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ پی رہا تھا۔ دیپ چند نے خود ہی دروازہ بند کر دیا اور ہمیں اندر چلنے کی ہدایت کی۔ میری نظریں پورے گھر میں شاہدہ کو تلاش کر رہی تھیں۔

اندر ایک کمرے میں کچھ پرانی میز اور کرسیاں پڑی تھیں۔ میز پر شراب کی بوتل رکھی ہوئی تھی اور ایک گلاس جس کے پیندے میں شراب موجود تھی۔

"بیٹھ جاؤ بابو جی۔" دیپ چند نے کہا۔

"کیا یہاں اس مکان میں اور کوئی نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔" دیپ چند بولا۔

"ہوں۔" میں نے گردن ہلائی۔ ویسے میرا دل بجھ گیا تھا۔ نہ جانے شاہدہ کو اس ذلیل نے کہاں رکھ چھوڑا ہے۔ میں نے خونی نظروں سے دیپ چند کی طرف دیکھا اور بولا۔ "تم نے مجھے نہیں پہچانا دیپ چند؟"

"ایں ——— میں ——— میں تو واقعی نہیں پہچانا، کیا ہماری پہلے سے ملاقات ہے؟" دیپ چند نے باری باری ہم دونوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

"ہاں بہت گہری ملاقات ہے، ہم بہت گہرے دوست تھے دیپ چند، غور سے دیکھو میں شارق ہوں جس کے اوپر تم نے بڑے بڑے احسانات کئے ہیں۔ جسے تم نے کام پر لگایا تھا اور جس کی بہن کو تم لے کر بھاگ آئے تھے، کیا بھول گئے؟"

دیپ چند آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار تھے اور پھر وہ بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ "ارے ہاں، تم تو شارق ہی ہو اور یہ۔۔۔ یہ عارف ہے، تم لوگوں کی تو جون ہی بدل گئی۔"

"شاہدہ کہاں ہے؟" میں نے اسے مزید بکواس کا موقع دیئے بغیر کہا۔

"شاہدہ۔۔۔ کون شاہدہ؟" اس نے چندھیاتے ہوئے کہا۔ اور عارف کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

"جسے تم لے آئے تھے۔"

"میں تو کسی کو نہیں لایا، تمہیں غلط فہمی۔۔۔" ابھی دیپ چند نے اتنا ہی کہا تھا کہ عارف کا طاقتور گھونسا اس کے منہ پر پڑا اور اس کے دونوں ہونٹ کٹ گئے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ پکڑ لیا اور پھر خون تھوکنے لگا۔ دیپے اسس کی آنکھیں بھی غصے سے سرخ ہو گئیں۔ خون تھوکتے ہوئے اس نے اچانک نیفے میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکال لیا اور پھر وہ اسے کھول ہی رہا تھا کہ میں اس پر ٹوٹ پڑا۔ نہ جانے میرے جسم میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ یوں بھی میں نے سوچا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دیپ چند مجھے قتل کر دے گا، یہ تو میری عین خواہش تھی لیکن نہ صرف یہ کہ چاقو میرے ہاتھ میں آ گیا بلکہ میرے گھونسے نے دیپ چند کو زمین چٹا دی اور وہ اوندھے منہ گرا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن عارف کے بوٹ کی ٹھوکر سے چت گر پڑا۔ عارف نے اس کے ہاتھ سے گرا ہوا چاقو اٹھا لیا اور خونخوار انداز میں اس کی طرف بڑھا۔

"ٹھہرو۔۔۔ ٹھہر جاؤ۔۔۔ میں نے ہار مان لی ہے۔"

دیپ چند دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"شاہدہ کہاں ہے؟" عارف اس کی آنکھوں کے سامنے چاقو لہراتا ہوا بولا۔

"وہ۔۔۔ وہ اب میرے پاس نہیں ہے، بھگوان کی سوگند اب وہ میرے پاس نہیں ہے۔"

"پھر کہاں ہے مردود؟"

"وہ تو یہاں سے بہت دور چلی گئی۔ میں نے۔۔۔ میں نے اسے ایک بردہ فروش کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔"

یہ سن کر ہم دونوں پر بجلی گر پڑی۔ آہ شاہدہ نہ جانے کہاں ماری ماری پھر رہی ہے، کیسی بدقسمت تھی وہ۔ لیکن عارف سنبھلا اس نے غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"دیپ چند جھوٹ مت بولو، ورنہ میں تیرے جسم کی ایک ایک بوٹی کر دوں گا۔"

"میں بھگوان کی سوگند کھا کے کہتا ہوں غلط نہیں کہہ رہا۔ ابھی دو مہینے پہلے میں نے اسے بمبئی میں ہی فروخت کیا تھا۔ بردہ فروش اسے اور اس کے ساتھ دوسری لڑکیوں کو لے کر مڈل ایسٹ کی طرف گئے ہیں۔"

"کیا تم اس بردہ فروش کو جانتے ہو دیپ چند؟" آخر میں نے سنبھل کر کہا۔

"ہاں، مشہور آدمی ہے اور ان علاقوں میں بہت بدنام ہے۔ وہ یہاں سے دبئی گیا ہو گا اور پھر وہاں سے آگے بڑھ جائے گا۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"بن فرقان۔"

میں نے عارف کی طرف دیکھا۔ عارف اس طرح کھڑا تھا جیسے اس کا سب کچھ لٹ گیا ہو۔ اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے سہارا دیا اور کہا۔ "زندگی ہے عارف، تو ہم شاہدہ کو تلاش کر لیں گے، مایوس مت ہو۔"

"میری بہن نہ جانے کہاں کہاں ماری ماری پھر رہی ہو گی بھائی جان۔" عارف سسک پڑا۔

"رو ؤ نہیں عارف، رونے سے کچھ نہ بنے گا۔ ہمیں ہمت

کام لینا ہے۔ ہم شاہدہ کو ضرور تلاش کر لیں گے۔" میں نے اسے دلاسہ دیا اور پھر انتہائی نرمی سے دیپ چند سے کہا۔

"ہم زمانے کے ستائے ہوئے ہیں دیپ چند، اگر تم شاہدہ کے بارے میں جھوٹ بول رہے ہو تو اب بھی سچ بتا دو ہم تمہیں اس کی بہترین قیمت دے سکتے ہیں یہ دیکھو۔" میں نے جیب سے نوٹوں کی موٹی گڈی نکال کر اس کے سامنے کر دی۔

"اوہ ــــ اس کا مطلب ہے کہ تمہارے دن پھر گئے ہیں مجھے کچھ نہیں چاہئے شارق، میں آج کل بہت پریشان ہوں ــــ ویسے میں بھگوان کی سوگند کھا کر تمہیں بتا چکا ہوں، میں نے دیکھا غلط نہیں کہا۔ تم بن فرقان کو اچھی قیمت دے کر شاہدہ کو واپس لے سکتے ہو۔"

"ہم تمہاری تمام پریشانیوں کا خاتمہ کر کے جائیں گے دیپ چند۔" میں نے کہا اور عارف کے ہاتھ سے چاقو لے لیا۔ دیپ چند کے ہونٹوں سے بہنے والا خون اب بند ہو چکا تھا لیکن اس کی ہمت پست ہو گئی تھی۔ وہ ہم دونوں سے مرعوب ہو گیا تھا۔ اس نے میری اس حرکت کو خوف کی نظروں سے دیکھا اور پھر گھگھیاتے ہوئے بولا۔

"مجھے شما کر دو شارق بابو، مجھ سے بڑی بھول ہوئی۔"

نہیں ــــ میں نے ــــ لیکن دوسرے لمحے میرے ہاتھ میں دبا ہوا چاقو اس کے شانے اور گردن کے درمیان پیوست ہو کر نکل آیا۔ دیپ چند کے حلق سے ایک دھار نکلی اور خون اچھلنے لگا۔ وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا لیکن عارف نے ٹانگ مار کر اسے گرا دیا۔ اور پھر میں نے دیپ چند کا منہ بھینچ لیا۔ میرا ہاتھ مشینی انداز میں کام کرنے لگا اور میں نے گن کر دیپ چند کے پورے جسم پر سو وار کئے میں نے اس کا پورا جسم گود کر رکھ دیا۔ اور پھر ہم دونوں عرصے سے دیپ چند کی پھڑکتی لاش دیکھتے رہے اور جب وہ سرد ہو گیا تو میں نے مسکرا کر عارف کی طرف دیکھا۔

"دل ٹھنڈا ہوا عارف؟" میں نے پوچھا۔

"شاہدہ مل جاتی جانی جان تو دوسری بات تھی۔" عارف نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"فکر مت کرو، ہم اسے بھی تلاش کر لیں گے۔ ہماری زندگی کا مقصد اور کیا ہے۔" میں نے کہا اور چاقو کے دستے سے انگلیوں کے نشانات صاف کر کے اپنے لباس کا جائزہ لینے لگا۔ کوٹ پر خون کے دھبے پڑ گئے تھے پتلون پر بھی کہیں کہیں تھے میں نے حتی الامکان اپنا لباس بچایا تھا ــ بہرحال کوٹ اتار کر میں نے ہاتھ پر ڈال لیا اور ہم پُر سکون اطمینان سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

کافی دیر تک ہم پیدل چلتے رہے اور پھر ایک ٹیکسی روک کر اس میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی والے کو ایک پارک کا پتہ بتا دیا گیا تھا۔ پارک میں پہنچ کر میں نے خون آلود کوٹ کے ٹکڑے ٹکڑے کئے اور اسے مختلف حصوں میں چھپا دیا پھر وہاں سے ہم اپنے ہوٹل آ گئے۔ یہاں پہنچ کر میں نے پہلے ایک فلمی لوشن سے پتلون پر پڑی ہوئی خون کی چھینٹوں کو صاف کیا اور پھر اسے دوسرے چند کپڑوں کے ساتھ لانڈری بھجوا دیا۔

ذلیل اور غدار دیپ چند کا کام تمام ہو گیا تھا لیکن لیکن ہمارے دل کی آگ اور بڑھ گئی تھی۔ مظلوم شاہدہ کی صورت آنکھوں میں پھر جاتی۔ غور کرنے پر اس کی ذرا سی بھی غلطی محسوس نہ ہوتی۔ وہ ناتجربہ کار تھی اس کی عمر شادی کی تھی، عسرت کی زندگی نے اس کے دل میں حسرتیں پیدا کر دیں اور ایسے میں دیپ چند نے اسے سبز باغ دکھائے۔ غلطی ہماری ہی تھی، ہم نے ہی غلط صفت انسان کو اپنے خاندان میں داخل کیا۔ شاہدہ بے گناہ تھی یقیناً بے گناہ۔

ہوٹل کے کمرے میں ہم دونوں اپنی اپنی سوچ میں غرق تھے، پھر عارف نے مجھ سے کہا۔ "ہم دہلی چلیں گے بھائی جان!"

"بے شک، اب شاہدہ کی تلاش وہاں ہی کی جا سکتی ہے۔"

ہم پورے طور پر کام کریں گے لیکن اب مسئلہ پاسپورٹ وغیرہ
کا ہے ۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے ہمارے پاس نہ وقت ہے
اور نہ حالات ایسے ہیں کہ ہم پاسپورٹ وغیرہ بنوا سکیں۔ پورے
ملک میں ہمیں تلاش کیا جا رہا ہے ایسی شکل میں ۔"

"یہ تو درست ہے، پھر کیا ارادہ ہے ؟"

"یہ بمبئی ہے بھائی جان ۔ اسمگلروں کی جنت میرا خیال
ہے یہاں کچھ نہ کچھ انتظام ضرور ہو جائے گا میں شام کو ہی نکلتا
ہوں، ایسے لوگوں کو تلاش کروں گا جو انسانوں کو اسمگل کرتے
ہیں ۔" عارف نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی ۔ عارف درست
ہی کہہ رہا تھا اور پھر جرائم پیشہ افراد کے سلسلے میں وہ مجھ سے
زیادہ واقفیت رکھتا تھا ۔ شام کو عارف نے غسل وغیرہ
کر کے لباس تبدیل کیا اور مجھ سے اجازت لے کر نکل گیا ۔ عارف
کے چلے جانے کے بعد میں بستر پر لیٹ کر خیالات میں گم ہو
گیا ۔ میں جو بے شمار کہانیوں کا خالق تھا میرے ذہن کی اختراع
دلچسپ کہانیوں کو جنم دیتی تھی اب خود ایک کہانی بن گیا تھا ۔
ایک عجیب و غریب کہانی جسے اگر قلم بند کیا جائے تو بہتوں کو
اس پر یقین نہیں آئے گا جو اسے بھی ایک دلچسپ کہانی تصور
کریں گے ۔ میرے کردار قتل و غارت گری بھی کرتے تھے، مصیبتوں
میں بھی پھنستے تھے اور انہیں مصیبتوں سے نکالنے کے لئے میں کیسے
کیسے جتن کرتا تھا لیکن، اب خود میں مصیبتوں میں گھرا ہوا تھا
میری تمام زندگی غم کی داستان بن گئی تھی لیکن میرے خالق
نے میری طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں، مجھے اس مصیبت
سے نکالنے کے لئے کوئی جتن نہیں کر رہا تھا اور ایک شیطان
اپنی من مانی کر رہا تھا ۔

میں نہ جانے کب تک انہیں خیالات میں گھرا رہا ۔
یہاں تک کہ مجھے نیند آ گئی ! اور میں نے ایک عجیب و غریب
خواب دیکھا ایک انتہائی حیرت انگیز خواب ۔۔۔۔ میں
نے دیکھا میں ایک ویران صحرا میں بھٹک رہا ہوں، چاروں
طرف ریت کے تودے پھیلے ہوئے ہیں میرے جسم پر چیتھڑے
لٹکے ہوئے تھے اور میں بھوک اور پیاس سے نڈھال تھا ۔
میری ٹانگیں جواب دے چکی تھیں لیکن میں گھسٹ رہا تھا ۔
اوپر سورج اور نیچے ریت جو کافی گرم تھی ۔ میری زبان
شدت پیاس سے باہر لٹک آئی اور پھر میں گر پڑا ۔ ریت
میرے پورے جسم کو بھوننے لگی اور میں تڑپنے لگا ایسے میں
میری دھندلائی آنکھوں نے ایک سایہ دیکھا وہ میری طرف
آ رہا تھا ۔ اور پھر وہ ہیولا واضح ہوتا گیا ۔ وہ باسدیو تھا ۔
اور اس کے ہاتھ میں ایک صراحی تھی جو پانی سے بھیگی ہوئی
تھی ۔ پیو گے ۔ اس نے صراحی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ۔
اور میں نے زبان نکال دی ۔

لیکن دوسرے لمحے باسدیو نے صراحی کھینچ لی ۔" پہلے
میرا کام کر دے بالک پھر پانی ملے گا ۔" اس نے مخصوص انداز
میں کہا اور میں حسرت بھری نظروں سے صراحی کی طرف
دیکھنے لگا ۔" بول جواب دے میرا کام کرے گا ؟"

"پانی، مجھے پانی دو ۔۔۔ خدا کے لئے مجھے پانی دو ۔"
میں نے بمشکل کہا ۔

" خدا کے لئے میرے پاس کچھ نہیں ہے تو مجھے مسجد میں
پہنچا دے اور پانی پی لے ۔"

" میں ۔۔۔ میں تیار ہوں ۔۔۔" میں نے خشک ہونٹوں
پر زبان پھیرتے ہوئے کہا اور باسدیو کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا ۔

" تب پھر اٹھ کھڑا ہو جا ۔" اس نے کہا اور نہ جانے کہاں
سے میرے جسم میں بے پناہ قوت آ گئی میں کھڑا ہو گیا، لیکن
پیاس بدستور مجھے لگ رہی تھی ۔ باسدیو میرے کندھوں پر
سوار ہو گیا اور میں چل پڑا ۔ مجھے باسدیو کا وزن بالکل نہیں
محسوس ہو رہا تھا اور میں بے تکان چلا جا رہا تھا، چند ہی
قدم چلا تھا کہ میں نے خود کو تارا گڑھ کی وادیوں میں پایا ۔

وہی جانا پہچانا راستہ، وہی خوشبو میرے وطن کی مہک جس نے دور سے بوڑھے تکسی کو دیکھا جو اپنے کام میں مصروف تھا۔ میں چلتا رہا اور تھوڑی دور پہ مجھے وہی مسجد نظر آنے لگی۔ میرے قدم تیزی سے مسجد کی طرف بڑھ رہے تھے کہ تھوڑے فاصلے پر میں نے دو سائے دیکھے وہ دونوں اس طرح کھڑے تھے جیسے میرا راستہ روک رہے ہوں۔ آہستہ آہستہ میں ان کے قریب پہنچ گیا اور میرا دل اچھل پڑا۔ میں نے ان دونوں کو پہچان لیا، وہ میرے والد اور چچا تھے والد صاحب غصیلی نظروں سے مجھے گھور رہے تھے اور پھر ان کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

"شارق، کیا کر رہا ہے، ہم نے تیرے لئے قربانی دی ہے، تو ہماری قربانی کو اس طرح ضائع کرنا چاہتا ہے۔ واپس لوٹ جا، اس بوڑھے کو زمین پر پٹخ دے، یہ تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

لیکن اس وقت بوڑھے نے میرے جسم کے گرد اپنی ٹانگوں کی گرفت سخت کر دی، اس نے میرے دونوں کان بند کر دیئے، آنکھیں بند کر دیں اور مجھے کسی گھوڑے کی طرح ہنکانے لگا۔ میں آگے بڑھ گیا اور تھوڑی دور جا کر اس نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اب والد صاحب اور چچا میرے سامنے نہیں تھے، مسجد اتنی ہی دور تھی، میں آگے بڑھتا رہا اور تھوڑی دیر بعد میں مسجد کے سامنے تھا، لیکن —— مسجد کے دروازے میں میں نے اپنی ماں کو دیکھا، تقدس کا پیکر دروازے میں کھڑا تھا، سر سے پاؤں تک سفید لباس، چہرے پر نور، ہاتھ میں تسبیح، وہ محبت سے میرے چہرے کو دیکھ رہی تھی اور پھر محبت سے لبریز ان کی آواز گونجی۔ شارق، تمام زندگی کی محنت کو گنوا رہے ہو بیٹے، ہماری قربانیوں کو اس طرح ضائع مت کرو، صبر کرو میرے بچے، اس منحوس کو اتار پھینکو، اس کی ناکامی کا دور شروع ہو چکا ہے۔ اس نے اللہ تعالیٰ کے قہر کو للکارا ہے۔ اس سے پوچھو وہ حکیم صاحب کے خاندان کو کیوں نہیں تباہ کر سکا، اس سے پوچھو کہ وہ تمہیں عارف کو بچانے میں کیوں نہیں روک سکا۔ اسے اپنی من مانی کرنے دو بیٹے، حالات کا مقابلہ کرو، ہر محنت کے بعد راحت ہوتی ہے، انتظار کرو۔ تم جو قربانی دے رہے ہو اس کا تمہیں بہت عظیم صلہ ملنے والا ہے۔" اور میرے قدم رک گئے۔ میں نے نفرت بھری نظروں سے باسدیو کو دیکھا اور —— اسی وقت میں نے خود کو پھر اسی صحرا میں محسوس کیا، دوسرے لمحے میں نے باسدیو کو ریت پر پٹخ دیا اور اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی صراحی ٹوٹ گئی۔ میں پیاسا تھا، لیکن اب مجھے پانی کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔

کوئی دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

میرا ذہن ابھی تک خواب کے سحر میں ڈوبا ہوا تھا، لیکن جب دستک زور سے ہوئی تو میں چونک پڑا اور جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ عارف تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی خاص بات نہیں تھی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا

"سو گئے تھے بھائی جان؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، آنکھ لگ گئی تھی۔" میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔ اس خواب نے میرے ذہن پر عجیب سا اثر کیا تھا۔ والد اور والدہ کے چہرے میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے، لیکن میں نے عارف سے اس کا تذکرہ نہیں کیا، کہتا بھی کیا۔

عارف لباس تبدیل کرنے لگا اور پھر اس نے کہا کہ اسے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ میں نے ویٹر کو بلا کر کھانے کے لئے کہا اور پھر کھانا کھاتے ہوئے عارف اپنی کارکردگی کے بارے میں بتانے لگا۔ "مجھے بہت مشکل سے ایک آدمی کا پتہ چل سکا۔ اس کا نام کارڈو ہے، دیسی عیسائی ہے، بندرگاہ کے علاقے کا غنڈہ ہے، اسمگلنگ کرتا ہے، ویسے اس کی لانچیں ہیں جو بظاہر مچھلیاں پکڑتی ہیں لیکن ان سے کام دوسرا ہوتا ہے —— بہرحال اس سے مل نہیں سکا۔ کل دس بجے کا وقت ملا ہے۔ میں اپنا پیغام چھوڑ آیا ہوں۔"

"ہوں۔" میں نے گردن ہلائی۔

"کیا بات ہے کچھ اداس ہو گئے ہیں بھائی جان؟" عارف نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں ہے، میں آئندہ پیش آنے والے واقعات پر غور کر رہا تھا۔"

"دیکھا جائے گا بھائی جان فکر نہ کریں۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا شاہدہ بھی ضرور مل جائے گی۔"

"ہاں، یقیناً" میں نے دل سے کہا جیسے میرے دل میں خوشی کی لہر پھوٹ رہی تھی۔ والد نے خواب میں جو کچھ کہا تھا حقیقت پر مبنی تھا۔ درحقیقت حکیم صاحب صاف بری ہو گئے تھے۔ عارف کا مل جانا میری خوش قسمتی کی دلیل تھی۔ عارف کی وجہ سے میری بڑی ہمت ہو گئی تھی اور اب وقتی طور پر زندگی سے مایوسی ختم ہو گئی تھی، میرے دل میں شاہدہ کو حاصل کرنے کی لگن پیدا ہو گئی تھی۔ کام خود بخود ٹھیک ہوتے جا رہے تھے۔ خدا نے میری سن لی تھی لہٰذا اب باسدیو کی فرعونی قوت ختم ہوتی جا رہی تھی، شاید یہ بچا کھچا خاندان پھر سے یکجا ہو سکے۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں اور عارف کمرے سے نکل آئے ہم تھوڑی دیر تک چہل قدمی کرتے رہے اور پھر کمرے میں واپس آ گئے۔ باوجود اس کے کہ میں کافی دیر تک سوتا رہا تھا مجھے جلد ہی نیند آ گئی۔

اور ایک طویل عرصے کے بعد میں نے ایک پرسکون رات گزاری میرے اضطراب میں کافی کمی ہو گئی تھی۔ دوسری صبح جب میں اٹھا تو ہشاش بشاش تھا۔ عارف ابھی تک سو رہا تھا میں غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ اور پھر غسل سے فارغ ہو کر نکلا تو عارف جاگ چکا تھا۔ ہم دونوں نے ناشتہ کیا اور پھر بیٹھ کر گفتگو کرنے لگے۔ اتنی دیر میں بیرہ اخبار پہنچا گیا اور میں اخبارات کی سرخیاں دیکھنے لگا اور پھر شہر کے ایک علاقے میں قتل ہو جانے والے دیپ چند نامی شخص کی خبر کی سرخی دیکھ کر میں چونک پڑا، اور جلدی جلدی وہ خبر پڑھنے لگا۔

خبر میں لکھا تھا کہ دیپ چند کا ایک دوست جب اس سے ملنے آیا تو اس نے دروازہ کھلا دیکھا وہ اندر داخل ہوا، تو اس نے صحن میں خون آلود جوتوں کے نشانات دیکھے اور پھر جب وہ اندر داخل ہوا، تو اس نے دیپ چند کی بھیانک لاش دیکھی، دیپ چند کے جسم کو کسی دھار دار آلے سے بری طرح گود دیا گیا تھا۔ پولیس کا خیال ہے کہ قاتل کوئی جنونی تھا اس نے کسی شدید جذبے کے تحت دیپ چند کو قتل کیا اور اس کے مرنے کے بعد بھی اس کے جسم پر وار کرتا رہا۔ دیپ چند کے پڑوسیوں نے بتایا کہ انہوں نے دو فیشن ایبل نوجوانوں کو دیپ چند کے مکان میں داخل ہوتے دیکھا تھا، پھر انہیں نکلتے نہیں دیکھا گیا۔

پولیس نے خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ بہت جلد دیپ چند کے قاتل کا پتہ چلا لے گی۔"

اس خبر کو پڑھ کر مجھے کوئی خاص وحشت نہیں ہوئی، تاہم ہلکا سا احساس ضرور ہوا تھا۔ میں نے اخبار عارف کے سامنے کر دیا اور عارف بھی اس خبر کو دلچسپی سے پڑھنے لگا۔ پھر پوری خبر پڑھنے کے بعد اس نے کہا۔

"درحقیقت ہم نے جوتوں کا خیال نہیں رکھا۔ بہرحال ابھی یہاں سے نکلنے کے بعد سب سے پہلے ان جوتوں کو ضائع کر کے نئے جوتے خرید لیں گے۔"

"بالکل، میرا خیال ہے چلیں، دکانیں کھل گئی ہوں گی، یوں بھی ہمیں دس بجے کارڈو کے پاس پہنچنا ہے" اور ہم دونوں اٹھ گئے۔ ابھی ہم کمرے سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف بڑھے ہی تھے کہ دفعتاً عارف نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا، اور میں چونک کر رک گیا۔

"کیا بات ہے عارف؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔
لیکن عارف میرا بازو پکڑ کر تیزی سے گھوم گیا۔ ہم راہداری کے دوسرے سرے کی طرف جا رہے تھے۔ لیکن اب مجھے عارف کی اس حرکت کے بارے میں پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ سیڑھیوں پر چڑھنے والی پولیس کی وردی میں بھی دیکھ چکا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ عارف کیا کرنے والا ہے۔ راہداری کے دوسری طرف کوئی دروازہ بھی نہیں تھا۔ یہ راہداری ایک دوسری راہداری سے ملتی تھی جہاں اس جیسے کمرے موجود تھے۔ بہر صورت میں تیز قدموں سے عارف کے ساتھ چلتا ہوا اس دوسری راہداری میں پہنچ گیا۔ عارف کی تیز نظریں کسی چیز کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر وہ ایک کمرے کے سامنے رک گیا۔ اس نے جیب سے ایک عجیب ساخت کا تار نکالا اور کمرے کا تالا کھولنے لگا۔ درحقیقت اپنے کام کا ماہر تھا۔ چشم زدن میں اس نے تالا کھول لیا اور میرا بازو پکڑ کر اندر دھکیلتے ہوئے بولا:

"بھائی جان، جلدی سے کمرے کی پشت پر کھلنے والی کھڑکی کھول دیں۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ میں کچھ سمجھ بھی نہ پایا تھا۔ دروازے پر مجھے چند سیکنڈ آہٹ محسوس ہوتی رہی اور پھر مجھے عارف کے الفاظ کا خیال آیا۔ میں تیزی سے کمرے کی پشت کی طرف دوڑا اور وہ کھڑکی کھول دی جو ہوٹل کی عقبی سمت ایک پتلی سی گلی میں کھلتی تھی۔ کھڑکی کھول کر میں باہر جھانکنے لگا۔ اتنا احمق بھی نہیں تھا کہ عارف کا مقصد نہ سمجھ سکتا۔ چند لمحات کے بعد میں نے عارف کو سیمنٹ کے اس گٹر پائپ پر اترتے دیکھا جو گندے پانی کی نکاسی کے لئے لگے ہوئے تھے۔ عارف پائپ پر پاؤں جما رہا تھا۔ میں نے اضطراب کے عالم میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں کہ کوئی عارف کو دیکھ تو نہیں رہا۔ مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ دوسری طرف مجھے ان پائپس کا بھی خطرہ تھا۔ پتلے سیمنٹ کے پائپ تنومند عارف کا بوجھ سنبھال بھی سکیں گے یا نہیں؟"

لیکن ہمارے ساتھ کچھ پراسرار قوتیں بھی سفر کر رہی تھیں اس لئے بہت سے ایسے کام ہو جاتے جن کے بارے میں عقل ساتھ نہ دیتی۔ عارف بخیر و خوبی کھڑکی تک پہنچ گیا۔ اور پھر میرے ہاتھ کا سہارا لے کر اندر آ گیا۔ اندر آ کر وہ گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور پھر کھڑکی بند کرتے ہوئے بولا۔

"کھڑکی سے روشنی اندر آ رہی ہے، اس لئے اسے بند کرنا ہی بہتر ہے تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو جائے۔"

"کمرے کا مکین اگر اندر آ گیا؟"

"آ گیا تو دیکھا جائے گا۔ لیکن میرے خیال سے یہ کمرہ خالی ہے، دیکھئے الماری وغیرہ بھی کھلی پڑی ہیں۔ اگر کوئی اس میں مقیم ہوتا تو تھوڑا بہت سامان ضرور ہوتا۔"

"کیا تم نے باہر سے تالا دوبارہ لگا دیا ہے —؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں، اب ہوٹل کے لوگوں کو گمان بھی نہیں ہو گا کہ اس بند کمرے میں بھی کوئی موجود ہے۔" عارف نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر کہنے لگا "میری خواہش ہے کہ پولیس دس بجے سے پہلے واپس چلی جائے تاکہ ہم کارڈو کو دیئے ہوئے وقت پر پہنچ سکیں، نہ جانے اس کی لانچ کس وقت جا رہی ہے۔"

"لیکن پولیس اتنے صحیح پتے پر پہنچی کس طرح؟"

"ان کا اپنا کام ہے بھائی جان، اسی ذہانت کی تنخواہ لیتے ہیں۔ ہمیں ان کے نہیں اپنے بارے میں سوچنا ہے کہ ہم ان کی ذہانت کو شکست دے کر یہاں سے کیسے نکل سکتے ہیں۔" عارف نے کہا اور اچانک اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ کمرے کے باہر بھاری قدموں کی آواز گونج رہی تھی، پھر کسی کمرے کے دروازے کو کھٹکھٹایا

گیا اور کسی نے دروازہ کھول دیا۔

"اندر کون ہے؟" ایک سخت آواز ابھری۔

"مم۔ میری بیوی جناب۔"

"کسی کو ادھر آتے ہوئے دیکھا ہے؟"

"میں کمرے میں تھا، کیسے دیکھ سکتا تھا؟" دوسری آواز سنبھل گئی۔

"ہوں۔ اس کمرے میں کون رہتا ہے، پھر اسی آواز نے اس کمرے کے دروازے پر کوئی چیز مارتے ہوئے کہا جس میں یہ دونوں موجود تھے۔

"یہ تو پندرہ دن سے خالی ہے جناب۔" ایک تیسری آواز ابھری۔

"پھر آخر وہ کہاں مر گئے۔ کان کھول کر سن لو، میں ہوٹل کے ایک ایک کمرے کی تلاشی لوں گا۔ یہ میری ڈیوٹی ہے۔ میری غلط اطلاع نہیں تھی۔ اور میں ان لوگوں کو یہاں سے برآمد کئے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے، لیکن ہوٹل کے مہمانوں کے اعتراض کے آپ جواب دہ ہوں گے۔" تیسری آواز نے کہا۔

بھاری آواز پھر نہ سنائی دی۔ البتہ قدموں کی آوازیں آگے بڑھ گئی تھیں۔ میرے چہرے پر سنسنی کے آثار تھے، لیکن عارف کافی دلچسپی سے یہ گفتگو سن رہا تھا۔

"کوئی صدی پولیس افسر معلوم ہوتا ہے، خیر کوئی بات نہیں ہے وہ بھی کیا یاد کرے گا۔" عارف نے کہا اور ایک صوفہ دروازے کی طرف گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گیا۔ صوفہ گھسیٹنے سے تھوڑی سی آواز پیدا ہوئی اور میں نے چونک کر عارف کی طرف دیکھا لیکن عارف مسکرا دیا۔

"بیٹھے بیٹھے بھائی جان ـــــ اب تو ان کے دفع ہونے کا انتظار کرنا ہو گا لیکن ٹھہریئے، کیا آپ اس سیمنٹ پائپ کے ذریعے نیچے اتر سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں، لیکن اگر کسی نے دیکھ لیا تو۔"

"نو رسک نو گیم بھائی جان، ہمیں خطرہ مول لینا ہو گا۔ گارڈ کے پاس ہر قیمت پر دس بجے سے پہلے پہنچنا ہے ـــ صرف چند منٹ انتظار کر لیں، ممکن ہے وہ کسی کمرے کی کھڑکی سے پشت پر جھانکیں ان کی واپسی کے بعد ہم گلی میں اتر کر چل دیں گے، ورنہ یہاں تو وہ لوگ کافی دیر تک رکیں گے۔

افسر کی باتوں سے یہی اندازہ ہوتا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر گردن ہلا دی۔ بلاشبہ عارف ان معاملات میں مجھ سے زیادہ ذہین اور تجربہ کار تھا۔ وہ پولیس والوں کی نفسیات سے مجھ سے زیادہ واقف تھا۔

ہم لوگ مزید کچھ دیر انتظار کرتے رہے، پھر عارف نے کمرے کی پشت پر پہنچ کر کھڑکی کھولی اور تھوڑی سی گردن نکال کر پہلے ہوٹل کی پشت پر اوپر اور پھر دائیں بائیں نگاہ ڈالی اور پھر گلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک۔ بظاہر کوئی نہیں تھا، لیکن نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کون کس وقت کھڑکی کھول کر گلی میں دیکھنے لگے۔

"مجھے دیکھ لیں بھائی جان، جس طرح میں اتروں اسی طرح اتر آیئے۔" عارف نے کہا اور چھلاوے کی طرح کھڑکی سے باہر نکل گیا۔ میں دوڑتا ہوا کھڑکی پر پہنچا، تو میں نے دیکھا کہ عارف کسی بندر کی سی پھرتی سے پائپ سے نیچے پھسل رہا ہے۔ چند لمحات کے بعد وہ نیچے تھا۔ میرے اندر عارف کی سی پھرتی تو نہیں تھی، لیکن بہر حال نیچے اترنے میں میں نے بھی دیر نہیں کی۔ اور پھر ہم دونوں تیزی سے گلی سے نکل آئے۔ سڑک پر پہنچ کر ہم نے ہوٹل کے دروازے کی طرف دیکھا، پولیس کے کئی سپاہی باہر ٹہل رہے تھے۔

"کم بختوں نے پوری بٹالین کے ساتھ حملہ کیا ہے۔" عارف مسکراتے ہوئے بولا۔ اور ہم لوگ آگے بڑھ گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک ٹیکسی نظر آئی اور ہم اس میں

بیٹھ کر چل پڑے۔ عارف نے بندر گاہ کا راستہ بتا دیا تھا۔ ٹیکسی سڑک پر دوڑتی رہی، ہماری نظریں سڑک کے دونوں طرف لگی ہوئی تھیں، کبھی کبھی ہم پیچھے بھی دیکھ لیتے تھے، لیکن ابھی تک خطرے کی کوئی علامت نہیں تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم بندر گاہ کے علاقے میں پہنچ گئے اور پھر عارف نے ایک جگہ ٹیکسی رکوالی۔ ہم نے اتر کر بل ادا کیا اور پیدل ایک طرف چل پڑے۔

"وہ سامنے ایک عمارت نظر آرہی ہے" اس نے ایک میلی سی عمارت کی طرف اشارہ کر کے کہا "وہ کارڈو کا ہوٹل ہے۔ یہاں خطرناک قسم کے ملاح آتے ہیں اور کھلے عام جوا، شراب چلتی ہے جب کہ لائسنس صرف ہوٹل کا ہے" عارف نے مجھے بتایا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور تھوڑی دیر کے بعد ہم ہوٹل کی عمارت کے نزدیک پہنچ گئے ہم دونوں چونکہ چہروں سے شریف نظر آرہے تھے اس لئے کچھ لوگوں نے عجیب انداز سے ہمیں دیکھا۔ بہر حال ہم اندر پہنچ گئے اور عارف نے کاؤنٹر کلرک کے نزدیک پہنچ کر کارڈو کے بارے میں پوچھا۔

"کیا کام ہے؟" کاؤنٹر کلرک نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا، اور عارف کی بند مٹھی اس کے سامنے کھل گئی جس میں سو روپے کا ایک نوٹ تھا۔

"تم بھول گئے دوست، کل میں ایک پیغام چھوڑ گیا تھا اور تم نے آج کا وعدہ کیا تھا" عارف نے مسکراتے ہوئے کہا اور کاؤنٹر کلرک نے نوٹ لے کر جیب میں رکھ لیا ــــ پھر بولا۔

"مجھے یاد آگیا ہے، سارے مغز سے بات اتر گئی تھی" اس کے ساتھ ہی اس نے ایک گھنٹی بجائی اور ایک قوی ہیکل آدمی بیرے کے لباس میں اس کے نزدیک پہنچ گیا۔

"صاحب لوگوں کو کارڈو صاحب کے پاس پہنچا دو"

قوی ہیکل بیرے نے گردن ہلائی، اور ہم دونوں کو گردن کے اشارے سے اپنے پیچھے آنے کے لئے کہا۔ ہم خاموشی سے چل پڑے۔ ویسے مجھے اس خطرناک ماحول کا پورا پورا احساس تھا، لیکن اب کسی بھی ماحول کی ہماری نظروں میں کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی ہم قاتل تھے اور مفرور قیدی تھے اور ابھی نہ جانے کیا کچھ کرنا تھا۔

ایک راہداری سے گزر کر ہم ایک ہال میں پہنچے جس میں تین دروازے نظر آرہے تھے۔ دفعتاً بیرے نے اپنے لباس سے ایک اعشاریہ دو پانچ کا پستول نکال لیا اور ہماری طرف تان کر کھڑا ہو گیا۔

"اپنے ہاتھ بلند کر دو۔"

اس اچانک واقعے پر ہم ساکت رہ گئے تھے۔

"کیا تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے۔" قوی ہیکل بیرے نے پوچھا۔ اور عارف نے اطمینان کی سانس لی۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی نہیں ہے، تم تلاشی لے سکتے ہو" بیرا آگے بڑھ آیا۔ ایک ہاتھ سے اس نے پستول سنبھالا اور دوسرے سے ہم دونوں کی تلاشی لینے لگا۔ پھر پستول وغیرہ محسوس نہ کر کے اس نے گردن ہلائی اور وہیں ہال کے ایک دروازے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"کرائے کے بدمعاش اور پولیس والے ہمیشہ استاد کارڈو کے چکر میں رہتے ہیں اس لئے ہم تلاشی لئے بغیر کسی کو ان سے نہیں ملنے دیتے۔"

"کوئی بات نہیں ہے۔" عارف جلدی سے بولا اور ہم دروازہ کھول کر اندر پہنچ گئے۔ بیرا بھی ہمارے ساتھ تھا اندر پہنچ کر اس نے کسی سے کچھ کہا۔

"استاد یہ کل والے آدمی ہیں، پلٹو نے آپ سے تذکرہ کیا تھا۔"

"اوہ ـــــ آنے دو" ایک صوفے سے آواز آئی جس کی پشت دروازے کی طرف تھی، اور بیرے نے ہم دونوں کو اشارہ کیا۔ ہم آگے بڑھ کر اس شخص کے سامنے پہنچ گئے ـــــ صورت سے درحقیقت خطرناک آدمی معلوم ہوتا تھا ـ چوڑا چکلا جسم، ٹھگنا قد اور چہرے پر زخموں کے بے شمار نشانات۔

"کیا بات ہے، کیوں آئے ہو؟ بیٹھو" اس نے انتہائی نرم اور مہذب لہجے میں کہا۔ اور ہم دونوں شکریہ ادا کر کے بیٹھ گئے ـــــ

"ہم دوبئی جانا چاہتے ہیں۔ سنا ہے آپ کی لانچیں یہ کام کر سکتی ہیں۔"

"کرتی رہتی ہیں، لیکن آج کل چیکنگ سخت ہے، اس لئے میں نے کار۔ رکھا ہے اب لانچیں صرف سامان لاتی اور لے جاتی ہیں۔"

"ہمارا جانا بے حد ضروری ہے کسی بھی طرح، کسی بھی قیمت پر" عارف نے کہا۔

"کوئی واردات کر کے فرار ہو رہے ہو" تجربہ کار کارڈو مسکراتے ہوئے بولا۔

"یہ بات نہیں، دراصل ہمیں ایک بردہ فروش کی تلاش ہے، وہ ہماری بہن کو لے گیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس سے اپنی بہن کو واپس حاصل کر لیں۔"

"بردہ فروش، کون ہے، کیا نام ہے اس کا" کارڈو نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"بن فرقان۔"

"اوہ، ہاں۔ مجھے اس کے آنے کی اطلاع ملی تھی ـــــ مجھے بھی اس سے دو دو ہاتھ کرنے تھے، لیکن یہاں اس کا پتہ نہیں چل سکا اور وہ چوروں کی طرح نکل گیا۔ بہرحال اگر یہ بات ہے تو میں تیار ہوں لیکن تم لوگوں کو ملاحوں کی طرح جانا ہوگا۔ عام آدمیوں کے لئے آج کل گنجائش نہیں ہے۔"

"ہم تیار ہیں" عارف جلدی سے بولا۔

"دو ـــــ دو ہزار روپے نکالو" کارڈو نے کہا۔ اور میں بوکھلا گیا۔ اتنی رقم تو فی الحال نہیں تھی۔ لیکن عارف کے بارے میں میرا اندازہ غلط تھا۔ عارف درحقیقت ماہر فن ہو گیا تھا۔ اس نے جیب سے سو سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور چار ہزار روپے نکال کر کارڈو کے سامنے ڈال دیئے۔ کارڈو نے نوٹ گن کر جیب میں ڈالے اور پھر بولا۔

"شہر میں کوئی کام تو نہیں ہے؟"

"نہیں ـــــ کیوں؟" عارف نے پوچھا۔

"تب پھر شام تک ہوٹل کے ایک کمرے میں قیام کرو۔ چھ بجے ایک لانچ جا رہی ہے، تمہیں دوبئی چھوڑتی ہوئی نکل جائے گی۔ ٹھیک پانچ بجے تیار ہو جانا۔ میرا آدمی تمہیں ملاحوں کے کپڑے دے دے گا۔ تمہارا اپنا کوئی سامان نہیں ہے؟"

"کچھ نہیں" عارف نے کہا اور اس نے باہر کی طرف رخ کر کے کسی کو آواز دی۔ ایک آدمی فوراً اندر آ گیا۔

"ان لوگوں کو کمرہ نمبر آٹھ میں پہنچا دو۔ کوئی تکلیف نہ ہو۔" اس آدمی نے گردن ہلا دی۔

چھوٹے سے کمرے میں ہم نے وقت گزارا۔ درحقیقت ان لوگوں نے ہماری کافی مدارات کی اور پھر پانچ بجے ہم ملاحوں کے لباس میں ہوٹل سے نکل آئے۔ ایک کھٹارہ قسم کی ویگن ہمیں لے کر چل پڑی اور ہم ایک دور دراز ساحل پر پہنچ گئے جہاں ایک لانچ موجود تھی۔ یہاں لانچ کے ڈرائیور سے جسے کپتان کہا جاتا تھا اور جو صورت شکل میں کارڈو سے ملتا جلتا تھا ہمارا تعارف کرایا گیا۔ ٹھیک چھ بجے لانچ نے ساحل چھوڑ دیا اور جب ساحل ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو ہم دونوں نے سکون کی سانس لی۔ عارف مسکراتے ہوئے مجھے دیکھنے لگا۔

"خدا کا شکر ہے بھائی جان، فی الحال ایک مصیبت

سے تو جان چھوٹ گئی ۔"

" ہاں ،" میں نے ایک گہری سانس لی : " اب دوسری مصیبتیں ہماری منتظر ہیں ۔" عارف خاموشی سے میری شکل دیکھنے لگا ۔ اس کے چہرے پر غور و فکر کے آثار تھے ۔ میں بھی سمندر میں اٹھتے ہوئے بگولوں کو دیکھتا رہا ۔ شام جھک رہی تھی ۔ اور سورج کے گولے کا آخری سرا سمندر میں غروب ہو رہا تھا ۔ مجھے آنے والی مشکلات کا احساس تو تھا لیکن نہ جانے کیوں قدرتی طور پر مایوسی اب میرے ذہن سے نکل گئی تھی ۔ میں پہلے کی طرح پژمردہ نہیں تھا ۔ پاسدیو کا خیال اب بھی میرے ذہن میں آ کر میرے دل کو لرزا دیتا تھا لیکن میں اس کے ساتھ ہی اپنے دل میں ایک ہمت بھی پاتا جیسے کسی نامعلوم قوت نے میرے دل کو سہارا دے دیا ہو ۔ اس کا محرک کیا تھا ، عارف کا ساتھ ، بہن کے حصول کی خواہش یا کوئی اور پر اسرار قوت ۔

لیکن میں اس بارے میں فیصلہ نہ کر سکا ۔ اب رات ہو گئی تھی ۔ لانچ کی رفتار اور تیز ہو گئی ۔ ہمیں رات کا کھانا دیا گیا ۔ جو بھنی ہوئی مرغی کی رانوں ، چاول اور میٹھے پر مشتمل تھا ۔ کھانے کے بعد عمدہ قسم کی کافی ملی ۔ اور پھر ایک آدمی نے کہا ۔ اگر ہم آرام کرنا چاہیں تو جگہ تیار کی جائے ۔ ہم ملاحوں کے لباس میں ضرور تھے لیکن ہم سے ملاحوں کا کام نہیں لیا جا رہا تھا ۔ اور لانچ پر ہمارے ساتھ دوسروں کا رویہ بھی اچھا تھا ۔ یہ شاید بن فرقان کے نام سے کارڈو کی نفرت کا نتیجہ تھا ، ورنہ اتنی آسانیاں فراہم نہ ہوتیں ۔

رات آہستہ آہستہ بہتی رہی ۔ لانچ تیز رفتاری سے سفر طے کر رہی تھی ، سمندر پر چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور میں اور عارف اس سخت اور کھردری جگہ پر سونے کی مضحکہ خیز کوشش کر رہے تھے ۔ جب کافی کوشش کے بعد بھی نیند نہ آئی تو عارف اٹھ کر بیٹھ گیا ۔ اس نے جھک کر مجھے دیکھا اور میں بول پڑا ۔ " کیا بات ہے عارف ۔"

" اوہ ، میں دیکھ رہا تھا بھائی جان ، کیا آپ کو نیند آ گئی ؟"

" سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔" میں نے کہا ۔

" تب سونے کی اداکاری کرنے سے کیا فائدہ ، آئیے ریلنگ کے ساتھ کھڑے ہوں ۔" اس نے کہا ! اور میں بھی اٹھ گیا ۔ ہم ریلنگ کے ساتھ کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے ۔

" اب سب سے بڑا مسئلہ خیریت کے ساتھ دوبئی میں داخل ہونے کا ہے ۔ شہر میں پہنچنے کے بعد تو ہم وہاں قیام کی کوشش کر سکتے ہیں ، لیکن ساحل سے بچ کر نکل جانا سب سے بڑی بات ہے ۔"

جہاں اتنی آسانیاں فراہم ہوئی ہیں عارف ، وہاں قدرت یہ انتظام بھی کر دے گی ۔" میں نے کہا ۔

" تھوڑے گناہ کر چکے ہیں بھائی جان ، چند بے گناہ بھی ہمارے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں ، کیا اب بھی قدرت ہماری مدد کرے گی ؟"

" ہم نے گناہ برائے گناہ نہیں کئے ہیں عارف ، بلکہ اس کے لئے مجبور کر دیئے گئے ہیں ، مجھے خدا پر بھروسہ ہے وہ میرے دل کا حال جانتا ہے ۔ اور پھر ہمارے ساتھ کچھ دعائیں بھی ہیں ۔ تم یقین رکھو ہم ہر منزل سے گزر جائیں گے ۔" میں نے بڑے وثوق سے کہا اور میری اس بات سے عارف کا چہرہ شگفتہ ہو گیا ۔ اس کی آنکھوں میں امید کے چراغ روشن ہو گئے ۔ ہم دونوں کافی دیر تک اسی طرح گفتگو کرتے رہے ۔ اور اچانک دور ۔۔۔ بہت دور کچھ روشنیاں نظر آئیں ۔ گو سمندر صاف تھا اور چاندنی میں چمک رہا تھا ۔ لیکن یہ روشنیاں اتنی دور تھیں کہ ہم ان کے بارے میں کوئی اندازہ نہ لگا سکے ۔ لیکن ۔۔۔ لانچ میں ابتری پھیل گئی ۔ شاید وہ لوگ ان روشنیوں کا مقصد سمجھ گئے تھے جو برابر جل اور بجھ رہی تھیں ۔

ملاح ادھر سے ادھر دوڑنے لگے ۔ ایک آدمی ہمارے

قریب سے گزرا اور میں نے اسے روک کر پوچھا۔
"کیا بات ہے ؟"
"بحری پولیس، ہم ایک بلاک کے قریب سے گزر رہے ہیں۔ شائد اس کی بحری پولیس نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔"
"اب کیا ہوگا ؟"
"مقابلہ" اس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔
اتنی دیر میں لانچ کا ڈرائیور کپتان ہمارے پاس آیا اور پھولے ہوئے سانس کے ساتھ بولا۔
"کیا آپ لوگ رائفلیں چلانا جانتے ہیں، ان سے بچ کر نکل جانے ہی میں ہماری عافیت ہے ورنہ ۔"
"ہاں، ہمیں رائفلیں دو" عارف نے کہا۔ اور کپتان دوڑتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ پھر ہم لوگوں کو بھی کارتوسوں کی کافی تعداد اور دو عدد رائفلیں دے دی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک مورچہ بھی ہمارے سپرد کر دیا گیا۔ دور نظر آتی ہوئی روشنیاں اب قریب آتی جا رہی تھیں۔
"حالات ایک دم بگڑ گئے ہیں بھائی صاحب۔ کیا خیال ہے مقابلہ کریں یا ـــ" وہ چند ساعت رکا۔ اور پھر بولا۔ "نکل جانے کی کوشش کریں ؟"
"نکل کیسے جاؤ گے، چاروں طرف سمندر ہے ـــ" میں نے حیرت سے کہا۔ عارف کسی سوچ میں گم تھا پھر وہ گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔
"دیکھا جائے گا پہلے حالات دیکھتے ہیں اگر پولیس ان لوگوں پر بھاری پڑی تو ہم نکلنے کی کوشش کریں گے ۔" اور پھر اس نے پولیس کی بڑی لانچ پر نظریں جما دیں۔ پولیس کی لانچ کافی تیز رفتار تھی! اور قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھی۔ ادھر کارڈو کے ساتھیوں نے اپنی لانچ کی رفتار سست کر دی تھی اس طرح وہ پولیس والوں کو دھوکے میں ڈال رہے تھے۔ اگر وہ بھاگنے کی کوشش کرتے تو پولیس

کو یقین ہو جاتا کہ وہ اسمگلر وغیرہ ہیں۔
پھر پولیس لانچ میگا فون پر ایک آواز ابھری۔ "کون ہو تم لوگ ۔ روشنی کا جواب کیوں نہیں دیتے، جواب دو ورنہ ہم تمہیں اسمگلر سمجھ کر فائرنگ شروع کر دیں گے ۔"
اور فوراً ہی کپتان کی آواز بھی میگا فون پر ابھری۔
"ہماری روشنی کا سسٹم خراب ہو گیا ہے۔ ہمیں خطرہ تھا کہ تم دور سے ہی فائرنگ نہ شروع کر دو۔ ہمیں مدد کی ضرورت ہے، ہماری مدد کرو۔"
"تم لوگ کون ہو ؟" پوچھا گیا۔
"یہ ایک تجارتی لانچ ہے، ہمارے پاس لائسنس موجود ہے۔ تم دیکھ سکتے ہو۔" کپتان نے کہا! اور پولیس کی لانچ اور قریب آنے لگی۔ بہت سے لوگ سامنے ریلنگ پر آ کھڑے ہوئے وہ بھی مسلح تھے۔ اور اس لانچ کے آدمی بدستور مورچے لئے بیٹھے تھے۔
دفعتاً کپتان کی آواز گونجی ـــ "فائر ۔"
اور اس کے ساتھ ہی پولیس لانچ پر گولیاں برس پڑیں۔ پولیس لانچ سے بے شمار چیخیں ابھریں۔ ادھر سے برابر فائرنگ ہو رہی تھی۔ اور پولیس لانچ پر ابتری پھیل گئی تھی اس کے ساتھ ہی اچانک لانچ کے انجن اسٹارٹ ہو گئے اور لانچ تیر کی طرح آگے بڑھی درحقیقت کپتان نے بڑی ہوشیاری سے کام کیا تھا۔ پولیس کو مصیبت میں ڈال کر نکل جانے کی یہ ترکیب بہت عمدہ تھی ـــ لیکن بہت جلد پولیس والے بھی سنبھل گئے۔
لانچ رائفلوں کی رینج سے نکل گئی تھی یا پھر شائد ان کے پاس اتنے آدمی نہیں رہے تھے کہ وہ رائفلوں سے مقابلہ کرتے، اس لئے ایک گرجدار آواز سنائی دی اور ایک خوفناک گولہ لانچ کے پچھلے سرے پر لگا۔ ایک زبردست جھٹکے سے لوگ ادھر ادھر گر پڑے۔ میں

اور عارف بھی لڑھک گئے تھے اور رائفل عارف کے ہاتھ سے نکل کر سمندر میں جا پڑی۔

پولیس لانچ اب باقاعدہ تعاقب کر رہی تھی۔ اس میں لگی ہوئی توپ گولے برسا رہی تھی۔ یہ قسمت ہی تھی کہ پہلے گولے کے بعد کوئی اور گولہ ابھی تک لانچ میں نہیں لگا تھا۔ لیکن پہلے ہی گولے نے لانچ کو جس قدر نقصان پہنچایا تھا اس کا اندازہ ابھی نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ بلاشبہ کپتان ایک ماہر ملاح تھا۔ یہ لانچ پولیس لانچ سے ہلکی تھی۔ کپتان سمندر ہی سے اسے لہریں دیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا تاکہ گولہ اس پر نہ پڑ سکے۔ اور چونکہ پولیس لانچ اتنی پھرتی سے نہ مڑ سکتی تھی اس لئے اس کے برسائے ہوئے گولے بیکار جا رہے تھے۔

بہرحال اس نے پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ لانچ کی تمام روشنیاں گل تھیں لیکن چاندنی میں وہ صاف نظر آ رہی تھی۔ پولیس لانچ والوں کی طرف سے اچانک گولہ باری بند ہوگئی۔ شاید انہوں نے مغالطے میں ڈالنے کے لئے ایسا کیا تھا یا پھر ان کا کوئی اور پروگرام تھا۔ کیونکہ لانچ کی رفتار اچانک تیز ہو گئی تھی۔ اور تیز رفتاری میں یہ لانچ پولیس لانچ کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ فاصلہ کم ہونے لگا لیکن ــــــ اس کے ساتھ ہی شاید پولیس لانچ والے نشانہ بھی درست کر رہے تھے۔ کیونکہ کئی منٹ کی بھاگ دوڑ کے بعد جب کہ لانچ والے توپ کے خطرے سے باہر ہو گئے تھے۔ اچانک ایک دھماکہ سنائی دیا۔ اور اس بار گولہ لانچ کے وسط میں آ کر گرا تھا۔

کئی چیخیں سنائی دیں۔ اور لانچ کے انجن بند ہو گئے۔ گولے نے کپتان کے کیبن کا نام و نشان مٹا دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تیزی سے لانچ میں پانی بھرنے لگا۔ عارف بھی بجلی کی طرح میرے ہاتھ سے رائفل جھپٹ کر پھینک دی اور میرا بازو پکڑ کر جھکے جھکے ایک طرف دوڑنے لگا۔ لانچ کے پچھلے سرے پر پہنچ کر اس نے لانچ سے بندھے ہوئے ٹیوب کھولے۔ کچھ اور لوگ بھی ان ٹیوبوں کو حاصل کر آ رہے تھے ان کے مقابلے کے لئے میں ڈٹ گیا! اور میرے طاقت ور گھونسوں نے ان لوگوں کو بدحواس کر دیا۔ اتنی دیر میں عارف دونوں ٹیوب کھول چکا تھا۔ اس نے ٹیوبوں کے ساتھ رسیاں بھی باندھ لی تھیں۔ آخری آدمی کو زیر کرنے کے لئے اس نے بھی میرا ساتھ دیا۔ پولیس لانچ سے اب مشین گن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اور ہماری لانچ پر چیخیں گونجنے لگی تھیں۔

"سنبھالئے بھائی جان" ــــ عارف نے کہا اور ہم دونوں نے ٹیوب گردن سے پہن کر سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ ہماری انتہائی کوشش تھی کہ لانچ سے زیادہ سے زیادہ دُور ہو جائیں۔ سمندر میں اترنے کے بعد مجھے عارف کی ایک اور ذہانت آمیز کارروائی کا احساس ہوا۔ عارف نے دونوں ٹیوبوں کے درمیان ایک رسہ باندھ لیا تھا تاکہ سمندر میں ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں۔ اس طرح موت کے منہ میں جاتے ہوئے بھی ایک بھائی کی محبت کا احساس میرے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ ہم لوگ پوری ہمت اور طاقت صرف کر کے لانچ کے مخالف سمت تیرنے لگے۔ دونوں لانچوں میں جنگ ہو رہی تھی اور یہ اچھی بات تھی۔ اس دوران ہمیں دور نکل آنے کا موقع مل گیا تھا۔ یہاں تک کہ دھماکوں تک کی آواز معدوم ہو گئی۔ ہم بہت تیز رفتاری سے سفر کر رہے تھے۔ ہمارے سامنے کوئی منزل نہیں تھی ــــ بیکراں سمندر۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہم دو انسانوں کے علاوہ کوئی جاندار نہ ہو۔ اور پوری دنیا ایک سمندر ہو۔

چاند کا سفر جاری رہا۔ ہم لوگوں نے خود کو لہروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ ہمارے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے۔ اور اب صرف ٹیوب ہمیں سنبھالنے ہوئے تھے۔ رات گزری

اور دور مشرق سے صبح نمودار ہونے لگی۔ اس طرح سمت کا تعین ہو
گیا لیکن ہمارے سامنے امید کی کوئی کرن نہیں تھی۔ ابھی نہیں
کہہ سکتے تھے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں، لہریں کس طرف ہمیں
لے جا رہی ہیں۔ سورج ابھر آیا اور اس کے ساتھ ہی ہمارے
دلوں میں امید کا ایک آفتاب روشن ہو گیا۔

کافی دور ـــــ سورج کی کرنوں تلے ایک بادبان
ہماری نگاہوں میں چمکا دیا یقیناً وہ کسی کشتی کا بادبان تھا۔
میں نے عارف کی طرف دیکھا۔ عارف بھی بادبان کو دیکھ رہا
تھا۔ پھر وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کیا آپ اسے دیکھ رہے ہیں بھائی جان؟"

"ہاں، عارف ہمیں اپنی قوت سمیٹ کر اس طرف
چلنا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"میں خود بھی یہی کہنے والا تھا بھائی جان۔ وہ بہت
دور ہے، دوسرے کسی ذریعے سے ہم اسے متوجہ نہیں کر سکتے
اس لئے ہمیں خود اس تک چلنا ہوگا۔"

"تو آؤ۔" میں نے کہا اور دونوں بازو اور پیروں کے
استعمال سے آگے بڑھنے لگے۔ میری اس ہمت سے عارف
کی ہمت بھی بندھی اور ہم پوری قوت سے بادبان کی طرف
بڑھنے لگے۔ ہوا مہربان تھی وہ بھی ہمیں اسی طرف دھکیل
رہی تھی۔ اس لئے زیادہ قوت نہ صرف کرنی پڑی اور اب
ہمیں وہ چھوٹی سی کشتی نظر آنے لگی جس کا وہ بادبان تھا۔
کچھ اور قریب پہنچنے کے بعد ہمیں کشتی میں بیٹھا ہوا ایک آدمی
بھی نظر آیا جو شاید مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ اس کی نگاہ بھی ہم
دونوں پر پڑ گئی لیکن اس نے کسی قسم کی گرم جوشی کا اظہار نہ
کیا۔ اور اسی طرح بیٹھا سپاٹ نظروں سے ہمیں دیکھتا رہا۔
لیکن اس وقت اس کی نظروں سے ہمیں کیا لینا تھا۔ یہاں
تو زندگی بچ جانے کی خوشی تھی۔ چنانچہ ہم اس کے قریب پہنچ
گئے ـــــ

"ہمیں مدد کی ضرورت ہے، کیا ہم تمہاری کشتی میں آ
سکتے ہیں؟"

"آؤ۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

اور ہم دونوں اوپر پہنچ گئے۔ اوپر پہنچ کر ہم نے ٹیوب
اپنے جسموں سے الگ کئے اور کشتی میں لمبے لمبے لیٹ گئے۔
ہمیں زبردست تھکن کا احساس ہو رہا تھا۔ کشتی میں بیٹھا ہوا
تنہا آدمی بدستور ڈوری ڈالے بیٹھا رہا۔ عجیب بے حس انسان
تھا۔ اس نے ہم سے ہمارے بارے میں بھی نہیں پوچھا۔ قریب ہی
مچھلیوں کی بساندھ آ رہی تھی۔ ہم نے نظریں گھما کر دیکھا۔
دس بارہ مچھلیاں رکھی ہوئی تھیں جو شاید اس نے ابھی پکڑی
تھیں۔

کافی دیر تک ہم لوگ کشتی میں لیٹے رہے۔ پھر میں اٹھ گیا۔
اس دوران اس نے دو مچھلیاں اور پکڑی تھیں۔

"سنو دوست!" میں نے اس شخص کے کندھے پر ہاتھ رکھ
کر اسے مخاطب کیا اور اس نے لمبی گردن گھما کر ہمیں دیکھا۔
اس کے بدن سے بدبو کے بھبکے اڑ رہے تھے۔ آنکھیں پھیلی
پھیلی اور چہرہ عجیب غلیظ قسم کا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس
سے شدید کراہت محسوس ہوئی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔

"کیا خشکی یہاں سے قریب ہے؟"

"سات میل دور ہے ـــــ وہ جنوب میں بائیں سمت۔"
اس نے کہا اور میں نے اس کے اشارے پر اس لکیر کی طرف
دیکھا جو دور سے صرف ایک لکیر نظر آ رہی تھی۔

"اگر تم اس وقت مچھلیاں پکڑنے کا ارادہ ترک کر دو
اور ہمیں ساحل پر پہنچا دو تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔"

اس نے مچھلیوں کی طرف دیکھا اور پھر گردن ہلا کر اٹھ
گیا۔ گو اس کا رویہ بہت خشک تھا، اس کی ہیئت نہایت
بدنما تھی لیکن اس کے اس تعاون سے ہم متاثر ہوئے بن

نے بادبان کا رخ موڑ دیا۔ اور کشتی اس جزیرے کی طرف بڑھنے
لگی۔ عارف بھی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا۔
اور اس کے پاس ہی بیٹھ گئے۔

"وہ کون سا جزیرہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بابا" اس نے مختصراً جواب دیا۔

"کتنی آبادی ہے اس کی؟" عارف نے پوچھا۔

لیکن اس بات کا کوئی جواب نہ ملا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے۔ ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ کشتی ساحل کی طرف بہتی رہی اور پھر صبح ہو گئی۔ ہم جزیرے پر چھپنے والے درخت دیکھ رہے تھے۔ کہیں کہیں ٹیلے بھی نظر آ رہے تھے۔ اور آخر کار کشتی ساحل پر پہنچ گئی۔ ہم دونوں نے پانی میں کود کر اپنے پیروں کے نیچے زمین محسوس کی اور ہمارے دل مسرت سے لبریز ہو گئے۔ ہم کئی خطرات سے زندہ سلامت نکل آئے تھے۔ ہمارا کریہہ محسن بھی ہمارے ساتھ ساتھ نیچے اتر آیا۔ اس نے گھسیٹ کر کشتی ایک کھونٹے سے باندھ دی جو ساحل کی ریت میں گڑے ہوئے تھے۔ اور گردن سے ہمیں ساتھ آنے کا اشارہ کر کے آگے بڑھ گیا۔ اس کی چال بھی بڑی مضحکہ خیز تھی۔ بہر حال ہم اس کے ساتھ چلتے ہوئے ریت کی بلندی طے کرنے لگے۔ پھر ڈھلان شروع ہو گیا۔ ڈھلان پر ہمیں کھجور اور تاڑ کے بے شمار درخت نظر آئے۔ جنہیں دیکھ کر کافی مسرت ہوئی۔ گویا غذائی مسئلہ بھی نہیں تھا۔ درختوں کے درمیان سے گزر کر آخر کار ایک چوکور سے مکان کے نزدیک پہنچ گئے۔ اس جزیرے پر ایسے مکان کو دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی۔ وہ کسی اصطبل کی طرح تھا لیکن اس کی دیواریں چھوٹی اینٹوں سے بنی ہوئی اور کافی مضبوط تھیں۔ اندر داخل ہونے کا صرف ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ ہمارے غلیظ میزبان نے دروازے سے اندر داخل ہو کر ہماری طرف دیکھا گویا اندر آنے کی دعوت دے رہا ہو اور ہم اس مکان میں داخل ہو گئے لیکن اندر قدم رکھتے ہی ہمیں اپنے سانس بند کر لینے پڑے۔ مکان کیا تھا میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اصطبل نما تھا لیکن کسی اصطبل میں اس کی عشر عشیر بھی بو نہ ہوگی۔ چاروں طرف سے سڑاند اٹھ رہی تھی۔ اس کے علاوہ تاریکی بھی پھیلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ ہمارا میزبان بھی ہمارے ساتھ اندر آیا تھا لیکن اب وہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

"عارف!" میں نے گھبرائے ہوئے انداز میں عارف کو آواز دی۔

"جی بھائی صاحب!" عارف گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ بدبو کی وجہ سے اسے کھانسی اٹھ رہی تھی۔

"نکل چلو یہاں سے۔ یہاں رکنا مشکل ہے۔" میں نے کہا۔ اور عارف نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ لیکن اچانک روشنی کی وہ لکیر جو کھلے دروازے سے اندر آ رہی تھی غائب ہو گئی۔ دروازہ بند ہو چکا تھا۔ ہم دونوں ہی دروازے کی طرف لپکے لیکن مضبوط دروازہ باہر سے بند تھا۔

"یہ کیا ہوا عارف!" میرے منہ سے ڈوبتی ہوئی آواز نکلی۔

"اس گھٹن اور بدبو میں تو ہم مر جائیں گے۔" اس سے قبل کہ عارف کوئی جواب دے ایک کونے میں مٹی کے تیل کا چراغ روشن ہو گیا اور اصطبل نما مکان میں زرد اور مدقوق سی روشنی پھیل گئی۔ چراغ روشن کرنے والا ہمارا محسن ہی تھا۔ ہم نے اسے حیرت اور خوف سے دیکھا۔

اگر وہ اندر ہے تو باہر سے دروازہ کس نے بند کیا ہے۔ میں سوچ رہا تھا۔ اور عارف اس مکان میں چاروں طرف نظریں دوڑا رہا تھا۔ بڑی گندی جگہ تھی۔ ایک طرف نالی بنی ہوئی تھی جن کے کنارے کنارے سیاہ رنگ کی کیچڑ پھیلی ہوئی تھی۔ ایک طرف سیاہ رنگ کی کوئی چیز کافی تعداد میں پڑی ہوئی تھی۔ جس کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا کہ جما ہوا انسانی خون ہے۔

مچھلیوں کے چھوٹے بڑے سر چاروں طرف بکھرے پڑے تھے اس کے علاوہ دوسرے آبی جانوروں کے ڈھانچے بھی جگہ جگہ بکھرے پڑے تھے۔ بہت سے جانوروں کے جسم میں ابھی گوشت لگا ہوا تھا اور اس گوشت میں کیڑے رینگ رہے تھے اور بے سڑاند انہیں تمام چیزوں کی تھی اس وحشت خیز ماحول میں ہم تو گیا اچھے اچھوں کا پتا پانی ہو جاتا چنانچہ میں نے وحشت زدہ انداز میں کہا۔

"دروازہ کھلواؤ، دروازہ کس نے بند کیا ہے؟"

"کیوں کیا بات ہے؟" ہمارے میزبان کی میٹھی میٹھی آواز گونجی۔

"اس جگہ ہم نہیں رہ سکتے دروازہ کس نے بند کر دیا۔"

"میں نے بند کیا ہے اور تمہیں اسی جگہ رہنا ہوگا" میزبان نے جواب دیا۔

"کیا بکواس ہے، ہمیں یہاں کون رکھ سکتا ہے تم کون ہو؟" عارف نے جھلائے ہوئے انداز میں پوچھا اور اس کے قریب پہنچ گیا۔ ہمارا میزبان مسکرا رہا تھا اور اس کے غلیظ اور پیلے دانت بے حد بھیانک نظر آ رہے تھے۔ میں بھی جلدی سے ان دونوں کے قریب پہنچ گیا میزبان عارف کے بجائے مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"میں گرو باسدیو کا داس ہوں شارق بابو۔ کیا تم سمندر پار کا سفر کر کے گرو دیو سے مکتی حاصل کر سکتے ہو، یہ تمہاری بھول ہے۔ گرو دیو کی شکتی مہان ہے تم سنسار کی دوسری اور بھی ان کے پنجے سے نہیں بچ سکتے تم اتنا سفر کر چکے ہو، پر گرو دیو کی آنکھ کے ایک اشارے سے تارا گرو پہنچ سکتے ہو اب بھی سمے ہے گرو دیو کو ابھی تمہارے اوپر غصہ نہیں آیا ان کی بات مان لو اور سنسار کی کٹھناؤں سے بچ جاؤ۔"

"ذلیل کتے، تو اسی لئے ہمیں نکال کر یہاں تک لایا ہے وہ منحوس بوڑھا یہاں تک بھی پہنچ گیا۔" میں نے طیش کے عالم میں کہا اور اس غلیظ انسان کی گردن پکڑ لی میں اس کی گردن پوری قوت سے دبا رہا تھا اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ گردن میرے ہاتھوں میں تحلیل ہو رہی ہے اور چند سیکنڈ ــــ صرف چند سیکنڈ، اس کے بعد گردن غائب تھی اور کندھوں اور گردن کے جوڑ سے سرخ سرخ خون ابل رہا تھا۔

میں دہشت زدہ انداز میں پیچھے ہٹ گیا میری آستینیں خون سے سرخ ہو گئی تھیں اور عارف ــــ وہ سکتے کے سے عالم میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت بغیر سر کے شیطان کا ایک بھیانک قہقہہ سنائی دیا اور اس کی آواز گونجی۔

"ٹھیک ہے شارق بابو، اب باقی جیون یہیں بتاؤ۔ بھوک اور بدبو تمہارا بھاگ ہے۔ ہاں اگر تمہارے من میں کبھی مہاراج کی بات مان لینے کا خیال آ جائے تو تین بار گرو دیو کا نام لے کر دھرتی چھو کر ماتھے کو لگا لینا گرو دیو تمہارے پاس آ جائیں گے اور تمہاری سہائتا کریں گے۔ میں جا رہا ہوں تم سے ملتا رہوں گا۔" اچانک اس کا جسم ہلنے لگا اور پھر وہ بے سر کا جسم زمین پر گر پڑا۔ زمین پر چند ساعت تڑپنے کے بعد اس نے ایک اور بدہیئت شکل اختیار کر لی وہ انگلی کے برابر موٹا اور بالشت بھر لمبا ایک کیڑا بن گیا جس کے جسم پر لمبے لمبے بال تھے اور پھر وہ رینگتا ہوا نالی میں اتر گیا۔ چند لمحات کے بعد وہ نالی سے باہر تھا۔

عارف اب بھی پتھر کے بت کی طرح ساکت و جامد کھڑا تھا میں نے اسے جھنجوڑا اور وہ اچھل پڑا اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا اور آنکھوں سے دہشت جھانک رہی تھی۔

"یہ سب کیا ہے بھائی جان۔ یہ سب کیا ہے۔ وہ ــــ وہ ــــ وہ" عارف بری طرح ہانپنے لگا۔

ابھی تک میں نے کسی کو اپنی بدنصیبی کی تفصیل نہیں بتائی تھی جنہیں کچھ معلوم تھا وہ اس دنیا میں نہیں تھے اب عارف کے سامنے کچھ واقعات پیش آ گئے تھے اس سلسلے میں خاموش رہنا اب مناسب نہیں تھا دوسرے عارف سوالیہ انداز میں میری شکل دیکھ رہا تھا چنانچہ میں نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔

"یہ میری بدنصیبی کی داستان ہے عارف، یہ ہماری مصیبت
کا قصہ ہے اور یہ مصیبت اس منحوس دن سے شروع ہوئی جب
میں ناراگڑھ کی ڈھلانوں پر کہانی کی تلاش میں سرگرداں تھا۔
میں نے عارف کو شروع سے آخر تک تفصیل بتادی اور عارف
کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"آہ بھائی جان، تو یہ صرف اتفاقیہ حالات نہیں ہیں
بلکہ ایک منحوس انسان کے انتقام نے ہمارے بھرے پُرے گھر کو
اجاڑ دیا ہے۔ کہاں ہے وہ ذلیل کتا، مجھے اس کا پتہ بتائیے
جو ہماری مصیبتوں کا ذمہ دار ہے۔"

"وہ گندی قوتوں کا مالک ہے عارف۔ یہ اسی کا ہرکارہ
تھا کئی بار اس نے مجھے اس کی بات مان لینے کی ترغیب دی ہے۔"

"لیکن وہ مسجد میں کیوں جانا چاہتا ہے بھائی جان،
یہ کیا راز ہے۔"

"مجھے بھی نہیں معلوم، لیکن اتنا جانتا ہوں کہ گندی
قوتوں کا مالک وہ انسان جس کے نمائندے یہاں تک پہنچ
سکتے ہیں جو اس کی زبردست قوت کا پرچار کرتے پھرتے ہیں
اپنے قدموں سے چل کر مسجد میں داخل نہیں ہوسکتا اگر وہ ایسا
کرسکتا تو میرے پیچھے نہ پڑتا۔"

"عجیب راز ہے، اگر ہماری اس حالت کا ذمہ دار وہی
شخص ہے تو پھر ہم اس کی قوتوں سے کیسے لڑ سکیں گے۔"

"ان قوتوں کے سہارے جو اس کے بس میں نہیں ہیں میں نے
اس روز بھی ایک خواب دیکھا تھا جس دن تم کارڈو سے ملنے
گئے تھے اور مجھے والدہ اور دوسرے لوگوں نے اس کی بات
ماننے سے منع کیا تھا۔"

"ٹھیک ہے دیکھتے ہیں خدا نے شیطانی قوتوں کو کس قدر
آزادی دی ہے ہم اس کے نام کے ساتھ اس سے مقابلہ
کریں گے" عارف نے ہمت سے کہا اور حالات کا مقابلہ کرنے
کا فیصلہ کرلیا۔ ہم نے قوتِ ارادی سے کام لے کر اس خطرناک
بدبو کا احساس ذہن سے نکالنے کی کوشش کی اور اس میں کسی
حد تک کامیاب ہوگئے زمین اتنی گندی تھی کہ اس پر پاؤں
رکھنے کو بھی دل نہ مانتا تھا لیکن اب تو سب کچھ برداشت کرنا
ہی تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ ہم بھوکے پیاسے تھے ابھی تک
دونوں ہی برداشت کر رہے تھے، لیکن زیادہ عرصے تک
ایسا نہ کرسکتے تھے۔

بہرصورت کچھ بھی ہو، عارف دروازے کے قریب پہنچ
گیا۔ داخل ہوتے وقت اس کے بارے میں غور نہیں کیا تھا
لیکن اب اندازہ ہوا کہ بے حد موٹی اور مضبوط لکڑی کا بنا ہوا
تھا۔ انسانی قوت بغیر کسی اوزار کے اسے کھولنے پر قادر نہ تھی۔
وقت گزرتا رہا۔ باہر نکلنے کی تمام کوششیں ناکام ہوگئی تھیں۔
ہم زمین پر بیٹھ گئے۔ عارف کے چہرے سے نقاہت جھلکنے
لگی تھی۔ لیکن میں بھی مجبور تھا۔ کیا کرسکتا تھا۔ مٹی کے تیل کا
چراغ بدستور روشن تھا ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے اور
نہ جانے کب ہمیں بیٹھے بیٹھے نیند آگئی۔

نیند بھی کافی طویل تھی۔ شاید بے ہوشی کی شکل اختیار
کرگئی تھی اور ہم اس وقت بھی ہوش میں نہ آتے لیکن دروازہ
کھلنے کی آواز اس قدر زوردار تھی کہ ہماری آنکھ ایک ساتھ
کھل گئی۔ دروازہ پوری قوت سے کھلا تھا اور روشنی اندر گھس
آئی تھی سورج کی تیز روشنی میں ہم نے ایک بھیانک منظر دیکھا
وہی کریہہ شکل بوڑھا تھا جو بعد میں سرکٹا نمائندہ ثابت ہوا تھا
اس کے چہرے پر بدحواسی کے آثار تھے اور جسم کے کچھ حصوں
سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے جسم سے سیاہ رنگ کا ایک موٹا
سانپ لپٹا ہوا تھا جو بار بار اس کے جسم کے مختلف حصوں پر
ڈس رہا تھا۔ اور بوڑھا بُری طرح چیخ رہا تھا۔

"اب نہیں کروں گا سید صاحب، مر جاؤں گا، آہ۔۔۔
میں مر جاؤں گا سید صاحب، بھول ہوگئی، آہ، معاف کردو
سید صاحب، اب بھول کر بھی اس طرف نہیں جاؤں گا، آہ۔

اس کے ساتھ ہی وہ سانپ کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن سانپ کی قوت کے آگے اس کی قوت بیکار تھی۔ سانپ اس کے جسم کو بھی جکڑے ہوئے تھا اور شاید اسے بھینچ رہا تھا۔ بوڑھا نیچے گر پڑا اور سانپ نے آخری بار اس کی پیشانی پر ڈسا اور پھر اس کے جسم کے گرد سے بل کھولنے لگا۔ اس کے بعد وہ رینگتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔

بوڑھا ہاتھ پاؤں مار رہا تھا آہستہ آہستہ اس کا سر غائب ہونے لگا اور سیاہ جسم نمودار ہونے لگا۔ اور چند لمحات کے بعد وہ پراسرار سرکٹے کی شکل میں آ گیا لیکن اب اس کے جسم کے مختلف حصوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک لرزہ خیز منظر دیکھا۔ سرکٹے کا جسم آہستہ آہستہ ہل ہل کر بے ڈول ہوتا جا رہا تھا جیسے کوئی چیز پگھل رہی ہو اور سانچے سے نکل جانا چاہتی ہو۔ اور پھر اس کا گوشت گاڑھے سیاہ خون کی شکل میں چاروں طرف بہنے لگا۔

سیاہ بدبودار خون جو چاروں طرف پھیل گیا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد زمین پر گاڑھے سیال کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ ہم دونوں اس خوفناک اور پراسرار منظر میں ایسے گم تھے کہ کھلے دروازے کی طرف بھی خیال نہ کر سکے۔ سانپ کے چلے جانے کے بعد بھی ہم کئی منٹ اسی طرح کھڑے رہے پھر عارف کو ہی خیال آیا اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف دوڑا۔ تب مجھے بھی احساس ہوا اور ہم دونوں اس گندی قید سے نکل آئے۔ نہ جانے کتنی دیر ہم وہاں رہے تھے لیکن ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے سالہا سال کے بعد کسی بہت بڑی مصیبت سے نجات پائی ہو۔ باہر آ کر ہم نے کھلی فضا میں گہری گہری سانسیں لیں۔ بھوک کی وجہ سے برا حال تھا۔ تھوڑی دور پر کھجور اور تاڑ کے درخت موجود تھے۔ تاڑ کے درخت کے نیچے کچھ پھل پڑے ہوئے تھے۔ میں نے دوڑ کر انہیں اٹھا لیا اور پھر درخت میں مار کر ہم نے انہیں توڑا اور ان کا پانی پینے لگے۔ عارف نے بھی ایسا ہی کیا۔ پانی پینے کے بعد قدرے سکون ہوا اور عارف کہنے لگا۔

"میں کھجور کے درخت پر چڑھ رہا ہوں بھائی جان، آپ نیچے رہیئے۔ کھجور ایک مکمل غذا ہوتی ہے۔"

"درخت کافی اونچا ہے عارف۔" میں نے تشویش سے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں۔" عارف نے جواب دیا اور پھر وہ درخت پر چڑھنے لگا۔ عارف کی پھرتی قابل داد تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ درخت پر پہنچ گیا۔ پھر اس نے اپنے جسم کو سنبھال کر کھجوریں توڑنا شروع کیں اور نیچے پھینکنے لگا۔ گو مجھے سخت بھوک لگ رہی تھی لیکن میرا بھائی بھوکا تھا۔ اور خطرے سے دوچار تھا اس لئے میں کیسے کھا سکتا تھا۔ عارف کے نیچے آنے کے بعد ہم نے کھجوریں کھائیں اور ایک بار پھر تاڑ کا پانی پی کر سیر ہو گئے۔ اس منحوس مکان سے نکل کر ہم ایک ٹیلے کی طرف بڑھے تاکہ آبادی تلاش کریں۔

"درخت پر چڑھنے کے بعد اس کا خیال ہی نہ رہا اور نہ اس بلندی سے جزیرے کے بارے میں معلومات ہونا آسان تھا۔" عارف نے کہا۔

"بھوک ایسی ہی چیز ہے عارف، خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں اس اذیت ناک قید سے نجات دلائی۔"

"آپ نے اس سرکٹے کے الفاظ سنے تھے بھائی جان؟"

"ہاں، وہ سانپ کو سید صاحب کہہ رہا تھا وہ یقیناً کوئی بزرگ تھے عارف، اور وہ گندی روح ان بزرگ کے قریب پہنچ گئی ہوگی۔ اس سے تو اسی بات کا اندازہ ہوتا ہے کیونکہ خیر و شر کی قوتوں میں شر کتنا کمزور ہوتا ہے۔ اس وقت اس کا گرو دیو بھی اس کی کوئی مدد نہیں کر سکا۔"

"کیا ہم ان بزرگ سے مدد نہیں مانگ سکتے بھائی جان؟"

"وہ ہمارے حال سے بے خبر نہ ہوں گے، ممکن ہے اس سب

بھی کوئی مصلحت ہو۔" میں نے کہا اور ہم ٹیلے کی چوٹی تک پہنچ گئے۔
خاصی بلند چوٹی تھی! اور اس پر سے بھی پورا جزیرہ نظر آتا تھا۔
ہمیں یہ دیکھ کر شدید حیرت ہوئی کہ وہ بہت چھوٹا اور بالکل ویران
جزیرہ تھا۔ گویا یہاں اس منحوس سر کٹے کے علاوہ اور کوئی نہیں
تھا۔ پھر میری نگاہ سمندر کے کنارے کنارے گھومتی ہوئی اس
کشتی پر پہنچ گئی جو ہمیں یہاں تک لائی تھی کشتی اسی طرح پانی
پر موجود تھی۔ میں نے عارف کا شانہ دبایا اور اسے اس طرف
متوجہ کیا اور عارف اچھل پڑا۔

"اوہ، یہ کشتی اس جزیرے سے نکلنے میں مدد کرے گی بھائی
جان۔" وہ خوشی سے بولا۔

میں نے بادبان سیدھے کئے اور کشتی کو ہوا کے رُخ پر چھوڑ
دیا۔ عارف نے اسے دھکیل کر گہرے پانی میں ڈالا اور کود کر کشتی
پر سوار ہو گیا! ایک بار پھر ہم سمندر کے رحم و کرم پر تھے۔ سب سے
زیادہ ابن فرقان کا خیال تھا، نہ جانے کم بخت کہاں ہو، اور
شاہدہ کا کیا حال ہو۔

بہن کا خیال آتے ہی ہم رنجیدہ ہو گئے اور نہ جانے کب
تک اس کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔

صبح کو سورج کافی نکل آیا تھا جب میری آنکھ کھلی۔ عارف
شائد میرا انتظار ہی کر رہا تھا میرے آنکھ کھولتے ہی بولا:

"بھائی جان ہم ایک جزیرے کے قریب پہنچ رہے ہیں، دیکھئے
دور سے وہ جزیرہ نظر آ رہا ہے۔" میری آنکھوں کا خمار ہوا ہو
گیا۔ اور میں جلدی سے اٹھ کر جزیرہ دیکھنے لگا۔ دور سے
بھورے رنگ کے پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ کشتی جزیرے
کے کافی قریب پہنچ گئی تھی۔ ہم دونوں سب کچھ بھول کر جزیرے
کو دیکھ رہے تھے۔ جزیرہ اب صاف نظر آ رہا تھا اور خوشی
کی بات یہ تھی کہ وہاں آبادی تھی۔ یہاں سے ابن فرقان کے
بارے میں معلومات ہو سکتی تھی! اور ہمیں دوبئی بھی جا سکتا تھا۔
ہم نے کشتی کا رخ اس طرف موڑ دیا جہاں دوسری بادبانی
کشتیاں اور لانچیں کھڑی تھیں۔ ہم نے اپنی کشتی بھی انہی لانچوں
اور کشتیوں کے ساتھ کھڑی کر دی اور نیچے اتر آئے۔

ابھی ہم چند ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ کئی افراد ہماری
طرف لپکے اور ہمارے قریب پہنچ کر کچھ کہنے لگے ہم سمجھ رہے تھے
کہ وہ مختلف قسم کی عربی بول رہے ہیں لیکن ہم عربی نہیں سمجھ
سکتے تھے۔ پھر ان میں سے ایک آگے بڑھ آیا اور انگریزی
میں بولا۔

"کیا آپ انگریزی بول سکتے ہیں؟"

"ہاں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ اور مجھے انگریزی بولتے
دیکھ کر بھی بہت سے لوگ آگے بڑھ آئے۔

"سرائے اصیما میں قیام کریں گے جناب، بہت اعلیٰ
ماحول ہے۔"

"سرائے اطیسنی بہت حسین جگہ ہے مس عزیزہ
بربہانی کا رقص آپ کے دل کو موہ لے گا۔"

"میں آپ کو اپنی مرضی کے مطابق لڑکی مہیا کر
سکتا ہوں۔"

"میرے پاس دنیا کے بائیس ملکوں کی حسین ترین لڑکیاں
ہیں۔"

غرض بے شمار جملے ہمارے کانوں میں پڑ رہے تھے اور ہم
دونوں منہ پھاڑے ان لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ پھر بمشکل
ہم نے ان سے نجات حاصل کی اور ایک آدمی کو نمائندہ
منتخب کر لیا۔ یہ بھی مقامی باشندہ تھا! اور خاصی روانی
سے انگریزی بول لیتا تھا۔ جب ہم نے اس کا انتخاب
کر لیا تو دوسرے لوگوں نے فوراً ہمارا پیچھا چھوڑ دیا۔

اس شخص کا نام ہارون آفندی تھا۔ وہ ہمیں پیدل ہی کافی دور لایا۔ جزیرے کا رقبہ تین چار میل سے زیادہ نہیں تھا، اس لئے یہاں سواری کی نہ تو ضرورت تھی اور نہ اس کا کوئی بندوبست تھا۔ جس جگہ وہ ہمیں لایا درحقیقت بہت عمدہ تھی۔ یہاں انگریزی اور عربی میں "کھجور کی جھونپڑی" لکھا ہوا تھا۔ اسے کھجور کے درخت کے مختلف حصوں سے ہی بنایا گیا اس کے علاوہ خس استعمال کی گئی تھی۔ جزیرے کی ہوا خشک تھی۔ لیکن خس کے بنے ہوئے کمروں کو پانی سے تر رکھنے کا خاص طور سے انتظام کیا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ دور تک خوشبو اور ٹھنڈک تھی۔ ہمارے نمائندے نے ہمارے لئے ایک بڑے کمرے کا بندوبست کیا جس میں دو اعلیٰ درجے کے بستر لگائے گئے تھے۔

ہم ابھی تک نہیں سمجھ پائے تھے کہ یہ جزیرہ کس قسم کا ہے۔ اتنا تو ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ کوئی آزاد جزیرہ ہے جہاں ہر رنگ اور ہر نسل کے لوگ آتے رہتے تھے اور کسی کے یہاں آنے پر روک ٹوک نہیں ہے لیکن یہ کس کے زیر نگیں ہے لوگ یہاں کیوں آتے ہیں۔ اس کے بارے میں ہمیں ابھی تک کوئی معلومات نہیں تھی۔ ہم اپنے نمائندے سے بھی یہ سوال کرنے میں ہچکچا رہے تھے کیونکہ ممکن ہے یہاں کچھ مخصوص لوگ کسی مخصوص سلسلے میں آتے ہوں۔ اور ہمیں اجنبی محسوس کر کے دوسرے لوگ ہماری طرف سے مشتبہ نہ ہو جائیں۔ چنانچہ ہم نے اپنی طرف سے اس سلسلے میں کچھ نہ کہا۔ اور ہمارا نمائندہ دو گھنٹے کے بعد ہم سے ملاقات کرنے کا وعدہ کر کے یہاں سے چلا گیا۔ خس کے بنے ہوئے کمرے کے آرام دہ بستروں پر بیٹھے ہوئے ہم دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے۔ عارف پر خیال نظروں سے میری شکل دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کمرے کی دیوار سے کان لگا کر دوسری طرف کی آوازیں سنیں۔ اور اٹھ کر میرے پاس آ گیا۔

"ہمیں آہستہ آواز میں بات کرنی چاہئے بھائی جان کیونکہ ادھر کی آواز دوسری سمت صاف سنی جا سکتی ہے۔" میں نے گردن ہلا دی۔ تو عارف پھر بولا۔

"آپ نے ساحل پر ان نمائندوں کی گفتگو سنی — ایک نمائندے نے رقص کے بارے میں ہمیں ترغیب دی تھی دوسرے نے کہا تھا کہ اس کے پاس دنیا کے بائیس ملکوں کی لڑکیاں موجود ہیں ان باتوں سے ہم اس جزیرے کی حیثیت تو سمجھ سکتے ہیں گویا یہاں کھلے عام عیاشی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے جو لوگ یہاں

آتے ہوں گے۔ وہ اچھے لوگ نہ ہوں گے چنانچہ ہمیں یہاں بہت محتاط ہو کر رہنا پڑے گا۔ میں اس سلسلے میں ایک اور بات سوچ رہا ہوں۔"

"کیا؟" میں نے آہستہ سے کہا۔ یہ حقیقت ہے کہ ان معاملات میں عارف کا ذہن مجھ سے تیز تھا وہ حالات اور موقع کی نزاکت سمجھنے میں ملکہ رکھتا تھا۔

"یہ تو طے شدہ بات ہے، یہ جزیرہ بھی اسی علاقے میں ہے جس کی ہمیں تلاش تھی۔ اس کا اندازہ یہاں کے مقامی لوگوں سے ہو جاتا ہے چنانچہ ممکن ہے یہاں سے ابن فرخان کا پتہ مل جائے۔ ظاہر ہے پیشہ ور لڑکیاں بھی کہیں نہ کہیں سے ضرور آتی ہوں گی۔"

"اوہ ہاں۔" میں چونک پڑا۔ "یہ تو درست ہے۔"

"لیکن اس کے لئے ہمیں بہت محتاط ہو کر کام کرنا پڑے گا۔ آیئے تیاریاں کر کے باہر نکلتے ہیں، جزیرے کا ماحول دیکھنے کے بعد ہی اس سلسلے میں فیصلہ کریں گے اس کے علاوہ ہمیں یہاں کی کرنسی کی بھی ضرورت پڑے گی۔"

"وہ کہاں سے حاصل کرو گے؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔ اور عارف کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اس سلسلے میں فکر نہ کیا کریں بھائی جان، دنیا کے ہر خطے ہر علاقے میں میرے بنک موجود ہیں، چلتے پھرتے بنک جو باآسانی میری ضروریات پوری کر دیتے ہیں۔"

میں خاموش ہو گیا۔ حالات ہی ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ اب عارف تکلف نہیں کرتا تھا اس کی تمام کمزوریاں میرے سامنے تھیں اور میری اس کے سامنے، ہم دونوں ایسے عتاب کا شکار تھے جس کا سدباب ہمارے ہاتھ میں نہیں تھا، چنانچہ تکلف کی دیواریں خود بخود گر گئی تھیں۔ ایک گھنٹے تک ہم آرام کرتے رہے کشتی کے تکلیف دہ سفر نے ہمیں تھکا دیا تھا، لیکن تھکن کا احساس ہمارے لئے سم قاتل تھا جس وقت ہم تھکن کا احساس کر لیتے ہماری جدوجہد ختم ہو جاتی۔ اس لباس کے علاوہ ہمارے پاس کچھ نہ تھا جو ہم پہنے ہوئے تھے۔ یہ لباس بھی کافی خراب ہو گیا تھا لیکن مجبوری تھی۔ بہرحال ہم نے منہ ہاتھ وغیرہ دھویا اور پھر باہر نکل آئے۔ ہوٹل کے مالک کو ہم نے کچھ نہیں دیا تھا لیکن نہ جانے کیوں اس نے ہمارے اوپر اعتماد کر لیا تھا۔ ظاہر ہے ہمارے پاس سامان وغیرہ بھی نہیں تھا جو بطور ضمانت وہاں رہتا۔ بہرحال ممکن ہے یہاں ایسے لوگ نہ آتے ہوں جو کسی کا کچھ لے کر بھاگ جاتے ہوں۔ اس کے علاوہ اس چھوٹے سے جزیرے سے کسی کی نظروں سے بچ کر فرار ہونا بھی ناممکن تھا۔

ہم بازار نکل آئے۔ جزیرے کا اصل بازار دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ یہاں دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ چیزیں نہایت سستے داموں فروخت ہو رہی تھیں۔ ظاہر ہے سب اسمگلنگ کا سامان تھا۔ ہم اور عارف چلتے رہے بازاروں میں خاصا رش تھا۔ عارف ایک دکان پر رک گیا، یہاں ریڈی میڈ لباس موجود تھے۔ ایک سے ایک اعلیٰ درجے کا لباس۔ ہم چٹائیوں سے بنی ہوئی اس دکان میں داخل ہو گئے اور عارف یہاں میرے اور اپنے سائز کے لباس دیکھنے لگا۔ پھر اس نے دو تین جوڑے میرے لئے پسند کئے اور دو تین اپنے لئے۔ اور دکاندار سے انہیں پیک کرنے کے لئے کہا۔

میں حیرت سے عارف کی شکل دیکھنے لگا۔ کیونکہ ہمارے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ میرے نزدیک ابھی تک عارف نے کوئی کام بھی نہیں دکھایا تھا اس لئے وہ ادائیگی کہاں سے کرے گا۔ لیکن اس وقت میری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب دکاندار کے بل دینے پر عارف نے اندرونی جیب سے ایک اعلیٰ قسم کا پرس نکالا اور اس سے چند پونڈ نکال کر دکاندار کے سامنے ڈال دیئے۔ دکاندار نے کپڑوں کی رقم کاٹ کر بقیہ رقم واپس کر دی۔ اور ہم بنڈل بغل میں دبا کر دکان سے نکل آئے۔

"بٹوہ کہاں سے لے آیا؟" میں نے لوگوں سے الگ ہوتے ہی عارف سے پوچھا۔

"میں عرض کر چکا ہوں بھائی جان میرے ہتھ دنیا کے ہر حصے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ آئیے کسی مناسب جگہ چل کر ہم لباس تبدیل کر لیں" اور ہم کسی سنسان سی جگہ کی تلاش میں نکل پڑے۔ آخر ایک جگہ پہنچ کر ہم نے لباس تبدیل کئے، پرانے لباس وہیں چھوڑ دیئے اور باقی خریدے ہوئے لباس ہاتھ میں دبائے وہاں سے آگے بڑھ آئے۔ ابھی تک ہم نے صرف ایک بازار دیکھا تھا جب کہ وہاں چاروں طرف بازار ہی بازار تھے۔ نیا لباس بہت شاندار تھا۔ بہت سے لوگوں نے ہمیں تحسین آمیز نظروں سے دیکھا لیکن ہم کسی تاثر سے بے نیاز آگے بڑھتے رہے۔ پھر ایک جگہ سے کچھ سازوں کی آوازیں آ رہی تھیں، ہم اس طرف چل پڑے۔ ایک شامیانہ لگا ہوا تھا جس کے نیچے رقص ہو رہا تھا۔ ہم بھی دوسرے تماشائیوں کی طرح وہاں کھڑے ہو گئے۔ ایک طرف چھ سات لڑکیاں مختلف لباسوں میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے اداس تھے، آنکھوں سے غم جھانک رہا تھا۔

ایک لڑکی رقص کر رہی تھی۔ لیکن اس کی حیثیت مختلف تھی۔ میں نے معنی خیز نظروں سے عارف کی طرف دیکھا اور عارف سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"اگر میرا خیال غلط نہیں ہے بھائی جان، تو ان لڑکیوں کو فروخت کرنے کے لئے یہاں لایا گیا ہے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"گویا بن فرحان کا پتہ یہاں بخوبی چل سکتا ہے۔" عارف کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی۔ اس وقت رقص ختم ہو گیا اور ایک موٹے تازے جلاد نما آدمی نے بیٹھی ہوئی لڑکیوں میں سے ایک کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ پہلے اس نے نہایت وحشیانہ انداز میں لڑکی کے جسم کے نسوانی حصوں کی نمائش کی اور اس کے بعد اس کا نیلام شروع ہو گیا۔

بڑا عبرت ناک منظر تھا۔ ہمارے دل ڈوبنے لگے۔ کیا مظلوم شاہدہ کا بھی یہی حشر ہو چکا ہے۔ میں اور عارف ایک ہی انداز میں سوچ رہے تھے کیونکہ میں نے عارف کی آنکھوں میں خون کی چادر دیکھی، پھر وہ جذبات سے کپکپاتی آواز میں بولا۔

"بھائی جان، اگر شاہدہ کے ساتھ بھی یہی سلوک ہو چکا ہے تو خدا کی قسم۔ . . . ."

"جذباتی مت بنو عارف، ان بھیڑیوں سے تم اور کیا توقع کر سکتے ہو۔ ان کا کام یہی ہے۔ ہمیں ہوش و حواس سے کام لے کر کچھ کرنا ہو گا۔ تمہارے پاس کتنی رقم ہے؟"

"کافی ہے، کیوں؟"

"ہم ان میں سے ایک آدھ لڑکی خرید لیں گے، ان میں سے ہر ایک شاہدہ ہے۔ اگر ان کے بھائی بھی ہوں گے تو ہماری طرح ان کی تلاش میں سرگرداں ہوں گے۔" میں نے کہا میری آواز میں رقت پیدا ہو گئی تھی۔

"آپ یہاں رکئے بھائی جان۔" عارف نے کہا اور ایک طرف کھسک گیا۔ میں نے خاص طور سے اس کی طرف توجہ نہیں دی، کیونکہ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کرنے گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آ گیا۔ لڑکی کی بولی لگ رہی تھی اور وہ نڈھال سی کھڑی تھی۔ ہم دونوں خاموش کھڑے رہے۔ جب بولی اسّی پونڈ تک پہنچ گئی تو اس کے بعد کوئی آگے نہ بڑھا۔ نیلام کرنے والا کئی منٹ تک کوشش کرتا رہا اور جب بولی آگے ہی نہ بڑھی تو اس نے ہتھوڑی اٹھالی۔ وہ آخری ضرب لگانے ہی جا رہا تھا کہ عارف نے پچاسی ڈالر کہہ دیئے۔ تمام لوگ چونک کر عارف کی طرف دیکھنے لگے اور نیلام کرنے والے کی باچھیں کھل اٹھیں۔

آخری بولی عارف کے نام چھوٹ گئی اور اس نے قیمت

اواکر دی۔ فوراً ہی دوسری لڑکی کی بولی شروع ہوگئی۔ عارف کے
نام چھوٹنے والی لڑکی ہمارے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔ عارف
آہستہ سے میرے پاس آ کھڑا ہوا اور اس نے نوٹوں کی ایک
موٹی گڈی میری جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔
"اس بار بولی آپ چھڑائیں بھائی جان" یہ دوسری لڑکی
میں نے سو پونڈ میں خریدی۔ اور تیسری لڑکی کی بولی ہونے
لگی، اس طرح دو لڑکیاں میں نے اور دو عارف نے خریدیں۔
وہاں کھڑے ہوئے دلال خاص طور سے ہماری طرف متوجہ
ہوگئے اور ہمارے قریب پہنچ کر کانا پھوسی کرنے لگے۔
"یہاں ایک ہی اڈہ نہیں ہے جناب، اس سے کہیں
اچھا مال آپ کو پیش کیا جائے گا، براہ کرم یہاں سے چلیں"
ہم نے چار لڑکیاں خریدی تھیں۔ ظاہر ہے یہاں نہ
جانے کتنی لڑکیاں ہوں گی کیسے کیسے خریدیں گے اور ان کا انتظام
کیسے کریں گے۔ ہم تو خود ہی پریشان حال تھے۔ چنانچہ لڑکیوں
کو لے کر ہم یہاں سے چل پڑے۔
چاروں لڑکیاں ہندوستانی تھیں اور اردو بولتی تھیں۔
وہ خاموش ہمارے ساتھ چل رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں
آنسو تھے اور چہرے پر ضبط کے طوفان ـــ ہم ان کی
طرف دیکھ بھی نہیں رہے تھے۔ دلال بدستور ہمارے پیچھے لگے
ہوئے تھے۔ آخر عارف نے مجھ سے کہا۔
"آپ ان لوگوں کو لے کر چلئے بھائی جان، میں ابھی آتا
ہوں" میں نے گردن ہلائی اور لڑکیوں کے ساتھ ہوٹل کی
طرف چل دیا۔ ہوٹل کے مالک سے میں نے ایک اور بڑا کمرہ
حاصل کیا۔ اور لڑکیوں کو اس کمرے میں بھیج کر خود اپنے کمرے
میں آگیا۔ میں ان بدنصیبوں کی حالت پر غور کر رہا تھا، اس
کاروبار کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ نہ جانے کتنا وقت گزر
گیا۔ پھر عارف آگیا اس کے ہاتھوں میں کئی بنڈل تھے جنہیں
اس نے مسہری پر ڈال دیا۔ اس کے انداز سے تھکن نمایاں تھی۔

ناسمجھی

ایک شوہر جب یکایک گھر پہنچا تو اپنی بیوی کو اپنے
ایک دوست سے محبت کی باتیں کرتے پایا۔ شوہر نے غصے
میں چلّا کر کہا۔
"تم دونوں کیا کر رہے ہو؟"
"بیوی نے دوست سے کہا" [illegible] نہ کہتی تھی کہ
ان حضرت کو کچھ معلوم نہ ہوگا، دیکھنے پر بھی ان کی سمجھ
میں کچھ نہ آئے گا۔"

"ان بنڈلوں میں کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"ان لڑکیوں کے لئے کپڑے وغیرہ ہیں" عارف نے
جواب دیا اور نڈھال سا مسہری پر گر پڑا۔
"کیا بات ہے عارف؟" میں عارف کی غیر معمولی کیفیت
دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ عارف کی
پلکوں پر آنسو لرز رہے تھے میں اس کے آنسو دیکھ کر بے چین
ہوگیا۔ اور بے قراری سے اس سے احوال دریافت کرنے لگا ـــ
میرے دل میں نہ جانے کتنے وسوسے سر ابھار رہے تھے۔
"میں نے بن فرقان کے بارے میں ان دلالوں سے معلومات
حاصل کی تھیں بھائی جان" عارف افسردہ لہجے میں بولا۔
"پھر ـــ پھر کیا ہوا؟"
"اس کے مال فروخت کرنے کی بھی یہی جگہ ہے"
"اوہ ـــ تفصیل بتاؤ عارف، خدا کے لئے جلدی بتاؤ"
"ایک ہفتہ قبل وہ اپنی لائی ہوئی لڑکیاں فروخت کر کے
جا چکا ہے"
"فروخت کر کے جا چکا ہے ـــ کہاں؟"
"اس سلسلے میں کسی کو معلوم نہیں ہے" دلالوں نے بتایا
کہ وہ مال کی تلاش میں چلا گیا ہوگا"
"اس نے جن لڑکیوں کو فروخت کیا ہے، ان کے بارے

میں کسی کو کچھ معلوم ہے؟"

"اتنی معلومات یہاں کسی کو کسی کے بارے میں نہیں ہوتیں۔"

"بن فرقان کا کوئی آدمی مل سکتا ہے؟"

"میں نے اس بارے میں معلومات حاصل کی تھیں، لیکن یہاں اس کا کوئی آدمی نہیں ہے۔"

"ہوں" ۔۔۔ میں نے بجھے ہوئے دل سے کہا۔ عارف ابھی جذباتی تھا میرے اوپر اتنی مشکلات پڑی تھیں کہ میں بڑے سے بڑا غم سینے سے لگانے کا عادی ہو گیا تھا۔ کافی دیر تک میں گردن جھکائے مظلوم شاہدہ کے بارے میں سوچتا رہا ۔۔۔ دیوانی لڑکی کی ذرا سی لغزش نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ امید کی آخری شمع بھی گل ہو گئی تھی، شاہدہ فروخت ہو چکی تھی، وہ فروخت ہو کر کہاں گئی تھی، اس بارے میں کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔ اب ہمارے پاس اسے تلاش کرنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

کافی دیر تک ہم دونوں افسردہ بیٹھے رہے۔ پھر عارف نے مجھ سے سوال کیا۔

"اب کیا کریں گے بھائی جان؟"

"ہماری زندگی کا کوئی مصرف نہیں ہے عارف، جب تک خدا کی طرف سے موت نہیں آئے گی ہم مر بھی نہیں سکتے۔ کیوں نہ اس کا ایک نصب العین بنالیں۔"

"کیا؟" عارف نے پوچھا۔

"شاہدہ کی تلاش، ہم اسے تلاش کرتے رہیں گے مرتے وقت تک۔ موت آنے کے بعد ان جھگڑوں سے بے نیاز ہو جائیں گے۔" میں نے مایوسی سے کہا لیکن عارف کی آنکھوں میں شمعیں جل اٹھیں۔

"بالکل ٹھیک ہے بھائی جان، ہمیں ایک نئے عزم سے کام کرنا چاہئے۔ یہ بردہ فروشوں کا جزیرہ ہے۔ بن فرقان یا اس کا کوئی ساتھی یہاں ضرور آئے گا۔ ہم یہاں کے چکر لگاتے رہیں گے۔ ہم دوسری جگہوں سے دولت سمیٹیں گے، یہاں بڑے پیمانے پر مظلوم لڑکیوں کو خریدیں گے اور آزاد کریں گے۔ ممکن ہے ان میں سے کسی کی دعا ہمارے کام آجائے، یہ سب ہماری شاہدائیں ہیں بھائی جان۔ ہم ان شاہداؤں کو زیادہ سے زیادہ آزاد کرائیں گے اس وقت تک جب تک بن فرقان کا پتہ نہ چل جائے۔"

"عمدہ خیال ہے عارف!" میں نے بجھے دل سے کہا۔ عارف کا دل رکھنا تھا ورنہ میرا دل تو اس خبر سے بجھ گیا تھا۔

"ارے ہاں، ان لڑکیوں کا کیا حال ہے، ان کے لباس انہیں دے دیں اور ان سے گفتگو کریں، نہ جانے غریب کہاں کہاں سے آئی ہیں۔" عارف نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

ہم دونوں اس کمرے میں پہنچ گئے۔ جہاں چاروں لڑکیاں اداسی سے سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر ان کی آنکھوں میں خوف کے تاثرات ابھر آئے۔

عارف نے کپڑوں کے پیکیٹ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "ہم تمہارے لئے کپڑے لائے ہیں، کیا تم اپنے بھائیوں کی طرف سے یہ تحفے قبول نہیں کرو گی؟"

لڑکیوں کو شاید اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ لفظ بھائی ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ ایک لڑکی مضطربانہ انداز میں کھڑی ہو گئی۔

"کیا کہا ۔۔۔ تم نے کیا کہا ۔۔۔ خدا کے لئے دوبارہ کہو۔ یہ تحفے تم ہمیں کس حیثیت سے دے رہے ہو؟"

"بھائیوں کی حیثیت سے، تم ہماری بہنوں کی طرح ہو، سگی بہنوں کی طرح، کیا تمہیں اعتراض ہے؟"

"پھر سے کہو، خدا کے لئے پھر سے کہو!" لڑکی بلک پڑی اس کی ہچکیاں بندھ گئیں، دوسری لڑکیوں کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

"میری بہن! مجھے غم ہے کہ میرے ہم جنسوں نے تمہارے

ساتھ یہ سلوک کیا۔ گھروں کی زینت کو بازار میں سستی اشیا کی طرح لے آئے۔ میرا سر تمہارے سامنے شرم سے جھکا ہوا ہے۔"
عارف نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔
"بھیا" لڑکی اس سے لپٹ گئی۔ دوسری لڑکیاں بھی اٹھ کر ہمارے گرد کھڑی ہوگئیں۔ ان کی آنکھوں میں امید کی مسکراہٹیں پیدا ہوگئی تھیں۔ لڑکی عارف سے لپٹی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ میں بھی جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور میں نے دونوں بازو پھیلا کر تینوں لڑکیوں کو ان میں سمیٹ لیا۔ وہ سب میرے سینے سے لپٹی ہوئی سسک رہی تھیں۔ اور میں درد بھرے دل سے اس معصوم جنس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔
کئی منٹ تک یہ رقت آمیز منظر جاری رہا۔ پھر ہم نے انہیں تسلیاں دے کر مسہریوں پر بٹھایا۔ ان کی آنکھوں میں بے شمار سوال رقص کر رہے تھے۔ میں نے ان سوالوں کو پڑھا اور بولا۔
"تم لوگ بالکل فکر مت کرو، ہم تمہیں کسی مناسب جگہ لے چلیں گے اور وہاں سے تمہارے گھروں پر جانے کا بندوبست کر دیں گے۔ کیا تم اپنے بارے میں بتاؤ گی؟"
سب کی کہانی ایک جیسی تھی۔ وہ سب اچھے گھرانوں کی لڑکیاں تھیں۔ کچھ نادانی میں راستوں سے بھٹک گئی تھیں۔ ایک ہندو لڑکی جس کا نام وسنتی تھا، بمبئی سے ہی لائی گئی تھی۔ بمبئی کا نام سن کر میں چونک پڑا۔
"تمہیں بمبئی سے کب لایا گیا؟"
"تقریباً ڈیڑھ ماہ ہوا بمبئی سے مجھے دوبئی لے جایا گیا اور پھر وہاں سے یہاں لایا گیا۔"
"کون لایا تھا، کیا تم اس کا نام بتا سکتی ہو؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔
"اس بردہ فروش کا نام بن فرقان تھا۔"
"بن فرقان" میرے ذہن میں دھماکا ہوا۔ عارف بھی

خبر

ہوائی جہاز کے ایک مسافر سے ہوسٹس نے کہا۔
"پتہ نہیں یہ کیوں کر ہوا، لیکن ہے افسوس ہی کی بات کہ ہم آپ کی بیوی کو جہاز کے پچھلے اسٹاپ ناگپور ہی پر چھوڑ آئے۔"
مسافر بولا "خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے، میں تو سمجھا تھا کہ میں بہرہ ہوگیا ہوں۔"

اچھل پڑا۔ "کیا تمہارے ساتھ کچھ اور لڑکیاں بھی تھیں؟"
"ہاں، تین لڑکیاں اور لائی گئی تھیں۔"
"کیا ان میں شاہدہ نام کی کوئی لڑکی تھی؟ ہم دونوں کا چہرہ دیکھو، شاہدہ ہماری شکل سے ملتی جلتی تھی۔"
"ہاں، شاہدہ ان میں موجود تھی۔ اس نے مجھے اپنی کہانی سنائی تھی وہ تاراگڑھ ۔۔۔" ابھی اس نے جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ عارف لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔
"وہ تاراگڑھ کی رہنے والی تھی نا۔"
"ہاں۔ ایک ہندو اسے بہکا کر بھگا لایا تھا۔ وہ مسلمان تھی، ہندو سے اس کے حمل ہوگیا تھا۔ بمبئی آکر اس نے حمل استقاط کرایا اور پھر کچھ دن رکھنے کے بعد بن فرقان کے ہاتھ فروخت کر دیا۔"
"شاہدہ کہاں ہے وسنتی۔ خدا کے لئے اس کا پتہ بتا دو۔ ہم تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولیں گے۔" عارف نے وسنتی کے دونوں شانے پکڑ کر دیوانہ وار جھنجوڑتے ہوئے کہا۔
وسنتی اس کے اس انداز پر سہم گئی اور لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے اس کے بارے میں نہیں معلوم۔ بن فرقان نے اسے نیلام کر دیا تھا۔"
"کب نیلام کیا تھا، کس کے ہاتھ نیلام کیا تھا، کون تھا وہ

جس نے میری بہن کو خریدا تھا!" عارف درد میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔

"وہ تمہاری بہن تھی؟"

"ہاں وسننی، ہم اس بدنصیب کو تلاش کرتے در در مارے پھر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں بھی اسی کے ساتھ تھی۔ تمام لڑکیاں نیلام ہو گئیں شاہدہ کو بھی ایک شیخ نے خرید لیا۔ میں اس شیخ کے بارے میں نہیں جانتی۔ صرف میں رہ گئی تھی، اس لئے بن فرقان نے مجھے اس دوسرے بردہ فروش کے ہاتھوں فروخت کیا اور یہاں سے چلا گیا۔"

"بن فرقان کہاں گیا؟ اس بارے میں کچھ معلوم ہے۔"

"میں نے ایک رات بن فرقان کے آدمیوں کی گفتگو سنی تھی وہ کہہ رہے تھے کہ اس بار وہ کابل جا رہے ہیں کسی بڑے شیخ نے کچھ کابلی لڑکیوں کی فرمائش کی تھی۔ بلکہ اسی وجہ سے بن فرقان نے مجھے دوسرے بردہ فروش کو دے دیا تاکہ وہ اس دوسرے کام کے لئے روانہ ہو سکیں۔"

"کابل" عارف نے میری طرف دیکھا۔

"ہم کابل چلیں گے عارف، خواہ کچھ بھی ہو ہم فوری طور پر کابل چلیں گے۔" میں نے کہا۔ اور پھر ان لڑکیوں سے بولا۔ "تم لوگ بے فکری سے یہاں رہو، ہم تمہیں کسی ایسی جگہ بھیج دیں گے جہاں سے تم اپنے اپنے شہروں کو روانہ ہو سکو۔"

لڑکیوں کو دلاسہ دینے کے بعد ہم اپنے کمرے میں واپس آ گئے۔ ہمارے ذہنوں میں ہل چل مچی ہوئی تھی۔ اس وسیع و عریض علاقے میں ہم اس شیخ کو نہیں تلاش کر سکتے تھے لیکن اگر بن فرقان مل جاتا تو شاید شاہدہ کا کچھ پتہ چل سکتا۔ عارف میرے خیال پر کچھ الجھا ہوا تھا، وہ سوچ رہا تھا کہ کابل تک جانے میں کافی وقت صرف ہو سکتا ہے اور اس دوران ممکن ہے بن فرقان اپنا کام کر کے وہاں سے چل پڑے لیکن میرے ذہن میں کابل جانے کی دھن سمائی ہوئی تھی۔

چنانچہ میں تھوڑی دیر کے بعد عارف کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ہماری کشتی چھوٹی سی تھی۔ اور چھ آدمی اس میں سوار ہو کر نہیں جا سکتے تھے۔ اس لئے دوسری کشتی کا کوئی بندوبست کرنا تھا۔ ہم کچھ لوگوں سے ملے، یہاں ایسا کام ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں تھی کیونکہ کرائے کے اسٹیمر ان لوگوں کو یہاں سے ان کی مطلوبہ جگہوں پر چھوڑ دیتے تھے جن کے پاس اپنی کشتیوں کا بندوبست نہ ہوتا۔ ایک دلال نے کچھ رقم کے عوض ہمیں ایک ایسی کمپنی کے اڈے پر پہنچا دیا جو یہ کام کرتی تھی۔

کمپنی کے منیجر نے بتایا کہ فوری طور پر اس کا ایک اسٹیمر ایک بڑے شہر جا رہا ہے لیکن سواریاں پوری ہونے کا انتظار ہے۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ اگر پورے اسٹیمر کو ہم اپنے استعمال میں رکھیں تو کیا خرچ ہو گا۔ وہ رقم ایسی نہیں تھی کہ ہم نہ دے سکتے۔ چنانچہ ہم نے فوراً ایک اسٹیمر انگیج کر لیا۔

اور دوسرے دن ایک چھوٹا سا خوبصورت اسٹیمر ہم لوگوں کو لے کر چل پڑا۔ لڑکیوں کے چہروں سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ لیکن ہمارے دل بدستور رنج و غم میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کاش شاہدہ بھی یہاں مل جاتی۔ اسٹیمر سفر کرتا رہا۔ اسٹیمر کا کپتان ایک خوبصورت نوجوان عرب تھا۔ راستے میں ہم اس سے کافی بے تکلف ہو گئے۔ عرب نے ہم سے پوچھا کہ ہماری منزل کون سی ہے۔

"ان لڑکیوں کو ہندوستان بھیجنا ہے اور ہم افغانستان جانا چاہتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا آپ کے پاس اس سفر کے لئے پاسپورٹ وغیرہ کا بندوبست ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، وہاں جا کر بندوبست کریں گے۔ کیوں تم نے یہ سوال کیوں کیا؟"

کپتان ہنسنے لگا، پھر بولا۔" ایسے ہی معلوم کر رہا تھا۔ ایسی کچھ کمپنیاں میرے علم میں ہیں جو یہ کام کرتی ہیں۔ میں نے سوچا شاید یہی تمہارے کام آجائیں۔"

" یعنی ہمیں پاسپورٹ وغیرہ آسانی سے مل سکتے ہیں۔"

" دولت چاہیئے جناب، دنیا کا کون سا کام رکتا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

" اگر تم ہمارا یہ کام کرا دو تو ہم تمہیں منہ مانگی قیمت دیں گے۔ لیکن کام ایسا ہو کہ کسی طرح پھنسنے کا امکان نہ رہے۔" عارف نے کہا، اور کپتان پھر ہنسنے لگا۔

" دولت سے ہی آدمی پھنستا بھی ہے اور دولت ہی سے نکل جاتا ہے، جو کام تمہیں کرا کے دوں گا اس میں ذرہ برابر پھنسنے کے امکانات نہیں ہوں گے، لیکن میں اس کام کے دو ہزار ڈالر لوں گا کسی بھی کرنسی میں ہوں رقم دو ہزار ڈالر ہو گی۔"

" مجھے منظور ہے۔" عارف جلدی سے بولا۔

" تب ٹھیک ہے، ایک ہزار ڈالر میرے اور ایک ہزار میرے باقی ساتھیوں کے۔ پاسپورٹ کی جو رقم ہو گی وہ الگ سے دینا ہو گی۔" کپتان نے کہا، اور عارف نے منظور کر لیا۔

میرا دل ڈوب رہا تھا، عارف ہی تو میرا سہارا ہے اگر رقم حاصل کرنے کے چکر میں وہ پھنس گیا تو پھر میرا کیا ہو گا۔ یہ دنیا میرے لئے پھر تاریک ہو جائے گی۔ مایوسی کے اندھیروں میں بھٹکنے کے بعد عارف کے ساتھ تے امید کی کچھ کرنیں جگمگا دی تھیں اگر وہ بھی گم ہو گئیں۔

" کیا سوچ رہے ہیں بھائی جان۔" عارف نے میرے چہرے پر چھائی ہوئی فکر کی گھٹاؤں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

" اتنی رقم کا بندوبست کہاں سے کرو گے عارف، نہ جانے کیا خرچ ہو۔"

" کیا آپ میرے ہنگوں سے مطمئن نہیں ہیں بھائیجان؟" عارف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

" نہیں عارف میں مطمئن نہیں ہوں۔ خدانخواستہ کبھی پھنس گئے تو میں کیا کروں گا، تمہارے سہارے تو زندہ ہوں۔"

" بڑے بول ہے، توبہ کرتا ہوں بھائی جان، کم از کم اس سلسلے میں تو نہیں پھنس سکتا۔ میرا استاد بھی میری صفائی کا لوہا مانتا تھا، اور میرے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد کف افسوس ملتا رہ گیا تھا۔"

" پھر بھی عارف۔"

" اس کے علاوہ وہ ہمارے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں ہے بھائی جان۔" عارف نے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔

عارف درست ہی کہہ رہا تھا اس کے علاوہ اور ذریعہ بھی کیا تھا۔ میں اکیلا ہوتا تو یہ سب کچھ کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں خاموش ہو گیا۔ ڈھائی دن کے سفر کے بعد ہم ایک سنسان ساحل پر پہنچ گئے۔ ان لوگوں نے جتنا بڑا جال پھیلایا تھا اس کا جواب نہیں تھا۔ ساحل سے ایک وین ہمیں لے کر شہر آ گئی اور اس عظیم الشان شہر کے ایک خوبصورت ہوٹل میں مقیم ہو گئے۔ کپتان نے تمام ذمہ داری اپنے سر لی تھی۔ ہم لوگ صرف ہوٹل تک محدود رہے، البتہ عارف صرف ایک دن ہوٹل سے باہر گیا اور رات کو گیارہ بجے جب وہ ہوٹل واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک چرمی بیگ تھا۔ اس نے بیگ میرے سامنے کھول دیا، اور میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ بیگ نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔

" کیا تم نے کسی بنک میں ڈاکہ ڈالا ہے عارف؟"

" نہیں بھائی جان۔ حالات ایسے ہیں کہ میں کوئی خطرے کا کام نہیں کر سکتا۔ آج ایک دوسرے استاد کا نام لے کر کام شروع کیا تھا۔ ایک بڑے کا پرس اڑایا، اس میں چار ہزار ڈالر کے نوٹ تھے، انہیں لے کر ایک جوئے خانے میں پہنچ گیا۔ بڑے اعلیٰ پیمانے پر جوا ہوتا ہے بھائی جان، اور مزے کی بات یہ ہے کہ لوگ بڑی ایمانداری سے کھیلتے ہیں، ایسے سیدھے

لوگ تھے بے چارے کہ انہوں نے میرے بے تحاشا جیتنے پر
پر بھی یہ نہ سوچا کہ میں کارڈ لگا رہا ہوں۔ جوئے خانے کے
بینک مینیجر نے مجھے گولڈ کے عوض رقم دیتے ہوئے زبردست
مبارکباد دی تھی۔ ویسے اس شہر میں یہ رقم جیت جانا کوئی
بہت بڑی بات نہیں ہے۔"

"گویا تم شارپنگ بھی کر لیتے ہو"۔ میں نے اسے گھورتے ہوئے
کہا اور عارف شرارت آمیز انداز میں مسکرانے لگا۔

دوسرے دن آٹھ بجے کپتان میرے پاس آیا اس کے
ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی "سب لوگ میرے ساتھ چلو تصویریں
لینا ہے، باقی بات جیت ہو گئی ہے۔ پانچ ہزار ڈالر خرچ ہوں گے۔
دو ہزار میرے، گویا کل سات ہزار ڈالر۔ کام ایسا ہے کہ کوئی
کھٹکا ہی نہیں رہے گا۔"

"ٹھیک ہے ایسا ہی کام ہونا چاہیئے"۔ میرے بجائے عارف
نے کہا، اور ہم سب اس کے ساتھ چل پڑے۔ چوتھے دن کپتان
نے ہمارے پاسپورٹ ہمارے حوالے کر دیئے اور رقم لے کر چلتا بنا۔
"پھر کبھی ضرورت پڑے تو مجھے یاد رکھنا، ہر کام چٹکیوں میں کرا
دوں گا"۔ اس نے چلتے چلتے کہا تھا۔

پاسپورٹ ہمیں مل گئے تھے۔ ہمارے لئے تو ایک ایک
پل بھاری تھا۔ ہم نے ہر جگہ زیادہ سے زیادہ رقم خرچ کر کے
کام کرایا۔ لڑکیوں کے ایک جہاز سے ان کے وطن کے ٹکٹ
بنوائے۔ سوار ہوتے وقت انہوں نے خلوص دل سے ہمیں دعائیں
دیں اور کہا تھا کہ ہماری مرادیں پوری ہوں۔ انہیں روانہ
کرنے کے بعد ایک طیارے سے ہم بھی چل پڑے۔ طیارہ
براہ راست کابل نہیں جاتا تھا۔ ایک دوسرے ملک سے ہمیں
طیارہ بدلنا تھا۔ بہر حال پاسپورٹ بالکل درست تھے ہمیں اس
سلسلے میں کوئی دشواری نہ ہوئی اور پانچویں دن ہم کابل پہنچ گئے۔

یہاں ہم بالکل اجنبی تھے لیکن ہمارے پاس کافی فارن
ایکسچینج موجود تھا اور دولت کی قوت تمام اجنبیت دور کر
دیتی ہے۔ ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں ہم نے قیام کیا۔ رات
ہو چکی تھی۔ اس لئے بن فرقان کی تلاش کا کام ہم نے دوسرے
دن پر ملتوی کر دیا ویسے رات گئے تک ہم اسے تلاش کرنے کا
پروگرام بناتے رہے تھے۔

اتنے بڑے شہر میں کسی ایسے آدمی کو تلاش کر لینا معمولی کام
نہیں تھا اور پھر بن فرقان ایک جرائم پیشہ شخص تھا۔ اگر کوئی
عام آدمی ہوتا تو اس کے حصول کے لئے کوئی دشواری پیش نہ
آتی، لیکن بن فرقان!

لیکن جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ عارف ایک ذہین ترین
انسان تھا۔ اپنی ذہانت سے کام لیتے ہوئے اس نے یہاں بھی
بالکل نئے انداز سے کام کیا۔ اس نے یہاں کے تمام روزناموں
میں ایک اشتہار نکلوایا۔ اشتہار کا مضمون یہ تھا۔

"گمشدہ بھائی کی تلاش

بن فرقان جس کے بارے میں اطلاع ملی ہے کہ وہ یہاں
موجود ہے، جہاں کہیں بھی ہو ہوٹل "تغلق" کے کمرہ نمبر چالیس
میں پہنچ جائے۔ اس کے دو بھائی اس کی تلاش میں یہاں آئے
ہیں ـــــ"

اس اشتہار کے علاوہ عارف نے ایسی جگہوں پر اس کی
تلاش شروع کر دی جو جرائم پیشہ افراد کا گڑھ تھیں۔ ایسی جگہوں
پر تو بن فرقان نہ ملا لیکن اشتہار والی ترکیب کامیاب رہی۔
مسلسل تین روز سے اشتہار چھپ رہا تھا، تیسرے روز رات
کو کسی نے ہمارے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

میں نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ ایک آدمی اوور کوٹ
پہنے کالر چڑھائے کھڑا تھا۔

"مسٹر عارف یہاں رہتے ہیں"۔

"ہاں، اندر آجایئے"۔ میں نے اخلاق سے کہا حالانکہ
میرا دل دھاڑ دھاڑ کر رہا تھا۔

"میں آپ کے گمشدہ بھائی کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں"۔

"ہم سمجھ گئے، اندر تشریف لے آیئے۔" میں نے کہا اور وہ اندر آ گیا۔ اس کا ہاتھ اوورکوٹ کی جیب میں تھا اور یقیناً اس میں پستول موجود ہو گا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ بھی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ آنے والے کا چہرہ ابھی تک فیلٹ کے نیچے پوشیدہ تھا۔

"کیا عمر تھی آپ کے بھائی کی؟" اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ہم عمر کا تعین نہیں کر سکتے، ویسے اگر تم بن فرقان ہو تو ہمیں تمہاری تلاش تھی۔" عارف نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیوں؟" اس نے پراسرار انداز میں پوچھا۔

"ہم اس جزیرے سے آ رہے ہیں جہاں تم مال فروخت کرتے ہو۔"

"کون سا مال؟"

"لڑکیاں ——— بہرحال اس ذکر کو چھوڑو، ہمیں ایک لڑکی کی تلاش ہے اگر تم صرف اس کا پتہ بتا دو، تو ہم تمہیں اتنی ہی قیمت مزید دیں گے جتنے میں تم نے اسے فروخت کیا ہے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو، کیسی لڑکیاں کون سا جزیرہ ——— شاید تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں تم سے تمہارے اشتہار کے بارے میں گفتگو کرنے آیا تھا اور تم نے بے تکی گفتگو شروع کر دی۔" آنے والے نے جھلاتے ہوئے کہا۔

"تب تم ہمارے مطلوبہ آدمی نہیں ہو سکتے ——— جاؤ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں ہے اور اگر تم وہی ہو اور صرف بن رہے ہو تو ——— یقین اس طرح کر لو۔" عارف نے چرمی بیگ اٹھا لیا جس میں اب بھی کافی نوٹ موجود تھے اور جسے عارف نہایت صفائی سے نکال لایا تھا۔ اس نے بیگ کھول کر اس کے سامنے کر دیا اور بولا۔

"اس میں سے کم از کم آدھی گڈیاں تمہاری ہو سکتی ہیں۔"

اس نے فیلٹ اونچا کر کے چاروں طرف دیکھا اور پھر دھیمے لہجے میں بولا "تم میں سے ایک کو میرے ساتھ چلنا ہو گا۔"

"کہاں؟"

"بن فرقان کے پاس، میں اس کا نمائندہ ہوں۔"

"وہ کہاں ہے؟" عارف نے جلدی سے پوچھا۔

"ایک مقامی ہوٹل میں مقیم ہے، میں خود تمہیں اس کے پاس لے چلوں گا۔"

"میں ان کے ساتھ جا رہا ہوں بھائی جان آپ میرا انتظار کریں۔" عارف کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

"نہیں عارف ہم دونوں ہی چلیں گے اگر بن فرقان سے بات ہو جاتی ہے تو اسی وقت معاملہ طے کر لیں گے۔" میں نے کہا اور عارف ہچکچاتے ہوئے انداز میں میری شکل دیکھنے لگا۔ میں نے اس شخص کی موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "اس رقم کی فکر مت کرو، دولت سے ہمیں دلچسپی نہیں ہے، ہم اسے ساتھ لے چلیں گے۔ اوّل تو ہم موم کے بنے ہوئے نہیں ہیں، دوم ہم خود یہ رقم بن فرقان کو دے رہے ہیں، چنانچہ اس کی فکر کرنا بے سود ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" عارف نے ایک گہری سانس لے کر کہا اور ہم دونوں نے لباس تبدیل کر لیا۔ نوٹوں کی گڈیاں نکال کر جیب میں ٹھونسیں اور تیار ہو کر نووارد کے ساتھ چل پڑے۔ نیچے اس کی کار موجود تھی۔ ہم دونوں پچھلی نشست پر بیٹھ گئے اور اس نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ کار آگے بڑھ گئی۔

میں خود بھی اس سلسلے میں اپنی جلد بازی کو محسوس کر رہا تھا۔ ممکن ہے وہ شخص رقم کے لالچ میں ہمیں کہیں لے جا رہا ہو۔ ہمارے پاس پستول وغیرہ بھی نہیں تھا۔ ایسی حالت میں ہم بآسانی چوٹ کھا سکتے تھے لیکن اب اس سلسلے میں سوچنا بے کار تھا۔ میں تو خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ چکا تھا لیکن عارف کا مسئلہ تھا۔ نہ جانے اس کے خیالات کیا ہوں۔ کار دوڑتی رہی اور اسی رفتار سے میرا ذہن دوڑتا رہا۔ یہاں تک کہ کار ایک خوبصورت

ہوٹل کے لان میں داخل ہو گئی۔ پارکنگ میں کار کھڑی کر کے
اس نے ہمیں نیچے اترنے کے لئے کہا۔ اور پھر ہمارے آگے آگے
چلتا ہوا ہوٹل کے اس حصے کی طرف بڑھ گیا جہاں لفٹ لگی
ہوئی تھی۔ لفٹ نے ہمیں تیسری منزل پر چھوڑ دیا۔ ایک
راہداری میں چند قدم چل کر ہم تینوں ایک کمرے کے سامنے
رک گئے، اس شخص نے دروازے پر دستک دی۔ دستک دینے
کا انداز مخصوص تھا۔ چند ساعت کے بعد دروازہ کھل گیا۔
دروازہ کھولنے والا عربی لباس میں ملبوس تھا۔ اس نے ہم دونوں
کو غور سے دیکھا اور پھر دروازے سے ہٹ گیا۔ ہم کمرے میں
پہنچ گئے۔ اعلیٰ درجے کے فرنیچر سے آراستہ کمرے کے عین درمیان
پڑے ہوئے صوفے پر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ ایک بھاری بھرکم
عرب جس کی جسامت کسی دیو سے کم نہیں تھی۔ سیاہ چہرے
پر سیاہ داڑھی اور بڑھی ہوئی مونچھیں بے حد خطرناک لگ
رہی تھیں۔

یہی بن فرقان تھا۔ ہمیں ساتھ لانے والے نے عربی
میں کافی دیر تک اس سے گفتگو کی۔ اس دوران میں اور عارف
کھڑے ہی رہے تھے۔ عارف کی آنکھوں کے بدلتے ہوئے رنگ
کو میں نے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے ضبط کرنے
کا مشورہ دیا۔ ظاہر ہے بن فرقان نے شاہدہ کو فروخت
کیا تھا، وہی بہت سی معصوم لڑکیوں کی زندگی تباہ کرنے کا
ذمہ دار تھا۔ اسے دیکھ کر غصہ آنا لازمی بات تھی لیکن اس
وقت حالات ایسے تھے کہ خود پر قابو رکھنا بے حد ضروری تھا۔
بن فرقان سے ہمیں شاہدہ کا پتہ معلوم کرنا تھا۔

پھر بن فرقان ہماری طرف رخ کر کے انگریزی میں
بولا "بیٹھ جاؤ" ہم دونوں خاموشی سے بیٹھ گئے ــــ "میں
انگریزی میں بول سکتا ہوں، انگریزی میں گفتگو کرو، تم کیا
چاہتے ہو؟"

"ہم تم سے ایک لڑکی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا
چاہتے ہیں۔"

"پہلے یہ بتاؤ، وہ لڑکی تمہاری عزیز تھی؟"

"ہاں، بہت عزیز۔" میں نے حسرت سے کہا۔

"ٹھیک ہے، وہ کون تھی کہاں تھی، اور تمہیں کیسے شبہ ہوا
کہ وہ کبھی میرے پاس تھی؟"

"پچھلی بار تم بمبئی گئے تھے تم نے وہاں ایک ہندو جس کا
نام دیپ چند تھا سے اسے خریدا تھا مسلمان لڑکی تھی اور اس
کا نام شاہدہ تھا۔"

"ٹھیک ہے آگے کہو۔"

"وہی ہماری مطلوبہ لڑکی ہے، وہ ہماری بہن ہے اور ہم اس
کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ تمہاری تلاش میں ہم
دوبئی گئے جہاں سے ایک جزیرے پر جہاں لڑکیاں فروخت
ہوتی ہیں وہاں سے ہمیں پتہ چلا کہ تم کابل آئے ہو، چنانچہ ہم
وہاں سے یہاں آرہے ہیں۔"

"خوب، بہت خوب، بمبئی میں تمہیں میرے بارے میں
کس نے بتایا؟"

"دیپ چند نے۔"

"اوہ، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، ہاں تو دوست، اس میں
میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نے اسے اغوا نہیں کیا تھا۔ کسی
نے اسے میرے ہاتھ فروخت کیا میں نے اسے تھوڑے سے منافع
سے بیچ دیا۔ بہرحال اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ اسے تم نے کس کے ہاتھوں فروخت
کیا تھا۔ سنو بن فرقان، ہم تمہیں صرف اس کا پتہ بتانے کی اتنی
قیمت دے سکتے ہیں جتنے میں تم نے اسے فروخت کیا ہوگا۔"
عارف نے کہا۔ وہ اب تک انتہائی چالاکی سے گفتگو کرتا رہا
تھا اور اپنی گفتگو سے اس نے بن فرقان کو کسی قسم کا شبہ نہیں
ہونے دیا تھا۔

"خوب، کسی چیز کی قیمت ادا کرنا بہت اچھی عادت ہے۔

ہاں تو دوست تم اس کا پتہ بتانے کی کیا قیمت دے سکتے ہو۔"

"کیا مانگتے ہو؟"

"پانچ ہزار ڈالر۔" بن فرقان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"منظور ـــــ" عارف جلدی سے بول پڑا۔

"ایک سودا اور کرو، اس دوسرے سودے کے ساتھ ہی یہ سودا بھی طے ہو سکتا ہے۔" بن فرقان نے کہا۔ اس خونخوار آدمی کے چہرے سے ایسی کراہت ہو رہی تھی کہ دل چاہ رہا تھا اس کی بوٹیاں چبا ڈالی جائیں لیکن افسوس ہم دونوں ہی ایسا کرنے سے مجبور تھے۔ ہم اس کی منحوس شکل سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ چند منٹ سوچتا رہا پھر بولا۔

"لڑکی ایک شیخ نے خریدی تھی، بے پناہ دولت مند شیخ ہے میرا مستقل گاہک۔ اسی لئے وہ مجھے یاد ہے ورنہ جانے کتنے سودے کرتا ہوں۔ کتنے ملک کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، سب کو بھول جاتا ہوں، ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ شیخ میرا پرانا واقف ہے، میں اس کی عادت بھی جانتا ہوں جو چیز اسے پسند آ جائے اسے ہر قیمت پر خرید لیتا ہے اور پھر دنیا کی کوئی طاقت وہ چیز اس سے حاصل نہیں کر سکتی۔ وہ لڑکی میرا مطلب تمہاری بہن سے ہے اس نے بڑے شوق سے خریدی تھی مجھے یقین ہے کہ وہ اسے آسانی سے واپس کرنے پر تیار نہ ہو گا۔ اسے صرف میں ہی اس سے حاصل کر سکتا ہوں ـــ صرف میں ـــ میں اسے ایسی پٹی پڑھاؤں گا کہ وہ اس لڑکی کو واپس دینے پر تیار ہو جائے۔ اگر اس نے اسے واپس نہ کیا تو جس طرح دوسری لڑکیاں آسانی سے میرے قبضے میں آ جاتی ہیں اسی طرح وہ لڑکی بھی دوبارہ میرے قبضے میں آ سکتی ہے ـــ کیا خیال ہے۔"

"ٹھیک ہے ـــ وہ لڑکی ہمیں دلا دو۔"

"پندرہ ہزار ڈالر دینے ہوں گے اس کے، کیا خیال ہے، کل ملا کے بیس ہزار ڈالر۔ میرا خیال ہے ایک بہن کی یہ قیمت زیادہ نہیں ہے۔"

"ہمیں منظور ہے بن فرقان لیکن کیا تم وعدے کی پابندی کرو گے؟" عارف نے پوچھا۔

"مرد کا وعدہ ایک، بن فرقان کو عورت کہنے والے نے آج تک جنم نہیں لیا۔"

"ہمیں کیا کرنا ہو گا؟"

"صرف تین دن انتظار، میرا کام ختم ہو چکا ہے تیسرے دن ہم خشکی کے راستے یہاں سے ایران نکل چلیں گے۔ اور پھر وہاں سے واپس اس جگہ جہاں تمہاری بہن موجود ہے۔ پہلے میں تمہاری بہن کو حاصل کر کے تمہارے حوالے کر دوں گا اور اس کے بعد اپنا دوسرا کام کروں گا۔"

"ٹھیک ہے شیخ۔ یہ گڈیاں سنبھالو اور گنو کتنی ہیں ـــ" عارف نے کہا اور جیب سے نوٹوں کی گڈیاں نکالتے ہوئے مجھے بھی اشارہ کیا اور میں نے بھی نوٹ نکال کر بن فرقان کے سامنے ڈھیر کر دیئے۔ تیرہ ہزار ڈالر تھے باقی رہے سات ہزار ان کے لئے عارف زیادہ فکر مند نہیں تھا۔ "سات ہزار ڈالر کے علاوہ پانچ ہزار ہماری طرف سے بن فرقان، کام ہوتے ہی یہ رقم ادا کر دی جائے گی۔"

"سودا منظور ـــ" بن فرقان نے نوٹ سمیٹتے ہوئے کہا اور پھر گڈیاں ایک طرف رکھ کر ہماری طرف ہاتھ بڑھایا۔ "بن فرقان ایسے لوگوں کے لئے دل و جان سے کام کرتا ہے جو اس پر اعتبار کرتے ہیں، آج سے تم اس کے مہمان ہو۔ تمہارا سامان یہاں منگوا لیا جائے گا، شاید یہاں رہ کر تمہیں خوشی ہو، یہ ہوٹل تمہارے خادم ہی کا ہے دنیا کے بیشتر ملکوں میں میرے ایسے ہی ہوٹل موجود ہیں۔ یہ میرے پیشے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔"

میں خاموش رہا لیکن عارف بن فرقان میں بہت دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ کافی دیر تک بن فرقان سے گفتگو کرتا رہا۔ بہرحال اس خطرناک آدمی سے عارف کی خاصی دوستی ہو گئی۔

بن فرقان نے اسی ہوٹل میں ہمارے لئے ایک کمرہ

خالی کروا دیا اور ہم اس میں مقیم ہو گئے۔ عارف کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا کہ وہ بن فرقان کے ساتھ ہی لگا رہتا۔ دوسرے دن اس نے مجھے بتایا کہ اس نے بن فرقان کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کر لی ہیں۔ اسے یہ بھی پتہ چل گیا کہ بن فرقان لڑکیاں کس طرح حاصل کرتا ہے اس نے بتایا کہ خوب صورت لڑکیاں بن فرقان کے ہوٹل آتی ہیں۔ ایک ایسی جگہ ہے ہوٹل میں جہاں سے ہال پر نگاہ رکھی جا سکتی ہے۔ بن فرقان وہیں سے اپنے شکار کا انتخاب کر لیتا ہے اور پھر کسی نہ کسی طرح اس منتخب لڑکی کو اغوا کرا لیتا ہے یا کسی دوسرے ذریعے سے حاصل کر لیتا ہے اور اسے لے جا کر فروخت کر دیتا ہے۔

تیسرے دن بن فرقان نے ہم کو تیار رہنے کے لئے کہا اور پھر رات کو آٹھ بجے کے قریب ایک کار ہمیں لے کر چل پڑی۔ ایک دور دراز اور ویران علاقے میں ہم دو جیپوں اور ایک ٹرک کے قریب اتر گئے۔ جیپ میں بن فرقان موجود تھا اس نے عارف کو اپنے قریب جگہ دی، عارف اس سے بہت گھل مل گیا تھا۔ بہرحال یہ قافلہ تاریکی میں چل پڑا۔ ناہموار اور خطرناک راستہ طے کر کے صبح کے قریب ایک علاقے میں پہنچ گئے۔ جہاں بن فرقان کے بہت سے ساتھی اس سے جدا ہو گئے۔ ٹرک سے تین لڑکیوں کو اتار کر اسی جیپ میں ٹھونس دیا گیا جس میں بن فرقان موجود تھا۔۔۔ بن فرقان کے دوسرے ساتھی دوسری جیپ میں تھے، البتہ ٹرک واپس ہو گیا تھا۔ اب ہم سرحد پار کر رہے تھے۔ بن فرقان نے سرگوشی کے انداز میں بتایا۔ "گو ہمارا یہ راستہ مخصوص ہے لیکن پھر بھی خطرناک ہے کیونکہ بائیں طرف کی پہاڑیوں پر فوج موجود ہے۔" ہم دونوں خاموش رہے۔ تقریباً تین میل چلنے کے بعد جیپیں ایک سرنگ میں داخل ہو گئیں تو بن فرقان نے سکون کا سانس لی۔

"اب خطرہ ٹل گیا ہے،" اس نے پراطمینان انداز میں کہا۔

سرنگ سے نکلنے کے بعد جیپ کی رفتار تیز ہو گئی۔ گو راستہ اب بھی ناہموار تھا لیکن اب وہ لوگ بے فکر ہو گئے تھے۔ ہم نے ابھی تک تاریکی میں سفر کیا تھا اس لئے ان مظلوم لڑکیوں کو بھی نہیں دیکھ سکتے تھے جنہیں اغوا کر کے لایا گیا تھا سفر جاری رہا۔ پھر دور سے کسی بستی کے آثار نظر آئے روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں لیکن چند ہی منٹ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ بستی سے کترا کر گزر رہے ہیں۔ اور پھر۔۔۔ سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی ہمیں بلند و بالا عمارتیں نظر آنے لگیں۔ گویا ہم کسی بڑے شہر کے قریب پہنچ گئے تھے۔

ٹھیک سات بجے ہم شہر میں داخل ہو گئے۔ جیپوں کی رفتار تیز تھی اور بن فرقان بہت محتاط نظر آ رہا تھا۔ شائد وہ روشنی سے قبل یہاں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ لیکن دیر ہو گئی تھی۔ لیکن شہر میں داخل ہو کر زیادہ سفر نہ کرنا پڑا ایک خوب صورت عمارت جس پر ایک ہوٹل کا نیون سائن لگا ہوا تھا، میں جیپیں داخل ہو گئیں اور عمارت کے عقب میں رک گئیں۔ فوراً ہی دس بارہ آدمی دوڑ پڑے انہوں نے سب سے پہلے لڑکیوں کو اتار کر اندر پہنچایا جو سیاہ برقعوں میں ملبوس تھیں اور جن کی شکلیں ڈھکی ہوئی تھیں۔ پھر بن فرقان دوسرے آدمیوں کے ساتھ ہوٹل کی طرف بڑھ گیا۔

ہم سب کے لئے آن کی آن میں ہوٹل میں اعلیٰ انتظام کر دیا گیا۔ ناشتہ ہمارے کمرے میں آ گیا اور ناشتہ کرتے ہوئے میں نے عارف سے پوچھا۔

"اب تمہارا کیا پروگرام ہے عارف، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم بن فرقان سے اتنے گھل مل کیوں گئے ہو۔۔۔"

میرا جملہ پورا ہوتے ہی عارف نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش کر دیا اور میرے کان کے قریب منہ کر کے بولا۔

"یہ بات نہ بھولیں خیال رہے کہ یہ ہوٹل بن فرقان ہی کا ہے۔"

"اوہ" میں خاموش ہو گیا۔ اور اس کے بعد میں نے عارف سے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔ وہ دن ہم نے سکون سے گزارا۔ ہم اسے سکون کہہ سکتے تھے لیکن ہمارے دل تو شاہدہ کے لئے مضطرب تھے۔ پھر بن فرقان جیسے خطرناک آدمی پر بھروسہ بھی نہیں تھا۔ دوپہر کو بن فرقان کا ایک آدمی اپنے ساتھ کھانا لے کر آیا۔ اور اس نے مجھ سے کہا۔

"بن فرقان کا حکم ہے کہ آپ لوگ بھی اپنے کمرے سے باہر قدم نہ رکھیں، یہ قید صرف آج کے لئے ہے۔ شاید کچھ خطرناک حالات پیدا ہو گئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" ہم نے کہا اور پھر رات گئے تک میں اور عارف گفتگو کرتے رہے مختلف موضوعات پر۔ رات کو ٹھیک ایک بجے جب ہم دونوں اپنے اپنے طور پر سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ ہمارے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اور ہم اچھل پڑے۔

"کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دروازہ کھولو" — ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ یہ بن فرقان ہی کا آدمی تھا۔ میں نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ "صرف چند منٹ میں تیار ہو جاؤ، ہم چل رہے ہیں۔"

عارف نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور خاموشی سے لباس پہننے لگا۔ بن فرقان کے دوسرے آدمی شاید جا چکے تھے۔ نیچے کھڑی ہوئی گاڑی میں صرف ہم دونوں تھے یا وہ شخص جو ہمیں بلانے آیا تھا۔ یہی آدمی ڈرائیور تھا۔ ہم لوگ چل پڑے۔ کار کی تمام روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ ہمیں پتہ نہیں معلوم تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ لیکن اب اس بارے میں تو سوچنا ہی فضول تھا۔ بیس منٹ کے کافی تیز رفتاری سے سفر کے بعد کار ایک ایسے علاقے میں ٹھہر گئی جہاں روشنی نہیں تھی، دور دور تک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اور اس سناٹے کو پانی کے ہلکے سے شور کی آواز زخمی کر رہی تھی۔ شاید سمندر قریب تھا۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ سمندر کی آواز اب واضح ہو گئی تھی۔ اور پھر ساحل نظر آنے لگا۔ یہاں تاروں کی چھاؤں میں بہت سے سائے نظر آ رہے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر ایک اسٹیمر لانچ کھڑی تھی۔ ایک چھوٹی سی ماہی گیری کی کشتی ہم تینوں کو لانچ تک لے گئی۔ یہاں ہم نے بن فرقان کو دیکھا جو کچھ لوگوں سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس نے ہمیں کوئی لفٹ نہ دی اور ہمیں لانچ کے سامنے کے حصے میں پہنچا دیا گیا۔ یہیں وہ تینوں لڑکیاں بھی سہمی ہوئی بیٹھی تھیں۔ جنہیں اب برقعوں سے آزاد کر دیا گیا تھا۔ گو ان کی شکلیں صاف نہیں نظر آ رہی تھیں لیکن ان کا سہما سہما انداز صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ لیکن فی الحال ہم ان بے چاریوں کے لئے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ ہم تو خود بھی مجبور تھے۔ لانچ خصوصی قسم کی تھی وہ تیز رفتاری سے سفر کرتی رہی۔ پھر رات کے کسی حصے میں بن فرقان ہمارے پاس آیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آواز میں چہکار تھی۔

"کیوں دوستو! کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ بے آرامی ضرور ہے، لیکن کل دن بھر ہم آرام کریں گے۔" اس نے کہا اور ہم نے اندازہ لگا لیا کہ کل صبح تک ہم کسی خشکی پر پہنچ جائیں گے۔ اور وہی ہوا۔ صبح کی آمد آمد تھی جب لانچ کسی ساحل سے جا لگی۔ اس بار کسی بھیڑی بھری جگہ میں اترے تھے۔ یہاں بن فرقان کے بہت سے شناسا موجود تھے۔ ہم سب کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور پھر ہم قافلے کی شکل میں ایک طرف چل پڑے۔ تینوں لڑکیاں غم سے نڈھال تھیں، وہ بے حد خوب صورت تھیں لیکن ان کے چہرے خوف اور صدمے سے سفید ہو گئے تھے۔ ویران آنکھوں میں دہشت کے علاوہ اور کوئی تاثر نہیں تھا۔ میں نے ان کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں، مبادا ایسی جوشِ جنوں میں کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھوں جو مجھے شاہدہ سے دور کر دے۔ چنانچہ میں نے سب کچھ برداشت کر لیا۔ عارف مجھ سے زیادہ گرم خون رکھتا تھا لیکن وہ اپنے چہرے کو لاتعلق بنائے ہوئے تھا۔

اس بار ہمارا قیام کسی ہوٹل یا سرائے میں نہیں تھا بلکہ ایک خشک جگہ خیمے لگائے گئے تھے۔ وران خیموں میں سے ایک میں لڑکیوں کو منتقل کر دیا گیا ایک میں ہم اور باقی دوسرے خیموں میں بن فرقان اور اس کے ساتھی تھے دوپہر تک بن فرقان سے ملاقات نہ ہوئی لیکن دو بجے کے بعد وہ ہمارے خیمے میں آ گیا۔

"اتفاق سے دوستو، ایران کے پروگرام میں کچھ تبدیلی ہو گئی۔ پہلے مجھے ان لڑکیوں کو ٹھکانے لگانے جانا تھا لیکن مجھے اطلاع ملی کہ جس راستے سے ہمیں جانا ہے وہ خطرناک ہو گیا ہے جب تک وہ صاف نہ ہو جائے ہمیں وہاں سے نہیں گزرنا چاہئے چنانچہ میں اس طرف آ نکلا ۔۔۔۔ اور یہ جگہ تمہاری مطلوبہ جگہ ہے۔"

"کیا مطلب ہے" عارف نے چونک کر پوچھا۔

"اسی علاقے میں شیخ العباص رہتا ہے وہ یہاں کے ایک بہت بڑے حصے کا مالک ہے۔ جنوبی ساحل پر اس کا ٹھیکہ ہے اور اس کے آدمی وہاں ماہی گیری کرتے ہیں۔ اسی شیخ نے تمہاری بہن کو مجھ سے خریدا تھا" بن فرقان کی زبان سے یہ تفصیل سن کر ہم دونوں کی بے چینی کی انتہا نہ رہی، ہمارا دل چاہ رہا تھا کہ اڑ کر شاہدہ کے پاس پہنچ جائیں اور اسے گلے سے لگا لیں۔

"پھر اس کے پاس کب چلو گے" عارف نے مضطربانہ انداز میں پوچھا۔

"تھوڑی دیر کے بعد چلیں گے۔ پہلے میں اپنے طور پر اس سے گفتگو کر لوں اگر وہ لڑکی کو واپس کر کے اس کے بدلے میں کسی دوسری لڑکی کے لئے تیار ہو جاتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ پرسوں ہم یہاں سے روانہ ہوں گے اور تمہاری بہن کو اغوا کر کے لیتے چلیں گے۔"

اس بات پر بھی ہم نے بن فرقان سے اتفاق کیا اور بڑی بے چینی سے وقت گزارنے لگے۔ آخر بن فرقان ہمیں ساتھ لے کر چل پڑا۔ جزیرے کے ریتیلے علاقے کو عبور کرتے ہوئے ہمارے دل محبت سے دھڑک رہے تھے۔ شاہدہ سے ملنے کی آرزو شدید تر ہوتی جا رہی تھی کتنی خوش ہو گی وہ ہم دونوں کو دیکھ کر ۔۔۔۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم پیلے رنگ کی مٹی اور تختوں سے بنے ہوئے اس کشادہ مکان کے پھاٹک پر پہنچ گئے۔ جہاں دو سیاہ رو آدمی کھڑے تھے۔ بن فرقان نے ان میں سے ایک سے کہا کہ شیخ کو اطلاع دو بن فرقان آیا ہے وہ شخص اندر دوڑ گیا اور پھر ایک منٹ کے بعد آ کر اس نے کہا کہ شیخ نے انہیں طلب کیا ہے۔

باہر سے یہ مکان زیادہ عمدہ نہ تھا لیکن اندر سے اسے دیکھ کر آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ صحن تک میں اعلیٰ درجے کے قالین بچھے تھے دنیا کے عیش و آرام کی ہر شے موجود تھی۔ ملازم کی رہنمائی میں ہم ایک بڑے خوب صورت ہال میں پہنچ گئے۔ جس کا اس سڑے ہوئے مکان میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہال کے ایک آرام دہ صوفے پر عربی لباس پہنے ہوئے ایک شخص بیٹھا تھا ہمیں دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے کھڑا ہو گیا ۔۔۔۔ اور مجھے زمین گھومتی ہوئی محسوس ہونے لگی میں نے گرنے سے بچنے کے لئے عارف کا سہارا لیا ورنہ میں گر پڑا ہوتا۔

"یہ شیخ العباص ہیں" بن فرقان نے ہمارا تعارف کرایا۔

لیکن مجھے کسی تعارف کی ضرورت نہیں تھی میں اس شیطان کو اچھی طرح پہچانتا تھا جو مجھے دیکھ کر تمسخرانہ انداز میں مسکرا رہا تھا ۔۔۔۔ ہاں ۔۔۔۔ وہ شیطان باسد ہی تھا۔

میں سکتے کے عالم میں باسدیو کی شکل دیکھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سب کیا ہے۔ میری سوچ مفلوج ہو گئی تھی۔ اور میں پاگلوں کی طرح اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ دوسرے لوگوں نے میری اس حالت کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن باسدیو میری دلی کیفیات سے بخوبی واقف تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی شیطانی مسکراہٹ بتاتی تھی کہ اس کے لئے میری آمد متوقع تھی۔ اور پھر اس نے بھی خود کو مجھ سے نہ چھپایا۔ اس نے بن فرقان اور عارف کو نظر انداز کر دیا اور کہا۔

"آؤ شارق جی، میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

اس کے منہ سے میرا نام سن کر عارف اور بن فرقان دونوں چونک پڑے۔

"آپ مسٹر شارق سے پہلے سے واقف ہیں شیخ!"
بن فرقان نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، شارق جی ہمارے پرانے مترہیں، مگر بے حد ضدی اور پاگل۔" اس نے زہر خند سے کہا۔

"شاہدہ کہاں ہے بوڑھے شیطان، اسے میرے حوالے کر دو ورنہ۔" میں نے غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ورنہ سے آگے کہو شارق جی۔ اگر میں نے تمہاری بہن تمہارے حوالے نہ کی تو تم کیا کرو گے؟" وہ بدستور شیطانی انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

عارف اس عجیب و غریب گفتگو سے بہت پریشان ہو گیا۔ اور میرا شانہ جھنجوڑتے ہوئے بولا۔

"کیا کر رہے ہیں بھائی جان، تمام پروگرام چوپٹ کر دیا آپ نے، آپ اسے کیسے جانتے ہیں اور ——— اور یہ آپ سے کس انداز میں گفتگو کر رہا ہے؟"

"تم نہیں جانتے عارف، تم نہیں جانتے، یہ ——— یہ وہی شیطان ہے، یہ وہی شیطان ہے جس نے ہمیں اس حال کو پہنچا دیا ہے۔ یہی پلید باسدیو ہے جس نے ہمارے بھرے پرے گلزار کو جہنم بنا دیا ہے۔ عارف یہ وہی بوڑھا باسدیو ہے جو میرے کندھوں پر سوار ہو کر اس مسجد میں داخل ہونا چاہتا ہے۔" میں نے غصے اور نفرت سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

اور اچانک عارف کے چہرے پر جہنم سلگ اٹھا۔ اس کی آنکھیں کبوتر کے خون کی طرح سرخ ہو گئیں۔ وہ خونی نظروں سے باسدیو کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اور باسدیو کے ہونٹوں پر وہی شیطانی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہم لوگوں میں سب سے زیادہ حیران بن فرقان تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ عجیب و غریب ڈرامہ نہیں آ رہا تھا۔

"تو یہ ہے وہ منحوس بوڑھا جس نے ہمیں در بدر کیا ہے۔" عارف کے منہ سے سانپ کی سی پھنکار نکلی۔ "آج یہ میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکے گا۔"

عارف نے پتلون کے پائنچے اونچے کر کے ایک شکاری چاقو نکال لیا اور اسے مٹھی میں دبا کر کسی شکرے کی طرح پر تولنے لگا۔ اور پھر اس سے قبل کہ بن فرقان اسے روکنے کی کوشش کرتا عارف نے بجلی کی سی تیزی سے باسدیو پر چھلانگ لگا دی۔ اس کے چاقو کی نوک باسدیو کے دل کا نشانہ لئے ہوئے تھی۔ باسدیو نے اسے روکنے کے لئے نہ تو اپنے ہاتھ ہلائے اور نہ اپنی پوزیشن میں تبدیلی کی، وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ اور عارف اس کے بدن میں سے گزر کر دوسری طرف دیوار سے جا ٹکرایا۔ ایسے لگتا تھا جیسے باسدیو دھوئیں کی کوئی تصویر ہو، جس میں سے گزرنا مشکل نہ ہو۔ عارف کے چاقو کی نوک دیوار سے ٹکرا کر خراب ہو گئی۔ بمشکل تمام وہ اپنا ہاتھ زخمی ہونے سے بچا سکا تھا۔ اور وہ پھر وہ جونہی پلٹا نہ جانے کہاں سے ایک فولادی زنجیر اس کے ہاتھوں میں آ پڑی۔ پھر کسی

غیر مرئی ہاتھ نے اس کے چاقو والے ہاتھ کو جھٹکا دیا اور چاقو اس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے گر پڑا۔ عارف نے گھبرائے ہوئے انداز میں آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن اس کے دونوں پاؤں بھی جکڑ گئے اور اس کے ساتھ ہی باسدیو کا شیطانی قہقہہ گونج اٹھا۔

"لڑائی ہماری اور شارق جی کی ہے بالک، تو ہمارے درمیان کیوں آ گیا۔ شارق جی جانتے ہیں کہ ہمیں ان کے علاوہ ان کے خاندان کے کسی منش کے جیون سے دلچسپی نہیں ہے۔ اب تو بھی اپنا جیون کھونے ہمارے سامنے آ گیا۔ تو ہم تمہاری اچھا ضرور پوری کریں گے۔" اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ باسدیو عارف کی زندگی کے در پے تھا اور اس منحوس کو کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ عارف میرا بھائی ——— میرا واحد سہارا ——— میں اسے نہیں مرنے دینا چاہتا تھا میں نے باسدیو کا چہرہ دیکھا۔ اس کی چمکدار آنکھیں عارف پر جمی ہوئی تھیں ——— پھر اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور ——— اچانک دروازے کے کواڑ آہستہ آہستہ کھلنے لگے دیکھتے ہی دیکھتے کواڑ پورے کھل گئے اور پھر ایک سیاہ ناگ کی پھنکار سنائی دی۔ دوسرے لمحے بن فرقان کے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکلی اور وہ اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ میں بھی جان بچانے کے لئے فطری جذبے سے مغلوب ہو کر اس سیاہ ناگ کے راستے سے ہٹ گیا جو غیظ کے عالم میں پھنکارتا ہوا اندر داخل ہو رہا تھا اس کا رُخ عارف کی طرف تھا اور میری نگاہوں میں عارف کا انجام گھوم گیا۔ چشم تصور سے میں نے عارف کے جسم کو نیلا ہوتے ہوئے دیکھا اور میرے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکل گئی۔ دوسرے لمحے میں نے سانپ پر چھلانگ لگا دی لیکن کم بخت سانپ مجھ سے پھرتیلا نکلا۔ اس سے قبل کہ میں اس پر جا گرتا اس نے اپنا جسم سمیٹا اور کنڈلی مار کر کھڑا ہو گیا۔ عارف پھٹی پھٹی نظروں سے میرے اس جذبۂ محبت کو دیکھ رہا تھا میں سانپ کے سامنے کھڑا تھا اور اس پر دوسرا حملہ کرنے کے لئے تیار تھا۔

"اس کے راستے سے ہٹ جاؤ شارق، ورنہ تمہیں بھی نہ چھوڑے گا۔" باسدیو کی غصیلی آواز گونجی۔

"یہ میری موت کے بعد ہی عارف کو ڈس سکتا ہے۔" میں نے سانپ پر جھپٹتے ہوئے کہا مگر یہ میرا دوسرا وار بھی خالی گیا لیکن سانپ نے خلاف توقع مجھ پر حملہ نہیں کیا۔ بلکہ پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"تم مجھ سے عارف کی زندگی کا سودا کر سکتے ہو ——— بولو، اگر تم مجھ سے بات کرنا منظور کرو، تو عارف کی زندگی بچائی جا سکتی ہے۔"

"سانپ کو واپس کر دو، میں تم سے گفتگو کروں گا۔" میں نے نہ جانے کس جذبے کے تحت کہا اور باسدیو کے چہرے پر پھر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے سانپ کی طرف رُخ کر کے کہا:

"جا اگھوری، گوبر دھنا اور دھومی کو بھیج دے وہ ان دونوں کو لے جا کر بند کر دیں۔" باسدیو نے سانپ کی طرف رُخ کر کے کہا اور سانپ خاموشی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ عارف کی زندگی مجھے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز تھی ——— میں اسے باسدیو کی بھینٹ نہیں چڑھنے دینا چاہتا تھا ابھی سانپ کو گئے ہوئے پورا منٹ بھی نہ گزرا تھا کہ دو سیاہ فام ننگ دھڑنگ بدہیئت انسان اندر داخل ہو گئے۔ ان کی آنکھیں سُرخ تھیں اور جسموں سے بدبو اُٹھ رہی تھی ان میں سے ایک نے عارف کا ہاتھ پکڑ لیا اور دوسرے نے بن فرقان کا۔ بن فرقان کے ہوش بھی گم ہو گئے تھے اس عجیب و غریب

ڈرامے نے اس کے سوچنے سمجھنے کی قوت مفلوج کر دی تھی اور اس کی خونخواری نہ جانے کہاں سو گئی تھی۔ وہ خاموشی سے ان کے ساتھ چلا گیا اور بدہیئت شکل والے عارف کو بھی باہر لے گئے۔

اب کمرے میں باسدیو اور میں تنہا رہ گئے تھے۔ باسدیو عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا پھر اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی صوفے پر بیٹھ گیا۔ چند لمحات خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔

"شارق بابو، کیوں اپنے کو تم تباہ کر رہے ہو، تم میری شکتی دیکھ چکے ہو، تم اندازہ لگا چکے ہو کہ میں جب چاہوں جہاں چاہوں تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہوں، پھر تم میری بات کیوں نہیں مان لیتے۔ تم بتاؤ تمہیں میرا معمولی سا کام کرنے میں اتنی ضد کیوں ہے میں تمہیں اس معمولی کام کے بدلے کیسی کیسی قوتیں دے رہا ہوں۔ تم پوری دنیا پر راج کر سکتے ہو۔ بھگوان نے منش کو سنسار میں اسی لئے بھیجا ہے کہ وہ سنسار کی ساری خوشیاں اپنی جھولی میں بھر لے۔ پورے سنسار کے منش خوش رہنے کے لئے کیسے کیسے جتن کرتے ہیں۔ ایک تم ہو کہ اپنی ضد کے آگے سنسار کو لات مارے ہوئے ہو، دکھ پر دکھ اٹھا رہے ہو، مگر تمہارے ہوش درست نہیں ہوئے آخر کیوں؟ مجھے اس کا کارن بتاؤ۔ تم میرا اتنا سا کام کرنے سے کیوں ہچکچا رہے ہو، کیا تمہیں اس مسجد کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟"

"میں چونک پڑا۔ پہلی بار باسدیو نے مجھ سے ایسی کوئی بات کہی تھی۔ اس سے قبل تو وہ صرف اپنی رٹ لگائے رہتا تھا اور نہ جانے کیوں مجھے اس سے ضد ہو گئی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ باسدیو اس مسجد میں کیوں داخل ہونا چاہتا تھا۔ مجھے یہ علم تھا کہ میرے علاوہ اور کوئی اسے مسجد میں نہیں لے جا سکتا مگر کیوں؟ اس بارے میں مجھے کوئی علم نہیں تھا۔ اگر کوئی مسلمان ہی یہ کام کر سکتا تھا تو دوسرے لوگ بھی تھے جو اس کے لالچ میں آ سکتے تھے۔ میرے اندر ہی ایسی کون سی بات تھی۔ یہ تمام باتیں سوچنے کا آج تک مجھے موقع نہیں ملا تھا لیکن وقت باسدیو نے یہ سوال کیا تو یہ تمام باتیں میرے ذہن میں ابھر آئیں۔ اور میں ان پر غور کرنے لگا لیکن ان کا کوئی حل میرے پاس نہ تھا چنانچہ میں نے باسدیو سے ہی اس بارے میں معلوم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"مجھے کچھ نہیں معلوم، اگر تم مجھے سب کچھ بتا دو تو میں غور کر سکتا ہوں" میں نے باسدیو کے سوال کا جواب دیا۔

"نہیں، میں اس بارے میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔ میں تجھ سے صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ تو میرا کام کر دے اور سکھ کی نیند سو، تیرا بھائی، تیری بہن تجھے مل جائیں گے اور ان کے ساتھ ساتھ میں تجھے ایسی قوتیں دے دوں گا کہ تو سنسار کا بہت بڑا آدمی بن جائے گا۔ تیری ہر خواہش پوری ہو جائے گی، خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز۔ تو جس کی اور دیکھے گا وہ تیرا غلام ہو جائے گا۔ جب تو اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تو اس سے زیادہ جاننے کی کوشش بھی مت کر۔"

"میں سب کچھ جانے بغیر تمہارا کام نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔

"پھر وہی ضد، میں کہتا ہوں اپنی ہٹ سے باز آ جا۔" باسدیو غصیلے انداز میں بولا۔

"تم جانتے ہو میں نے اس ضد پر اپنا پورا خاندان تباہ کر دیا ہے اور دنیا کا بڑے سے بڑا صدمہ برداشت کیا ہے۔ اب صرف میرے بھائی اور بہن رہ گئے ہیں۔ اگر یہ بھی مجھ سے چھن گئے تو میں ان کے صدمے کو بھی برداشت

کروں گا مگر اس بارے میں بتائے بغیر میں تمہاری خواہش پوری نہیں کروں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"ابھی تیرے بھاگ میں اور کتنا بُری لکھی ہیں میرا کیا ہے انہیں بھی بھوگ۔" باسد یو نے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔

"ٹھیک ہے، میں تیار ہوں جب تک تم مجھے اس بارے میں تفصیل نہیں بتاؤ گے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا اور باسد یو مجھے گھورنے لگا۔ کافی دیر تک وہ خاموش رہا پھر گردن ہلا کر اُٹھتے ہوئے بولا۔

"اچھا سنا رق بابو، پھر کچھ اور تماشہ دیکھو، میں تجھے اس جگہ جانے کا کارن نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ یہ تیرے لئے اچھا نہ ہوگا، تو بہت سی باتوں سے واقف ہو جائے گا۔ میں تو انتظار کر رہا ہوں — ایک طویل انتظار — یہ انتظار کچھ اور طویل سہی۔ میں تجھے مجبور کر دوں گا کہ تو صرف میرے بارے میں سوچے اور خلوص سے میرا کام کرنے پر راضی ہو جائے سمجھ بالک تیری بہن میرے پاس ہے، میری نید میں ابھی اسے ولیشا بناؤں گا۔ میں تجھے ایسی اذیتیں دوں گا کہ تیرا ہر رُوئے ذرہ سے چلا اٹھے گا اور پھر تو گڑگڑا کر دیو کہتا ہوا میرے چرنوں میں آ گرے گا، تاہم اس وقت بھی اگر تو نے میری اچھا پوری کر دی تو میں تجھے شما کر دوں گا۔ جا اب تو بھی اپنے ساتھیوں کے پاس جا۔" باسد یو نے کہا اور دونوں ہاتھوں سے تالی بجائی۔ وہ ہی گندے غلام اندر آ گئے اور انہوں نے میرے دونوں بازو پکڑ لئے — وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے اور پھر ایک تاریک کمرے کا دروازہ کھول کر مجھے اندر دھکیل دیا گیا۔

اندر بھی گہری تاریکی اور گھٹن تھی۔ میں نے کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھا اور اسی وقت مجھے ایک کونے سے آواز سنائی دی۔

"کون ہے؟"

عارف کی آواز کو میں صاف پہچان گیا — "میں ہوں عارف۔" میں نے کہا۔

اور عارف آواز کے سہارے میرے قریب پہنچ گیا۔

"بن فرقان کہاں ہے؟" میں نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"یہیں ہے، وہ بہت بگڑ رہا ہے کہ ہم نے اسے حالات سے بے خبر رکھا اور یہاں لا پھنسایا۔" عارف نے جواب دیا۔

میں نے کچھ نہ کہا اور ہم دونوں بن فرقان کے قریب پہنچ گئے۔

"کیا سوچ رہے ہو بن فرقان؟" میں نے نرمی سے کہا۔ گو اس شخص کے لئے میرے اور عارف کے دل میں سخت نفرت تھی۔ یہ سیاہ دل انسان بے گناہ اور معصوم بچیوں کو ان کے والدین اور دوسرے اعزہ سے دُور کر کے انہیں وحشیوں کے ہاتھوں فروخت کر دیتا تھا اس پر ذرہ برابر رحم کھانا بھی گناہِ عظیم تھا لیکن ہم نے خود کو قابو میں رکھا تھا۔ ہم جس مصیبت بھرے دَور سے گزر رہے تھے اس میں ہمیں پھونک پھونک کر قدم اُٹھانا تھا — بن فرقان سے ہم ان بے گناہ لڑکیوں کا انتقام ضرور لینا چاہتے تھے لیکن کسی مناسب موقع پر۔ ابھی تو ہم خود مصیبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔

"بکواس مت کرو، تم نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ تم کسی جادوگر کے چکر میں پھنسے ہوئے ہو۔" بن فرقان غرایا۔

"اس بارے میں تو ہمیں بھی نہیں معلوم تھا بن فرقان۔ تم نے ہمیں خود شیخ العباص کا پتہ بتایا تھا۔ تم خود ہمیں یہاں لائے تھے۔"

"مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ العباص جادوگر بھی ہے
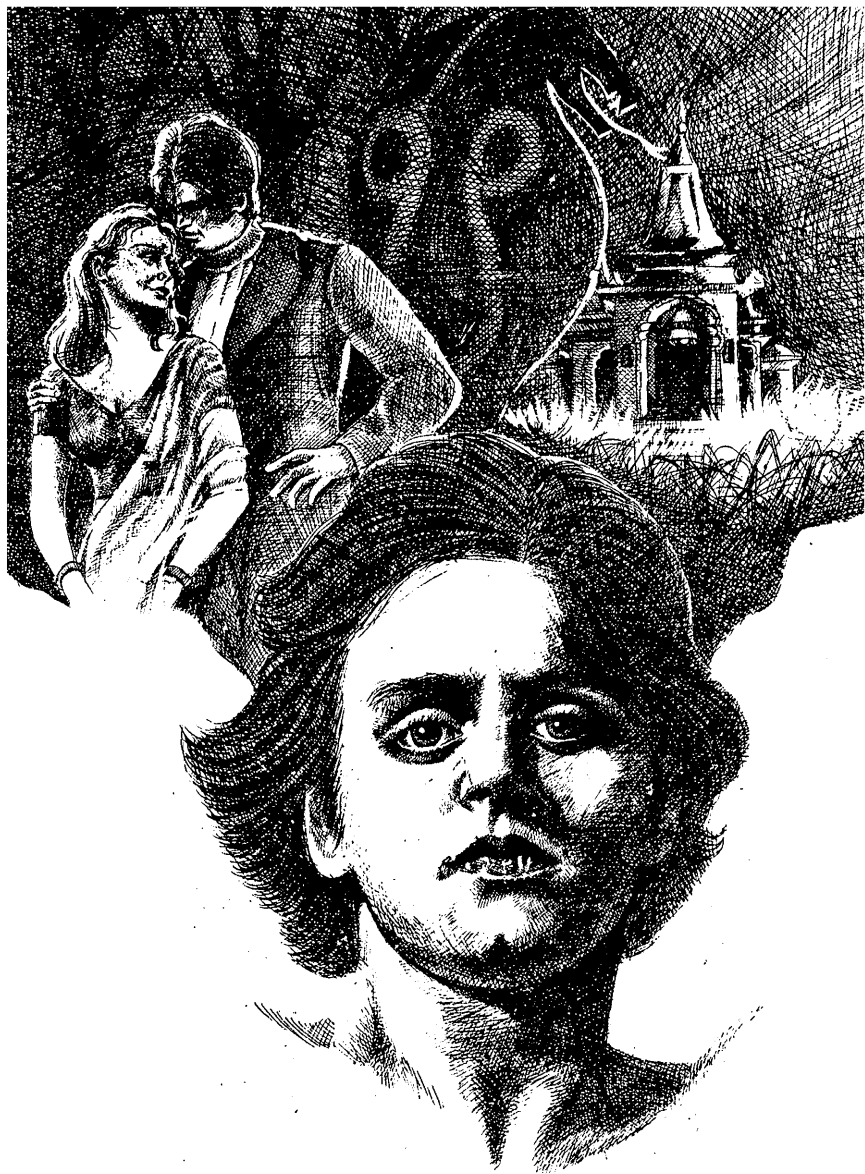
میں تو اسے بہت عرصے سے جانتا ہوں۔"

"خیر، ہمیں تو اپنی بہن کی تلاش ہے۔ اب بتاؤ اس بارے میں کیا کریں؟"

"جہنم میں گئی تمہاری بہن، اس ولد الخبیث نے میری دوستی کا خیال بھی نہ کیا میں اسے دیکھ لوں گا۔" بن فرقان نے کہا۔ اور میں خاموش ہو گیا۔

بن فرقان کی خونخوار فطرت عود کر آئی تھی۔ بہر حال ابھی ہمیں اس سے کام لینا تھا اس لئے ہم بالکل خاموش رہے اب میری آنکھیں بھی تاریکی کی عادی ہو گئی تھیں اس لئے بن فرقان اور عارف کے ہیولے دیکھ سکتا تھا۔

کافی دیر تک مکمل خاموشی رہی پھر بن فرقان کچھ بڑبڑانے لگا۔ اور پھر ہم سے بولا۔

"اگر تم آزاد ہو گئے تو پھر اپنی بہن کے لئے کیا کرو گے؟"

"اسے تلاش کرتے رہیں گے بن فرقان، ہماری زندگی کا ایک ہی مقصد ہے۔"

"مجھے تمہاری رقم واپس کرنی پڑے گی ——" اس نے کہا۔

"اوہ، رقم کی فکر مت کرو، ہمیں صرف اپنی بہن کی ضرورت ہے۔ ہم اس سے دس گنی رقم خرچ کر سکتے ہیں۔ بس ہماری بہن مل جائے۔" عارف نے کہا اور بن فرقان کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا پھر چند منٹ کے بعد بولا۔

"میں اس خبیث شیخ سے تمہاری بہن کے بارے میں ضرور معلوم کر دوں گا لو سنو، اگر تمہارے سامنے اپنی بہن کو تلاش کرنے کا کوئی پروگرام نہیں ہے تو تم یہ کام میرے اوپر چھوڑ دو، پوری دنیا میں میرے آدمی پھیلے ہوئے ہیں وہ اسے تلاش کریں گے اور جہاں بھی مل گئی اسے لے آئیں گے، اگر تم چاہو تو اس وقت تک میرے ساتھ بھی رہ سکتے ہو جب تک تمہاری بہن نہ مل جائے۔"

"ہمیں منظور ہے بن فرقان" عارف جلدی سے بول پڑا۔ اور یہ حقیقت تھی کہ اسکیمیں بنانے میں عارف مجھ سے تیز تھا۔ نہ جانے کیا سوچ کر اس نے بن فرقان کی یہ بات قبول کر لی تھی۔

"تھوڑا سا اندھیرا اور پھیل جانے دو۔ اس کے بعد ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں گے ——" بن فرقان نے کہا۔

"کس طرح؟"

"میرا نام بن فرقان ہے، العباص نے مجھ سے دشمنی مول لی ہے، یہ دشمنی اسے کس قدر مہنگی پڑے گی، تم دیکھ لو گے وہ اگر جادوگر ہے تو اس کا جادو میرے اوپر نہیں چلے گا۔ میں نے بڑے بڑے جادوگروں کو ٹھکانے لگایا ہے۔" بن فرقان نے اکڑ کر کہا اور ہم خاموش ہو گئے۔

وقت گزرتا رہا۔ بن فرقان کی وجہ سے ہم دونوں کسی خاص موضوع پر گفتگو بھی نہ کر سکتے تھے۔ نہ جانے کتنی رات گزر گئی تب بن فرقان اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ہم تاریکی میں اس کا سایہ ہی دیکھ سکتے تھے۔ کئی منٹ تک دروازے سے ہلکی ہلکی آوازیں نکلتی رہیں، پھر روشنی کی ایک کرن اندر رینگ آئی اور اس کے ساتھ ہی ہوا کا جھونکا بھی۔ اور کئی گھنٹے کے بعد اس تکلیف دہ گھٹن سے نجات ملی جس کے اب ہم عادی ہوتے جا رہے تھے۔ بن فرقان نے دروازہ کھول لیا تھا۔ پھر اس نے سرگوشی کے انداز میں ہمیں آواز دی اور ہم دونوں جلدی سے اس کے قریب پہنچ گئے۔

"آؤ ——" اس نے کہا اور ہم تینوں باہر نکل آئے۔

بن فرقان چونکہ پہلے بھی اس عمارت میں آ چکا تھا۔ اس لئے اس کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ کئی راستوں سے گزرنے کے بعد ہم اس جانے پہچانے حصے میں

پہنچ گئے جہاں بن فرقان کے ساتھ آئے تھے۔ اس کمرے میں روشنی تھی جہاں یاسد یو سے ملاقات ہوئی تھی۔ بن فرقان نے دروازے کو تھوڑا سا دھکیلا اور پھر خوش ہو کر گردن ہلائی اس کے بعد وہ ہمیں اشارہ کر کے اندر داخل ہو گیا۔

اندر ایک خوبصورت مسہری پر شیخ العباض سو رہا تھا، یا بہ الفاظ دیگر یاسد یو لیکن اس وقت اس کے چہرے پر شیطانیت نہیں بلکہ سادگی تھی وہ سوتے میں ایک عام انسان معلوم ہوتا تھا۔ دوسرے لمحے بن فرقان نے ایک لمبا خنجر نکال لیا اور العباض کی مسہری میں ایک زوردار ٹھوکر ماری۔ العباض بری طرح اچھل پڑا اور پھر جاگ کر آنکھیں پھاڑنے لگا دوسرے لمحے وہ مسہری پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ خوفزدہ نظروں سے بن فرقان اور اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے خنجر کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کے منہ سے سہمی سہمی آواز نکلی۔

"بن فرقان، یہ تم ہو — میرے خدا، تم اس حالت میں یہاں کیسے آئے ؟"

"ادھار چکانے جادوگر شیخ، ان لوگوں سے تمہاری دشمنی تھی تو تم نے بن فرقان کا بھی خیال نہ کیا۔" بن فرقان نے خنجر چمکاتے ہوئے کہا۔

"کیا — کیا کہہ رہے ہو عزیز — کیا کہہ رہے ہو۔ ضرور تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں — میں تو تین دن سے جزیرے سے باہر گیا ہوا تھا۔ آج ہی واپس آیا ہوں ۔"

"بے وقوف بنا رہا ہے نا ہنجار — تیرا خیال ہے تو اپنی چالاکی سے ایک بار پھر مجھے احمق بنائے گا —" بن فرقان نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"یقین کرو بن فرقان، نہ جانے کیوں، نہ جانے کیوں تم میری طرف سے غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہو —" العباض روہانسا ہو گیا تھا۔

اور میرے ذہن میں نئے خیالات جنم لے رہے تھے بوڑھے شیطان سے کچھ بعید نہ تھا ممکن ہے اس وقت وہ اس شیخ کے بھیس میں ہو اور اب یہ اصل شیخ ہو، چنانچہ میں نے بن فرقان سے پوچھا۔

"اس سے شاہدہ کے بارے میں معلوم کرو۔"

"بتاؤ، وہ لڑکی کہاں ہے جسے آخری بار تم نے مجھ سے خریدا تھا ؟"

"شاہدہ — ہاں — میں نے خریدی تھی — بڑی مغرور لڑکی تھی۔ ایک رات بھی میرے ساتھ نہ سوئی۔ حالانکہ میں نے اس کے جسم سے کھال ادھیڑ دی لیکن اس نے میرا کہا نہ مانا۔ اسی دوران مرشد آ گئے اور انہوں نے مجھ سے وہ لڑکی مانگ لی، یقین کرو بن فرقان، مگر کیا بات ہے، تم اسے کیوں پوچھ رہے ہو۔"

شاہدہ کے بارے میں اس ذلیل انسان سے سن کر میرا خون کھول گیا اور میں دیوانہ وار آگے بڑھ آیا۔

"تو نے اس کے جسم سے کھال ادھیڑ دی تھی تو نے۔" میں نے لرزتے ہوئے کہا۔ "بتا اب وہ کہاں ہے، ورنہ میں تیرے پورے جسم سے کھال ادھیڑ دوں گا —" اور اچانک میں نے بن فرقان کے ہاتھ سے خنجر جھپٹ لیا۔

میری اس پھرتی پر بن فرقان حیران رہ گیا تھا — بہرحال اس نے اس معاملے میں مداخلت نہ کی اور قدرے پیچھے ہٹ گیا۔

"یہ کیا تماشہ ہے بن فرقان میرے دوست۔ تمہارے دوست کے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہے اور تم خاموش دیکھ رہے ہو۔ یہ کون لوگ ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں ؟"

"تو نے بھی تو مجھے اپنے سیاہ غلاموں کے ذریعے قید کرا دیا تھا۔ العباض تو نے بھی تو اپنی جادوگری مجھ پر

آزمائی تھی۔ یہ لوگ اپنی بہن شاہدہ کی تلاش میں آئے ہیں۔ پہلے ہم تجھ سے کوئی باعزت سمجھوتہ کر سکتے تھے لیکن تو نے سمجھوتے کے راستے بند کر دیئے۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔" العباض نے دونوں ہاتھوں سے سر کے بال نوچتے ہوئے کہا۔

"شاہدہ کہاں ہے کتے، تجھے کچھ سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، تو صرف ہماری بات کا جواب دے۔" عارف نے آگے بڑھ کر العباض کے جبڑے پر گھونسہ رسید کرتے ہوئے کہا۔

العباض کی آنکھوں میں غیظ کے آثار نظر آئے لیکن میں نے خنجر کی نوک اس کے حلقوم پر رکھ دی اور وہ سنبھل گیا۔

"میں بتا چکا ہوں" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں نے اسے مرشد کو دے دیا تھا۔ مرشد اسے لے کر البدورا گئے تھے، یقیناً وہ البدورا کی حرم میں ہوگی"۔ اس نے کہا۔

"مرشد کون ہے؟" میں نے کراک کر پوچھا۔

"ایک ولی کامل، انہوں نے کہا تھا کہ وہ لڑکی ان کے کام کی ہے۔ وہ لڑکی کے بھائی سے کوئی کام لینا چاہتے تھے۔" شیخ العباض نے کہا اور میرے کان کھڑے ہو گئے۔ ظاہر ہے یہ مرشد اس خبیث کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا جس نے نہ جانے کہاں کہاں اپنے پاؤں پھیلا رکھے تھے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی خیال ہوتا تھا کہ ممکن ہے العباض کے روپ میں چھپے ہوئے پاسر یونے اب یہ کوئی نئی چال چلی ہو۔

"البدورا کہاں ہے؟" میں نے غیظ و غضب میں کانپتے ہوئے کہا۔

"جزیرہ البدورا یہاں سے ایک سو ساٹھ میل دور ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ مرشد وہاں موجود ہوں۔ وہ سیلانی آدمی ہیں اور پھر زمین ان کے لئے مختصر ہے، لمحات میں وہ لاکھوں میل کا سفر کرتے ہیں۔"

"یہ کون ہے مرشد کی بات کرتا ہے مسٹر شارق، میں اس چالاک انسان کو اچھی طرح جانتا ہوں، کیا تم اس کی باتوں میں آرہے ہو۔ تمہیں یاد نہیں اس نے کس چالاکی سے ہم لوگوں کو قید کر دیا تھا۔ جو شخص دوستوں کو قید کر سکتا ہے وہ کیا نہیں کر سکتا۔" بن فرقان نے کہا اور العباض حیرت سے بن فرقان کی شکل دیکھنے لگا۔ پھر وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"یہ تم کہہ رہے ہو بن فرقان، میرے دوست۔"

"میں تمہاری دوستی پر لعنت بھیجتا ہوں جو وقت کے ساتھ بدلتی ہے۔ میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا کہ میں تمہارے مکان میں قید رہا ہوں۔"

"تمہیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہے بن فرقان — مجھے معاف کر دو۔ اور ٹھنڈے دل سے حالات پر غور کر کے میری دوستی کے بارے میں فیصلہ کرو —" العباض نے کہا اور بن فرقان مکاری سے اسے دیکھنے لگا، پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

"اچھا تو پھر دوستی کے ثبوت پر اس لڑکی کو میرے حوالے کر دو، میں اس کے عوض تمہیں دوسری لڑکی دے سکتا ہوں۔"

"اگر وہ میرے پاس ہوتی تو میں تمہیں بلاعوض لئے ہوئے واپس کر دیتا۔ یا اگر وہ یہاں نکل آئے تو تم میری دوستی کو ٹھکرا سکتے ہو۔ میں سچ کہہ رہا ہوں مرشد نے اسے پسند کیا اور وہ لے گئے۔"

"ہوں —" بن فرقان نے ایک معنی خیز سانس لی اور پھر میری طرف رخ کر کے بولا۔ "بہر حال مسٹر شارق اگر یہ درست بھی کہہ رہا ہے تو لڑکی کی تلاش کے لئے اس کی موت ضروری ہے، ورنہ یہ بقول اس کے اپنے مرشد کو بھی

ہمارے بارے میں اطلاع کر دے گا اور مرشد انتظام کر لیں گے۔ اس کے علاوہ میں بتا چکا ہوں کہ یہ جزیرہ آدھے سے زیادہ اس کی ملکیت ہے۔ اگر ہم اسے زندہ چھوڑتے ہیں تو پھر ہم یہ جزیرہ کبھی نہ چھوڑ سکیں گے۔ دوسری بات یہ کہ میں اس علاقے میں اپنا کاروبار بھی جاری رکھنا چاہتا ہوں۔ ان چند باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ ہم اسے موت کے راستے پر روانہ کر دیں اور پھر لڑکی کو یہاں تلاش کریں۔"

"کیا کہہ رہے ہو بن فرقان، کیا برسوں کی دوستی کا یہی صلہ مل رہا ہے۔" العباص نے کہا۔ لیکن کینہ پرور بن فرقان بے دردی سے ہنسنے لگا۔ ظاہر ہے وہ بردہ فروش تھا جس سنگدل کے دل پر معصوم کلیوں کی آہیں، سسکیاں اور فریادیں اثر نہ کرتی ہوں وہ ایک بوڑھے عمر رسیدہ شیخ کی دوستی کا واسطہ کیسے قبول کر سکتا تھا۔ میں نے اس کے اس رویے سے اس کی شخصیت کے بارے میں مکمل اندازہ لگا لیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ بن فرقان صرف دولت کا دوست ہے، وہ دولت کے ذریعے بہترین دوست رہ سکتا ہے اور جہاں کوئی چیز اس کے مفاد کے آڑے آئی وہ سب بھول جاتا ہے۔ بہرحال مجھے اس سے محتاط رہنا تھا۔

بن فرقان آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور اس نے خنجر میرے ہاتھ سے لے لیا۔ شیخ العباص کے چہرے پر خوف کے آثار گہرے ہوتے گئے اور پھر اس نے چیخنے کی کوشش کی لیکن بن فرقان نے کسی چیتے کی طرح جھپٹ کر اس کو دبوچ لیا۔ اور پھر اس کا چمکدار خنجر العباص کے سینے میں اتر گیا۔ العباص کی چیخ بن فرقان کی انگلیوں میں دب گئی۔ خنجر کئی بار بلند ہوا اور قیمتی قالین میں کچھ اور خوش رنگ نقش و نگار بن گئے۔ بن فرقان نے اسے دھکیل دیا اور پھر اس کے جسم سے خنجر صاف کر کے پیٹی میں اڑس لیا اور میری طرف رخ کر کے بولا۔

"آؤ — اس چھوٹی سی کوٹھی کی تلاشی مشکل کام نہیں ہے۔ تلاشی لینے کے بعد ہم سیدھے بندرگاہ چلیں گے — اور راتوں رات یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ دن کی روشنی ہمارے لئے خطرناک ہے۔"

میں نے کچھ نہ کہا۔ عارف بھی خاموش تھا۔ ویسے ہم بن فرقان جیسے درندے سے بھی خوف زدہ نہیں تھے۔ بلکہ ہم دونوں ہی کے دلوں میں شاہدہ کا غم موجزن تھا۔ نہ جانے وہ بدنصیب کس حال میں ہوگی۔

تلاش بیکار رہی۔ شاہدہ وہاں نہ تھی۔ ہم واپس چل پڑے۔ بن فرقان کے آدمی بے فکری سے خیموں میں آرام کر رہے تھے۔ بن فرقان کے فوری حکم نے انہیں بدحواس کر دیا۔ اور وہ جلدی جلدی روانگی کے لئے تیار ہو گئے اور تھوڑی دیر کے بعد لانچ نے ساحل چھوڑ دیا۔

بن فرقان اپنے آدمیوں میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس کی لائی ہوئی لڑکیاں بدستور اس کی قید میں تھیں۔ ہمارے دل غم سے نڈھال تھے۔ آسمان پر چاند نکلا ہوا تھا اور ہم دونوں لانچ کے ایک حصے میں خاموش کھڑے تھے جب خاموشی طویل ہو گئی تو میں نے عارف کو مخاطب کیا۔

"کیا سوچ رہے ہو عارف؟"

"سوچ رہا ہوں بھائی جان کہ خدا نے ہماری خوشیاں ایک شیطان کے ہاتھوں میں کیوں دے دی ہیں — وہ ہماری قسمت کا مالک کیوں بن بیٹھا ہے۔ ہمارے خاندان کی بربادی اگر خدا کی طرف سے ہوتی تو ہمیں غم نہ ہوتا، لیکن کوئی شیطانی قوتوں کا عامل ہمارے خاندان کو اس قدر ذلیل کر رہا ہے، آخر کیوں؟" عارف کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے۔

"خدا کی مصلحت وہی سمجھ سکتا ہے عارف — یہ امتحان ہے۔ دعا کرو کہ ہم اس امتحان میں ثابت قدم رہیں"

وہ منحوس مجھے بڑی بڑی قوتیں دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ ہوں میں مصائب سے تنگ آکر دنیا کے فریب میں آسکتا ہوں لیکن مجھے اس قوت کی ضرورت نہیں جو انسان کی بخشی ہوئی ہو۔ مجھے تو صرف خدا کا انصاف چاہئے۔ شیطانی قوتوں کا مجھے کیا کرنا ہے۔"

"لیکن اس مسجد میں کیا ہے بھائی جان۔ ایسی کون سی بات ہے اس میں؟ اور وہاں جا کر اس شیطان کی قوت مفلوج کیوں ہو جاتی ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم عارف۔ مجھے بالکل نہیں معلوم۔"

"کیوں نہ یہاں چل کر دیکھا جائے۔"

"ایں ۔۔۔" اس نئے خیال سے میں چونک پڑا۔ یہ خیال آج تک میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ عارف کی بات پر میں غور کرنے لگا۔ اور کافی دیر تک اسے کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس وقت عارف نے پھر کہا۔

"بن فرقان کے بارے میں کیا خیال ہے بھائی جان!"

"کیا مطلب؟"

"اس کی پیشکش پر آپ نے غور کیا؟"

"ہاں، اس پر بھی غور کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے عارف وہ احمق ہے۔ یہ کوئی انسانی مسئلہ نہیں ہے کہ بن فرقان کے ذریعے اسے حل کیا جائے۔ اس کے ساتھی شاہرہ کو کیا تلاش کر سکیں گے؟ دوسرے وہ کس قسم کا آدمی ہے اسے تم جانتے ہو۔ اس کے ساتھ رہنا خطرناک ہے۔ دراصل وہ ہم سے لی ہوئی رقم کے عوض کچھ کرنا چاہتا ہے تاکہ ہم اس سے رقم واپس نہ مانگیں۔ شاہرہ ملے نہ ملے اس سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے بھائی جان۔" عارف نے عجیب سے انداز میں کہا۔

"ایران چل کر ہم اسے چھوڑ دیں گے۔" میں نے کہا اور عارف پر خیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔

وقت گزرتا رہا۔ لانچ تیزی سے سفر کر رہی تھی کافی دیر تک وہاں کھڑے رہنے کے بعد ہم تھک گئے اور وہاں سے ہٹ آئے اور پھر ایک مناسب جگہ دیکھ کر لیٹ گئے۔ اور نہ جانے خیالات کے ہجوم میں کب نیند آگئی۔

سورج کی کرنوں نے ہمیں جگایا۔ لانچ پر بھاگ دوڑ ہو رہی تھی۔ ہم دونوں منہ ہاتھ دھو کر کیبن کی طرف چل دیئے۔ بن فرقان وہاں موجود تھا۔

"آؤ بھئی، میں ناشتہ پر تمہارا انتظار کر رہا تھا مجبوراً ناشتہ کر لیا۔" پھر اس نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا اور وہ ہمارے لئے ناشتہ لے آیا۔

"خوش قسمتی سے ہم بغیر کسی خطرے کے ساحل تک پہنچ گئے۔ اب چند گھنٹوں کا سفر باقی ہے! ایران میں ہم آٹھ دن قیام کریں گے، وہیں رہ کر میں یادداشت کے سہارے تمہاری بہن کی تصویر اپنے آدمیوں کو پہنچا دوں گا اور وہ اس کی تلاش شروع کر دیں گے۔ ہاں کچھ رقم اور خرچ ہو جائے گی، میرا خیال ہے تم اس کا بندوبست کر سکتے ہو۔"

"ہم سب بندوبست کر دیں گے بن فرقان۔" عارف نے عجیب سی مسکراہٹ سے کہا اور بن فرقان گردن ہلانے لگا۔

ایران کے ایک ویران ساحل پر ہماری لانچ رکی۔ یہاں بھی بن فرقان کے آدمیوں نے اس کا استقبال کیا اور ہم سب کو ایک خوبصورت عمارت میں پہنچا دیا گیا۔ جو سرسبز درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ لڑکیوں کو بھی ہمارے ساتھ ہی لایا گیا تھا۔ وہ بے زبان بکتے کی سی کیفیت میں تھیں اور کچھ نہ بولتی تھیں۔ مجھے ان کی حالت

دیکھ کر دل رنج ہوتا تھا لیکن ——— ابن شیطان بن فرقان کے مقابلے میں کیا کر سکتا تھا۔ لیکن یہ میری سوچ تھی۔ عارف مجھ سے مختلف انداز میں سوچ رہا تھا چنانچہ دوپہر کے پرتکلف کھانے کے بعد اس نے کہا۔

"اگر ہم نے تاخیر کی بھائی جان تو آج رات بالکل ان لڑکیوں کا سودا ہو جائے گا! اور پھر یہ معصوم اپنے والدین سے کبھی نہ مل سکیں گی۔"

"ہاں، کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میرا مطلب ہے کہ بن فرقان کی صحبت میں ہمیں کافی وقت گزر چکا ہے، اب ہمیں اسے چھوڑ دینا چاہئے۔ اس کے ساتھ ہی ان لڑکیوں کو اس کی قید سے رہائی بھی دلوانا ضروری ہے۔"

"مگر کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ کون سی بڑی بات ہے، میں ابھی بندوبست کر لیتا ہوں۔" عارف نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"ٹھہرو، میں بھی چلتا ہوں، ہم شیر کی کچھار میں ہیں، میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔" میں نے کہا اور عارف کے ساتھ چل دیا۔ باہر نکل کر ایک آدمی سے ہم نے بن فرقان کے بارے میں پوچھا۔

"شیخ آرام کر رہا ہے۔" اس نے بتایا اور اس کے کمرے کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔

ہم دونوں اس طرف بڑھ گئے۔ بن فرقان کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہم نے اسے دھکیلا اور وہ کھل گیا۔ ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ بن فرقان ایک آرام دہ کوچ پر دراز تھا۔ اور شاید نیم غنودگی کے عالم میں تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے آنکھیں کھول دیں اور خشک لہجے میں بولا۔

"کسی نے تمہیں بتایا نہیں کہ میں آرام کر رہا ہوں — آرام کے وقت میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتا، یوں بھی رات بھر جاگتا رہا ہوں۔"

"ایک ضروری کام تھا بن فرقان۔" عارف نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

اور بن فرقان بُرا سا منہ بنا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ کوچ پر دونوں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اور عجیب سی نظروں سے ہمیں گھورنے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عارف کیا کرنا چاہتا ہے چنانچہ میں خاموشی سے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

"ہم تم سے ان تینوں لڑکیوں کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں بن فرقان۔ جنہیں تم افغانستان سے لائے ہو۔"

"کیسی گفتگو؟"

"انہیں آزاد کر دو، یوں بھی تم نہ جانے کتنی زندگیاں برباد کر چکے ہو۔ نہ جانے کتنے گھروں کے چراغ تم نے بجھائے ہیں، مزید بربادی کی اجازت تمہیں نہیں دی جا سکتی۔" عارف نے کہا۔ اور میں ہوشیار ہو گیا۔ عارف کے الفاظ میں خون کی مہکار تھی! اور پھر میں جانتا تھا کہ بن فرقان سے اس گفتگو کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ وہی ہوا ——— بن فرقان کی آنکھیں خون کی طرح سُرخ ہو گئیں۔

"کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے، یہ کب فضول بکواس لگا رکھی ہے۔" وہ غراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"بکواس نہیں حقیقت ہے، اب ہم دنیا کو تمہارے مظالم سے نجات دلانے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ تمہاری زندگی اب غیر مناسب ہے بن فرقان۔" عارف نے کہا۔

اور بن فرقان طیش کے عالم میں کھڑا ہو گیا اس نے اپنے خنجر کی طرف ہاتھ بڑھایا جو تھوڑے فاصلے پر رکھا تھا۔

لیکن عارف کی پھرتی قابلِ داد تھی۔ اس نے لپک کر خنجر اٹھالیا اور بن فرقان ٹھٹک گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے حیرت نظر آئی لیکن دوسرے لمحے وہ سنبھل کر عارف پر جھپٹا۔ لیکن شاید وہ مجھے بھول گیا تھا کیونکہ جوں ہی وہ عارف پر جھپٹا میرا پاؤں اس کے پاؤں میں الجھ گیا اور وہ بری طرح نیچے گرا۔ اس کے ساتھ ہی عارف اس پر پل پڑا۔ میں نے بن فرقان کا منہ بھینچ لیا اور عارف کا ہاتھ مشینی انداز میں چل پڑا۔

کھچاک کھچاک کی بہت سی آوازوں کے ساتھ ہی بن فرقان کے سرخ خون کی دھاریں ابل پڑیں۔ اس کی آنکھیں اذیت سے باہر نکل آئیں۔ اور پھر اس نے دم توڑ دیا۔ عارف نے اس کے لباس سے خنجر صاف کیا اس کے بعد جیب سے رومال نکال کر خنجر کے دستے کو صاف کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے خنجر لاپرواہی سے ایک طرف ڈال دیا۔ اور مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کر کے خود بھی باہر نکل آیا۔ باہر قدم رکھتے ہی میں ٹھٹک گیا۔ دو آدمی بن فرقان کے کمرے کی طرف آ رہے تھے میرا دل لرز گیا لیکن عارف مجھ سے زیادہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ وہ اطمینان سے آگے بڑھا اور آنے والوں سے پوچھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"بن فرقان کے پاس۔"

"وہ گہری نیند سو گئے ہیں، ہم سے کہا تھا کہ باہر کسی سے کہہ دیں کہ انہیں تین چار گھنٹے سکون سے سونے دیا جائے۔"

"میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ وہ سو رہے ہوں گے ـــ" آنے والوں میں سے ایک نے کہا۔ اور دونوں واپس چل دیئے۔

عارف دوسری سمت چل پڑا تھا میں بھی اس کے ساتھ تھا ہم دونوں نے ایک طویل راستہ اختیار کیا، اور آخر کار دوسروں کی نظروں سے بچتے ہوئے باہر نکل آئے۔ باہر آ کر ہماری رفتار بہت تیز ہو گئی۔ اس شہر میں ہم اجنبی تھے لیکن ہمیں کسی قسم کی جھجک نہیں ہو رہی تھی کیونکہ یہاں کا ماحول ہمارے لئے اجنبی نہیں تھا۔ ہم آگے بڑھتے رہے عارف سڑکوں پر دور دور تک نظریں دوڑا رہا تھا۔ اور پھر وہ تیز قدموں سے ایک طرف بڑھ گیا میں کچھ نہ سمجھ پایا تھا کہ اب وہ کیا کرنا چاہتا ہے لیکن اسے ایک پبلک ٹیلی فون بوتھ کی طرف بڑھتے دیکھ کر میں نے ایک گہری سانس لی۔

ہم دونوں بوتھ میں داخل ہو گئے! اور عارف نے فون کے اوپری حصے پر درج شدہ نمبروں کا چارٹ دیکھا۔ اس میں پولیس ہیڈ آفس، فائر اسٹیشن اور ہسپتال کے نمبر تھے۔ عارف نے ریسیور اتار کر پولیس ہیڈ آفس کے نمبر ڈائل کئے اور آپریٹر کے بولنے پر اس نے کسی بھی بڑے آفیسر سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے کہا کہ چند خطرناک لوگوں کے بارے میں اطلاع دینا چاہتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ایس۔ پی سے بات ہوئی اور عارف نے کہا۔

"آپ کے ریکارڈ میں بن فرقان نامی ایک بردہ فروش کی تفصیل ضرور ہو گی، مجھے بتایئے کیا آپ اس سے واقف ہیں۔"

"ہاں، ہاں، کیونکہ خلیج کی ریاستوں کو شدت سے اس کی تلاش ہے، کیا آپ اس کے بارے میں کوئی اطلاع دینا چاہتے ہیں؟"

"جی ہاں ـــ وہ بن برج کی عمارت نمبر اٹھارہ میں موجود ہے۔ اس کے ساتھ تین اغوا شدہ لڑکیاں بھی ہیں جنہیں اس نے افغانستان سے اغوا کیا ہے۔"

"اوہ، کیا یہ اطلاع درست ہے؟"

"سو فی صدی ـــــ براہِ کرم جلدی کریں۔"

"اطمینان رکھیں، میں ابھی چھاپہ مارتا ہوں۔ کیا آپ اپنے بارے میں بتانا پسند کریں گے؟"

"بس ایک محبِّ انسانیت ہوں۔ خدا حافظ ـــ" عارف نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں عارف کی ذہانت کی دل ہی دل میں داد دے رہا تھا۔ اس نے کس خوبصورتی سے دونوں کام کر ڈالے تھے۔

پھر ہم ٹیلی فون بوتھ سے نکل آئے اور عارف تھوڑی کھجاتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ "فوری طور پر ہمیں کسی ہوٹل میں قیام کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہم کوئی اور فیصلہ کریں گے۔" اس نے کہا اور پھر جیبیں ٹٹولنے لگا۔ "رقم کا بندوبست بھی ضروری ہے۔"

اور اس کی نظریں چاروں طرف بھٹکنے لگیں، اسے کسی شکار کی تلاش تھی۔

"میں ابھی حاضر ہوا بھائی جان۔" اس نے کہا اور مجھے فٹ پاتھ پر چھوڑ کر ایک طرف چل دیا۔

میری نظریں اس کا تعاقب کر رہی تھیں ـــ دور فٹ پاتھ کے نزدیک سفید رنگ کی لمبی کار سے ایک شخص نیچے اتر رہا تھا۔ عارف شاید اسی کو شکار بنانا چاہتا تھا۔ چند منٹ کے بعد عارف اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ کار سے اترنے والی شخصیت کافی بارعب تھی۔ سفید براق شیروانی چوڑی دار پائجامہ، سفید ہی ٹوپی اور سفید داڑھی، سنہری رنگ کے فریم کی عینک، قد تقریباً چھ فٹ، کمر بالکل سیدھی، غرض انتہائی شاندار شخصیت تھی۔ عارف اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ نہ جانے کیوں میرا دل ہول رہا تھا۔ اس سے قبل کبھی ایسی کیفیت نہیں ہوئی تھی۔ میرے قدم بھی اس طرف بڑھ گئے۔ ابھی میں سڑک کراس بھی نہ کر پایا تھا کہ اچانک شور ہوا اور میں سہم گیا۔ میں نے سامنے دیکھا اور میرا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ سفید شیروانی والے نے عارف کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور چند لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ شاید کسی نے عارف کو سفید شیروانی والے کی جیب میں ہاتھ ڈالتے دیکھ لیا تھا۔

میں نے تاریک ہوتے ہوئے ذہن کو سنبھالا، اور فوری طور پر عارف کو بچانے کی ترکیب سوچنے لگا۔ میں عارف کو ذرا بھی تکلیف نہیں ہونے دینا چاہتا تھا، خواہ اس کے لئے مجھے قتلِ عام کرنا پڑتا۔ چند لوگ عارف کی طرف بڑھے لیکن سفید شیروانی والے نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا۔ اتنی دیر میں میں بھی عارف کے قریب پہنچ گیا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اجنبی کے سے انداز میں پوچھا۔

اور سفید شیروانی والے نے چونک کر مجھے دیکھا پھر اس کے موٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کچھ نہیں میاں، یہ لوگ احمق ہیں، یہ صاحبزادے غالباً میری جیب میں اپنی عینک تلاش کر رہے تھے۔ دوسرے لوگ سمجھے کہ یہ جیب کترے ہیں۔ جاؤ میاں جاؤ اپنا کام کرو خواہ مخواہ جمع ہو رہے ہو۔" ان بزرگ نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا اور لوگ منتشر ہو گئے۔

میں محوِ حیرت تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ عارف نے ان کی جیب سے پرس اڑانے کی کوشش کی تھی اور رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اگر وہ صاحب ذرا سا اشارہ بھی کر دیتے تو عارف خاصی مصیبت میں گرفتار ہو سکتا تھا، لیکن اس نے ظرف سے کام لیتے ہوئے عارف کو صاف بچا لیا تھا۔

"آؤ میاں، آپ بھی آئیے شارق صاحب۔"

انہوں نے عارف اور مجھ سے کہا۔ اور میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ انہوں نے مجھے شارق کے نام سے مخاطب کیا تھا جب کہ میں نے زندگی میں پہلی بار ان کی شکل دیکھی تھی۔

"ارے بھئی آؤ ۔۔۔ کیا لڑکیوں کی طرح نخرے کر رہے ہو۔" انہوں نے عارف کو کار میں ٹھونستے ہوئے کہا اور میرے لئے اپنے برابر کا دروازہ کھول دیا۔

عارف اندر بیٹھ گیا تھا۔ بادلِ نخواستہ میں بھی اسٹیرنگ کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اور انہوں نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ ہم دونوں ابھی تک اپنے اعصاب پر قابو نہ پا سکے تھے۔ عارف کا تو چہرہ فق تھا۔

"خاکسار کو مرزا برق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔" تھوڑی دیر کے بعد سفید شیروانی والے نے کہا۔

میرے منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔

"عارف میاں اور تم سے میں بخوبی واقف ہوں۔ کیسے یہ تفصیل سے بتاؤں گا۔"

"میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا ۔۔۔" میں بمشکل کہہ سکا۔

"یقیناً ۔۔۔ یقیناً کہاں دیکھ سکے ہو گے لیکن ہم قدم قدم پر تمہاری ثابت قدمی دیکھ رہے تھے۔" مرزا برق نے کہا۔

بلاشبہ میں نے پوری زندگی میں اتنی متاثر کن شخصیت کا انسان کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں کچھ نہ بول سکا۔ دفعتاً انہوں نے چونک کر عقب نما آئینے میں دیکھا اور پھر بولے۔

"نہیں عارف میاں، میں اس ذلیل باسدیو پر لعنت بھیجتا ہوں۔ الحمدللہ میں مسلمان ہوں اور وہ کافر، غلط فہمی میں پڑ کر غلط اقدامات سے پرہیز کرو۔"

میں نے چونک کر عارف کی طرف چونک کر دیکھا۔

عارف کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اپنی جگہ ساکت بیٹھا تھا۔

مرزا برق نے ایک قہقہہ لگایا اور بولے۔ "صاحبزادے میری گردن ناپنے پر غور کر رہے تھے۔ اس تصور کے ساتھ کہ میں باسدیو تو نہیں ہوں۔"

"آپ کون ہیں؟" میں لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"خدا کا ایک گنہگار بندہ ۔۔۔ اور بس ۔۔۔ مجھے حکم ملا ہے کہ تم دونوں کی مدد کروں، چنانچہ میں حاضر ہو گیا۔ اب یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ عارف میاں کو میری ہی جیب پسند آئی تھی۔"

بات میری سمجھ میں نہ آسکی۔ میں اس پراسرار انسان سے بے حد مرعوب ہو گیا تھا۔ کار کافی دیر تک دوڑتی رہی اور پھر ایک خوشنما بنگلے کے دروازے کی طرف مڑ گئی۔ بنگلے کا پھاٹک کسی نے کھول دیا اور کار اندر داخل ہو کر پورچ میں رک گئی۔ مرزا برق نے اتر کر دروازہ کھولا اور ہم دونوں سے نیچے اترنے کے لئے کہا۔ ہم سحرزدہ سے نیچے آگئے۔ اور مرزا برق ہمیں لے کر اندر پہنچ گئے۔ ایک بڑے سے کمرے میں پہنچ کر انہوں نے ہم سے بیٹھنے کے لئے کہا اور پھر کسی کو آواز دی۔

"ارے بھئی نسترن۔"

نسترن ایک بھاری جسم لیکن خوبصورت چہرے والی عورت اندر آگئی اور اس نے آنکھیں مٹکا کر ہم دونوں کو دیکھا۔

"کیا بات ہے میاں؟"

"بچوں کو ذرا غسل خانے پہنچا دو، اور ہاں ان کے لئے پہلے گرم چائے تیار کر و، غسل کے بعد چائے پئیں گے۔"

"آؤ میاں ۔۔۔" نسترن نے کہا اور ہم دونوں مشینی انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

خوشنما بنگلے کی ترتیب بڑی نفیس تھی۔ دو علیحدہ علیحدہ غسل خانوں میں ہم نے غسل کیا۔ ہمارے لئے ہمارے جسموں کے ناپ کے کرتے پائجامے موجود تھے۔ جنہیں ہم نے پہن لیا۔ عارف اور میں ایک ہی انداز میں سوچ رہے تھے اور سخت حیران تھے کہ یہ بزرگ کون ہیں۔ ان کی پاکیزہ شکل اور پاکیزہ اندازِ گفتگو سے کسی قسم کا شبہ کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا لیکن اب تک انہوں نے جو گفتگو کی تھی وہ بڑی حیرت انگیز تھی۔ آخر انہیں ہمارے بارے میں معلومات کیسے تھیں۔

عارف کے ساتھ ایک کمرے کی طرف جاتے ہوئے میں نے آہستہ سے عارف سے کہا: "کیا تم کار کے اندر مرزا برق پر حملہ کرنے پر غور کر رہے تھے؟"

"ہاں بھائی جان، میں سوچ رہا تھا کہ یہ باسدیو کا کوئی روپ نہ ہو، چنانچہ وہ چند لمحات نہ بولتے، تو میں حالات کی پرواہ کئے بغیر ان پر چھلانگ لگا دیتا۔"

"کیا خیال ہے، قابلِ اعتماد آدمی ہے؟"

"نہ جانے ان کی طرف کیوں دل کھنچ رہا ہے

بھائی جان۔ حالانکہ بڑے پراسرار حالات میں ملاقات ہوئی ہے لیکن دل کہہ رہا ہے کہ وہ ہمدرد شخصیت ہے۔"
میں پرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا اسی وقت نسترن نظر آئی جو ہماری طرف ہی آ رہی تھی۔
"آیئے ــــ" اس نے بدستور آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھیں تھیں بھی بڑی خوبصورت۔ ہم اس کے ساتھ چل پڑے اور عمارت کے ایک دوسرے ہال میں پہنچ گئے۔ یہاں ایک لمبی میز لگی ہوئی تھی میز پر چاندی کے خوبصورت برتن سجے ہوئے تھے جن میں خشک میوے رکھے ہوئے تھے۔ ایک کیتلی سے چائے کی سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ میز کے گرد پڑی ہوئی کرسیوں میں سے

ایک پر مرزا برق ایک باریک کرتے اور پائجامے میں ملبوس بیٹھے تھے۔ بڑا جامہ زیب انسان تھا اس عمر میں بھی کافی دل کش اور حسین نظر آتا تھا۔
حسب عادت پراخلاق مسکراہٹ سے اس نے ہمارا استقبال کیا اور نسترن نے ہمارے لئے بھی دو کرسیاں گھسیٹ دیں اور پھر خاموشی سے چائے کا دور شروع ہو گیا۔ مرزا برق ہم لوگوں سے اس طرح بے تکلف نظر آ رہا تھا جیسے برسوں سے جان پہچان ہو۔ چائے کے بعد میں نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔
"مرزا صاحب، آپ کی نوازشوں کے ہم بے حد شکر گزار ہیں لیکن کتنی تکلیف دہ بات ہے کہ ہم آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ یہ اجنبیت ہمیں سخت الجھن میں ڈالے ہوئے ہے۔"
"میرے بارے میں اتنا جان لینا کافی ہے صاحبزادے کہ خدا کا ایک حقیر گنہگار بندہ ہوں۔ تمہاری افتاد سے واقف ہوں اور میرے مرشد نے مجھے حکم دیا ہے کہ تمہاری مدد کروں۔ باسدیو شیطان کا دوسرا روپ ہے، وہ

گندی قوتوں میں اپنا ثانی نہیں رکھتا لیکن خدا کے کلام کے سامنے کون سی قوت رک سکتی ہے۔ مجھے تمہارے دکھوں کا علم ہے میرے بچے لیکن مشیت ایزدی نیکی اور بدی میں ہمیشہ جنگ رہی ہے۔ گو نیکی ہمیشہ سے فاتح ہے لیکن بدی اپنی یلغار جاری رکھتی ہے۔ البتہ خدا کی راہ میں جو ثابت قدم رہا اس نے نعمتیں بے پناہ پائی ہیں۔ اور ان کے لئے ضروری نہیں ہے کہ موت کے بعد کا ہی انتظار کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ اس کا ایک حصہ دنیا میں بھی عطا کر دیتا ہے۔ ثابت قدمی بڑی چیز ہے، تم نے ثابت قدم رہ کر ایک معصومہ کے ایمان کی حفاظت کی ہے اس کا صلہ تمہیں ضرور ملے گا۔"
مرزا برق کا چہرہ عجیب پراسرار انداز میں چمک رہا تھا۔ اور ہم دونوں حیرانی سے ان کی شکل دیکھ رہے تھے پھر عارف نے پوچھا۔
"تو آپ کو ہمارے کل حالات معلوم ہیں؟"
"ہاں، مجھے ان حالات سے روشناس کرایا گیا ہے۔ مجھے تمہارے دکھوں کی کہانی معلوم ہے۔"
"تب پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ ہمارا نظریہ حیات کیا ہے، ہم کس چیز کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔"
"ہاں ــــ" مرزا برق نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔
"اور میں تمہیں خوش خبری سناتا ہوں کہ شاہدہ محفوظ ہے۔ باسدیو کا ایک ہرکارہ سید ظہیر شاہ کے مزار کی طرف جا نکلا تھا۔ ظہیر شاہ جیسے پاکیزہ بزرگ اس گندے خبیث کی یہ جرأت کیسے برداشت کر سکتے تھے چنانچہ تم نے دیکھا ہو گا کہ سر کٹے ہرکارے کو کس طرح فنا کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح تمہاری بہن کو ترسول کنڈ لے جاتے ہوئے باسدیو کے نمائندے ایک ایسے علاقے سے گزرے جہاں ایک ولی کامل کا قیام تھا۔ مرشد محترم یہ برداشت نہ کر سکے کہ کوئی مسلمان

آبرو یوں ایک شیطان کے قبضے میں ہو، چنانچہ مرشد نے ان گندی ارواحوں کو خاک کر دیا۔ اور تمہاری بہن کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ اب تمہاری بہن طہارت دل کر رہی ہے اس نے اپنی کہانی مرشد کو سنائی اور مرشد نے مجھے حکم دیا کہ تم لوگوں کی مدد کروں۔ شیطان باسدیو کو بھی اس بات کی خبر ہو گئی ہے کہ مرشد تمہاری مدد پہ آمادہ ہو گئے ہیں — چنانچہ وہ مردود اپنی صد ہا سالہ اسکیم کی طرف سے بہت فکر مند ہو گیا ہے۔ اور اب وہ یقیناً نئی گھاتوں کی فکر میں ہو گا۔ دراصل شاہدہ کو ترسول کنڈ میں پہنچانے کا اس کا ایک خاص مقصد تھا۔ وہ یہ کہ اگر تم کسی طرح اس کے فریب میں نہ آؤ اور اپنی منزل پا لو تو وہ شیطان تمہیں اس آخری حربے سے مجبور کر سکے۔ لیکن اس کی یہ زبردست اسکیم فیل ہو گئی ہے۔ بہر حال محتاط رہنا ہو گا۔ شکست بدی کی ہوتی ہے، وہ اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔"

مرزا برق خاموش ہو گئے۔ میرا ذہن ان کے الفاظ میں الجھا ہوا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ذہن و دل بے پناہ خوشی محسوس کر رہا تھا۔ شاہدہ مردود باسدیو کے چنگل سے نکل آئی تھی۔ اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔ بہر حال ان کے خاموش ہوتے ہی میں نے سب سے پہلے یہی سوال کیا۔

"شاہدہ کہاں ہے مرزا صاحب؟"

"مرشد کے قدموں میں، اس کی طرف سے بے فکر رہو۔"

"میں اس سے ملنے کے لئے بے چین ہوں۔ یہ سن کر کہ وہ مجھے مل سکتی ہے میری بے چینی اور بڑھ گئی ہے۔"

"تم اس سے مل سکتے ہو لیکن اس ملاقات کے بعد تمہیں ایک نئی راہ پر چلنا ہو گا۔ ایک انوکھی اور انجانی راہ پر اور اس راہ پر چلنے کے لئے تمہیں اپنے بہن اور بھائی دونوں کو چھوڑنا ہو گا۔ ایک طویل عرصے کے لئے یا شاید ہمیشہ کے لئے۔ غور کر لو۔ کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟"

"یہ کیسی شرط ہے مرزا صاحب۔ اتنے عرصے کے بعد میں اپنی بہن سے ملوں گا اور اتنی جلدی جدا ہو جاؤں گا۔ یہ ظلم ہے۔"

"نہیں یہ ضرورت ہے۔ اس بڑے کام کے لئے جس کے لئے تم منتخب کئے گئے ہو، اور وہ کام بے حد ضروری ہے۔ تمہارا بھائی عارف تمہاری بہن کی نگرانی کرے گا۔ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گا اور ممکن ہے زندگی کے کسی حصے میں تم بھی ان سے آملو۔"

میں گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر میں نے کہا۔ "مجھے منظور ہے مرزا صاحب، مجھے منظور ہے۔" اور عارف گھبرائی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ بھائی جان۔" اس نے کہا لیکن میرے بجائے مرزا برق بول اٹھے۔

"تمہارا بھائی یوں بھی تمہارے لئے نہیں ہے عارف میاں، اسے اپنا فرض پورا کرنے دو۔ یہ فرض بڑی سعادت ہے بڑی خدمت و عظمت ہے اس فرض کی ادائیگی میں۔"

"میرے ذہن میں آپ کی چند باتیں صاف نہیں ہیں مرزا صاحب۔" میں نے کہا۔

"کیا؟"

"نمبر ایک آپ نے کہا کہ باسدیو میری بہن کو ترسول کنڈ لے جا رہا تھا، یہ کون سی جگہ ہے؟ نمبر دو آپ نے کہا کہ باسدیو اپنی صد ہا سالہ اسکیم کی طرف سے فکر مند ہو گیا ہے وہ اسکیم کیا ہے اور یہ صد ہا سالی کیا معنی رکھتے ہیں؟ نمبر تین آپ نے فرمایا تھا کہ شاہدہ کو ترسول کنڈ میں لے جانے کا ایک خاص مقصد ہے کہ اگر میں اس کے فریب میں نہ آؤں اور اپنی منزل پا لوں تو وہ مجھے شاہدہ کے ذریعے مجبور کر سکے۔"

"بڑے مضبوط سوالات کئے ہیں تم نے، لیکن افسوس

میں ان میں سے کسی سوال کا جواب مجھے دینے کی اجازت نہیں ہے۔ بہرحال وقت زیادہ دُور نہیں ہے، سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔" مرزا صاحب نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے، ہم نے بھی کرسیاں چھوڑ دی تھیں۔

"شاہدہ کے پاس ہم کب چلیں گے مرزا صاحب؟" کمرے سے نکلتے ہوئے میں نے پوچھا۔

اور مرزا صاحب چونک کر رک گئے۔

"کب چلنا چاہتے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"ابھی ۔۔۔ اسی وقت" میں نے بے تابی سے کہا۔

"تب رکو ۔۔۔ میں مرشد سے اجازت لے آؤں۔ تمہیں اعتراض تو نہ ہوگا" مرزا برق نے کہا۔

اور پھر عجیب سے انداز میں ہم سے چند گز دُور ہٹ کر کھڑے ہو گئے، پھر انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور ہماری آنکھوں نے ایک حیرت ناک منظر دیکھا۔ مرزا برق کے دونوں بازو پنکھ کی شکل اختیار کر گئے۔ اور دوسرے لمحے وہ پنکھ مارتے ہوئے فضا میں اٹھنے لگے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کسی پرندے کی طرح پرواز کرتے ہوئے ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

یوں تو اب تک کی زندگی حیرت انگیز واقعات میں بسر ہوئی تھی لیکن مرزا برق کا اس طرح پرواز کر جانا ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ کافی دیر تک ہم دونوں بھائی پاگلوں کی طرح کھڑے آسمان کو گھورتے رہے جہاں اب مرزا برق کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ پھر نسترن کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

"اندر تشریف لے آئیے، یہاں کب تک کھڑے رہیں گے" ہم دونوں نے چونک کر اسے دیکھا، ہمارے حواس ابھی تک درست نہیں ہوئے تھے لیکن نسترن کی خوبصورت آنکھوں کی شوخی اور دلفریب مسکراہٹ نے ہمیں ہوش میں آنے پر مجبور کر دیا۔

"نسترن ۔۔۔ مرزا صاحب ۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ ۔۔۔" میں نے کہنے کی کوشش کی لیکن میرے منہ سے جملہ پورا ہونے سے قبل نسترن بول اٹھی۔

"فضا میں پرواز کر گئے ۔۔۔ یہی نا ۔۔۔"

"ہاں" میں نے کہا۔

"اس میں کیا خاص بات ہے۔ خدا نے ہم لوگوں کو یہ طاقت بھی دی ہے۔ صرف مٹی اور آگ کا فرق ہے۔"

"مٹی اور آگ ۔۔۔ میرے منہ سے سرسراتے انداز میں نکلا۔ میں نسترن کا مطلب سمجھ گیا تھا۔" تت ۔۔۔ تو کیا مرزا برق جن ہیں؟"

"اب اندر آ جاؤ میاں، نہ جانے کون سی بات مرشد کے حکم کے خلاف منہ سے نکل جائے۔ میں اس بارے میں کچھ نہ بولوں گی۔" نسترن نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا اور ایک طرف چل پڑی۔

میں اور عارف بادلِ ناخواستہ اس کے پیچھے چل پڑے۔ اور ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔ ہماری ٹانگوں میں کھڑے رہنے کی سکت بھی نہیں رہ گئی تھی اس لئے ہم قیمتی صوفوں پر بیٹھ گئے۔

"کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے میاں ۔۔۔" نسترن نے پوچھا۔

"نہیں، شکریہ" میں نے کہا۔

"اتنی بات بھی میں نے اس لئے بتا دی ہے کہ اگر مرزا جی تم لوگوں سے یہ بات چھپانا چاہتے تو تمہارے سامنے اصلی شکل

مہارانی ایک زہریلی ناگن اُس نے جس کو
بھی ڈسا اُس نے پانی نہ مانگا
عمران ڈائجسٹ کی مشہور سلسلہ وار
پُراسرار کہانی

مہارانی

اب کتابی شکل میں
مکمل ۳ حصے

چالباز مہارانی کی فتنہ انگیزیاں

گوندنی ایک چمارن جو مہارانی بن گئی اور پھر اُس نے اپنی ذہانت اور چالبازی سے راجوں مہاراجوں کو ٹھکانے لگا دیا۔

مہارانی ایک خوبصورت مگر عیّار عورت جس نے سابق مہاراجوں کے محل میں ہلچل پیدا کر دی۔ وہ لوگوں کو دیوانہ بنا دینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

نوجوانوں کی دُشمن مہارانی کا نام ہر زبان پر تھا۔ راج محل میں ہر شخص صرف ایک بات جانتا تھا۔

مہارانی ــ مہارانی ــ مہارانی ــــ؟

آخر یہ مہارانی کون تھی؟

وہ ایک چمارن سے مہارانی کیسے بن بیٹھی

چالباز مہارانی کی فتنہ انگیزیاں جاننے کے لئے پڑھئے عمران ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ مہارانی۔ اب کتابی شکل میں۔ آپ کے شہر کے ہر بک سٹال پر دستیاب ہے۔

مکتبۂ عمران ڈائجسٹ، ۳۷ اردو بازار کراچی

میں نہ آنے۔ خدا حافظ" نسترن نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور دروازے سے باہر نکل گئی۔

میں نے عارف کی طرف دیکھا۔ عارف گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ پھر وہ بھرائے ہوئے سے لہجے میں بولا۔

"تو یہ سب جن ہیں بھائی جان ؟"

"خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ مرزا برقؒ کے پرواز کرنے سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ جن بھی ہیں تو ہمارے لئے نہیں ہیں۔ ان کا رویہ بہت اچھا ہے تم دیکھ چکے ہو۔ اس لئے ہمیں ان سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں خوف زدہ نہیں ہوں۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ جن بھی ہم لوگوں کے درمیان اس طرح رہتے ہیں۔ اب مرزا برق کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ انسان نہیں ہیں وہ کوئی نوابزادے معلوم ہوتے ہیں اور بس۔ اس طرح تو نہ جانے کتنے جن ہمارے درمیان رہتے ہوں گے۔"

"میرا خیال ہے عام طور سے نہیں رہتے، انہیں ویرانے پسند ہیں۔ نہ جانے یہ کس لئے یہاں قیام پذیر ہیں۔ شائد ہماری ہی مدد کرنے کے لئے۔" میں نے پرخیال انداز میں کہا۔

"خدا کا شکر ہے بھائی جان شاہدہ محفوظ ہے۔ ذلیل باسد بونا پاک ارادوں میں ناکام رہا ہے۔ لیکن مرزا برق کی حیرت انگیز گفتگو نے مجھے حیران کر دیا ہے۔ ان کی بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔"

"کون سی باتیں ؟" میں نے پوچھا۔

"مرزا نے جو کچھ کہا تھا کیا وہ سب حقیقت ہے ؟"

"بظاہر ایسا ہی لگتا ہے۔"

"پھر آپ ان ہم دونوں کو چھوڑ دیں گے ؟" عارف نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"خدا کی مرضی کے سامنے تو ہم سب بے بس ہیں عارف، میں قیامت تک تم لوگوں کو نہیں چھوڑ سکتا تھا لیکن میری اس قربانی سے اگر شاہدہ اور تمہیں اچھی زندگی مل سکتی ہے، تو مجھے اعتراض نہیں ہے۔" میں نے بھی عارف سے جدائی کے غم میں ڈبڈباتے لہجے میں کہا۔

بلاشبہ اب تو میں دونوں بہن بھائی میری دنیا میں میرا خاندان تھے۔ شاہدہ سے ملنے کی آس بھی ہو گئی تھی۔ میری خواہش تو یہی تھی کہ دونوں بہن بھائی کے ساتھ زندگی گزار دوں۔ اجڑی ہوئی بہن کو گلے لگا لوں اور نئی زندگی شروع کر کے اس کے ہاتھ پیلے کر دوں۔ عارف کی شادی کر کے اس کے لئے اس کے لئے دلہن لاؤں۔ اور خود ایک بزرگ کی حیثیت سے زندگی گزار دوں۔ لیکن مشیت ایزدی میں کس کو چارہ تھا۔ خدا نے جو کچھ قسمت میں لکھ دیا تھا۔ اس کا پورا ہونا ضروری تھا۔ مرزا برق نے جو کچھ پراسرار باتوں کی طرف اشارہ کیا تھا اور پھر انہیں ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ وہ پراسرار باتیں میرے ذہن میں بھی ادھوری تھیں اور انہیں جاننے کی خواہش بھی میرے دل کے کسی تاریک گوشے میں کروٹیں لے رہی تھی۔ وہ کون سا فرض تھا جو مجھے ادا کرنا تھا لیکن میرے کسی سوال کا میرے پاس جواب نہیں تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد مرزا برق کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

"اس دوران یقیناً تم لوگ میرے ہی بارے میں قیاس آرائیاں کرتے رہے ہو گے۔ بہرحال پہلے خوشخبری سنو، مرشد کا حکم ہے کہ رات کو تم لوگوں کو وہاں سے لے آؤں ابھی شاہدہ کو تمہارے آنے کی اطلاع نہیں دی گئی ہے ورنہ وہ پگلی بھی بے چین ہو جاتی۔ بہرحال تمہیں بھی رات کا انتظار کرنا ہو گا۔ رات کو جب حلقہ ختم ہو جائے گا تو تم وہاں جا سکتے ہو۔"

میں نے گردن ہلا دی۔ مرزا برق بھی ہمارے سامنے ہی

ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

عارف سحرزدہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بچپن سے لے کر جوانی تک ہم لوگوں نے جنوں کے قصے تو بہت سنے تھے۔ لیکن ایک جن کو پہلی بار اس انداز میں سامنے دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی ماڈرن جن ——— جو بلاشبہ حسین ترین شخصیت کا مالک تھا۔

مرزا برق کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

"یہ ہمارا دنیاوی روپ ہے عارف میاں، قدرت نے ہمیں کچھ فوقیت بخشی ہے وہ یہ کہ ہم بوقت ضرورت ہر شکل میں آ سکتے ہیں۔ تم سے ملاقات کے لئے یہ شکل ضروری تھی۔ چنانچہ یہ شکل اختیار کر لی گئی۔" مرزا برق نے حسب معمول عارف کے دل کی بات پڑھ لی اور اس کا جواب دے دیا۔

عارف ایک دم سنبھل گیا۔

چند منٹ خاموشی رہی پھر میں نے پوچھا۔

"باسدیو کے بارے میں کچھ بتاؤ گے مرزا؟"

"باسدیو ——— مرزا برق چند منٹ کچھ سوچتا رہا، پھر بولا۔" اتنا بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ شیطان کے خاص شاگردوں میں سے ہے۔ صدہا سال سے زندہ ہے کیونکہ آب حیات پی چکا ہے۔ ترسول کنڈ کا پجاری ہے اور ترسول کنڈ شیطان کا گڑھ ہے ——— لاکھوں برائیوں کا مرکز، جہاں شیطان اپنے منصوبے بناتا ہے جہاں نیکیوں کو شکست دینے اور انسان کو بدی کی طرف راغب کرنے کی اسکیمیں بنتی ہیں۔ وہ ایک مندر ہے۔ ایک ہندو راجہ نے اسے بنوایا تھا اور اس کے بنانے میں بہت سے جادوگروں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ ہندو راجہ بہت عیاش تھا اور ابدی زندگی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ اپنی عیاشیاں جاری رکھ سکے۔ وہ جادوگروں سے ان کے جادو چھیننے میں کامیاب ہو گیا۔ اور زبردست پراسرار قوتوں کا مالک بن گیا۔ انہیں پراسرار قوتوں کے سہارے وہ چشمہ حیوانات تک پہنچ کر اس کے چند گھونٹ پینے میں کامیاب ہو گیا اور اس ہندو راجہ کا نام ہے باسدیو۔"

"باسدیو۔" میرے اور عارف کے منہ سے یک لخت نکلا۔

"ہاں، وہ باسدیو ہے جو صدہا سال سے زندہ ہے۔ جو ہزارہا برائیوں کا موجد و موجب ہے۔"

میں اپنا اور باسدیو کا موازنہ کرنے لگا۔ کہاں میں ایک عام اور حقیر سا انسان اور کہاں شیطان باسدیو۔ میرا اس کا کیا مقابلہ، لیکن وہ کم بخت میرے لئے وبال جان کیوں بن گیا۔

"خود کو اس قدر حقیر نہ سمجھو شارق میاں۔ خدا کا ایک نیک بندہ لاکھوں شیطانوں سے افضل ہوتا ہے اور اللہ کے نزدیک اس کا مرتبہ بلند ہوتا ہے۔ باسدیو اپنی تمام تر شیطانی قوتوں کے ساتھ تمہارا محتاج ہے اور اپنی لاانتہا زندگی کے کسی حصے میں وہ اس کام میں کامیاب نہیں ہو سکتا جس میں تمہارے ذریعے سے کامیاب ہونا چاہتا ہے، اس لئے حقیر وہ ہوا نہ کہ تم۔"

روشن ضمیر مرزا برق نے میرے دل کی بات پڑھ کر کہا میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ مرزا برق کافی دیر تک ہم سے گفتگو کرتا رہا۔ ہم اس سے بہت مرعوب تھے کیسی انوکھی بات تھی ہم ایک جن کے مہمان تھے اور وہ جن ایک مشفق دوست کی طرح ہمارے ساتھ تھا۔ شام کا کھانا بھی بہت پرتکلف تھا۔ مرزا اصرار کر کے ہمیں کھانا کھلا رہا تھا۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، ہمارے دلوں کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ شاہد سے ملنے کی ایک بار پھر امید ہو گئی تھی۔ اور میرا دل ڈر رہا تھا۔ خدانخواستہ مردود باسدیو کسی اور چال میں کامیاب نہ ہو جائے۔ شاہد تو پھر گم

نہ ہو جائے۔ لیکن پھر مجھے باسد بو کے سر کٹے ہرکارے کا حشر
یاد آ گیا۔ بیشک اللہ نے نیک بندوں کے سامنے شیطانی
قوتیں بالکل ناکارہ ہو جاتی ہیں جس طرح ایک بزرگ کے
جلال سے باسد بو کا ہرکارہ فنا ہو گیا تھا اسی طرح اگر
باسد بو نے ان بزرگ کامل کے مزار پر کوئی حرکت کرنے کی
کوشش کی تو اس کا آب حیات بھی کام نہ کر سکے گا۔

"تمہارا خیال بالکل درست ہے" میرے سامنے بیٹھے
ہوئے مرزا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس خیال کو
دل سے نکال دو کہ باسد بو کی کوئی چال مرشد کے مزار اقدس
پر بھی کامیاب ہو سکتی ہے۔ مرشد کی شان نرالی ہے۔ میرے
جیسے سینکڑوں جو ان کے مرید ہیں اور ان کے اشارے پر
پوری دنیا الٹ پلٹ کر دینے پر تیار رہتے ہیں۔"

میں شرمندہ ہو گیا اور احتیاط کرنے لگا کہ کوئی ایسی
بات دماغ میں نہ آنے جو ان بزرگ کی شان کے خلاف ہو۔

آخر وہ وقت آ گیا جب مرزا نے ہم سے کہا کہ ہم
مرشد کے مزار پر چلنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ ہم دونوں بھائیوں
نے وضو کیا اور مرزا کے آئندہ قدم کا انتظار کرنے لگے۔ آخر
مرزا ہمارے پاس آ گیا۔ اور پھر اس نے ہم سے آنکھیں بند کرنے
کے لئے کہا۔ ہم نے اس کی ہدایت کے مطابق آنکھیں بند کر لیں
اور چند سیکنڈ کے لئے ہمارے ذہن تاریک ہو گئے۔ ہماری سمجھ
میں نہ آیا کہ ہم کہاں ہیں، کیا کر رہے ہیں۔ پھر مرزا ہی کی آواز
کانوں میں گونجی۔

"آنکھیں کھول دو۔"

اور ہم نے آنکھیں کھول دیں۔ قرب و جوار میں نظریں
دوڑاتے ہی ہم چونک پڑے۔ ہم ایک لق و دق صحرا میں کھڑے
تھے۔ دور دور تک طویل میدان اور چٹانیں بکھری پڑی تھیں۔
کہیں کہیں جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں جو چاند کی روشنی میں انتہائی
عجیب اور پراسرار نظر آ رہی تھیں۔ دور ـــــ ایک ننھی سی
روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں نے عارف اور پھر ہم دونوں نے
مرزا کی طرف دیکھا جو ہماری داہنی سمت موجود تھا۔

"وہ مرشد کا مزار ہے" مرزا نے روشنی کی طرف اشارہ
کیا اور آگے بڑھ گیا۔

ہم اس کے ساتھ چل پڑے۔ ناہموار راستہ بہت کٹھن
تھا لیکن اس وقت ہمارے دل محبت سے دھڑک رہے تھے
وہاں شاہدہ تھی اس بار وہ کسی شیخ کے قبضے میں نہیں تھی،
بلکہ ایک برگزیدہ بزرگ کی پناہ میں تھی۔ اب وہ ہمیں ضرور
مل جائے گی۔

ہماری آتش شوق اور بھڑک اٹھی اور ہم مرزا سے بھی
دو قدم آگے نکل جانے کی کوشش کرنے لگے لیکن مرزا تو
ہمارا سایہ تھا۔ اس کا فاصلہ ہم سے وہی رہا جو تھا۔ اور پھر
ہم مزار کے قریب پہنچ گئے۔ اس ویران علاقے میں سفید
رنگ کا خوبصورت حجرہ بنا ہوا تھا جس کے سامنے کے طاق
میں ایک چراغ جل رہا تھا۔ قرب و جوار میں عجیب سی بھنبھناہٹ
پھیلی ہوئی تھی جیسے بے شمار لوگ آہستہ لہجے میں کچھ پڑھ
رہے ہوں لیکن دور دور تک ہم تینوں کے علاوہ اور کوئی
نہیں تھا۔

"فاتحہ پڑھ لو" ـــــ مرزا نے کہا۔

اور ہم دونوں بھائی فاتحہ پڑھنے لگے۔ مرزا بھی ہمارے
ساتھ شریک ہو گیا۔ فاتحہ پڑھتے پڑھتے ہماری آنکھیں خود بخود
بند ہو گئیں۔ اور پھر جب ہماری آنکھیں کھلیں تو ہم ہزاروں
انسانوں کا مجمع دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ سب زمین پر بیٹھے
عبادت میں مشغول تھے۔

"یہ سب مرشد کے خادم ہیں۔ سب میرے ہم نسل ہیں۔
اور روزانہ یہاں عبادت کرتے ہیں۔" ہمارے دل خوف سے
لرزنے لگے۔ یہ سب جن تھے۔

"آؤ ـــ" مرزا نے ہم سے کہا اور ایک ایسے راستے

کی طرف چل پڑا۔ ادھر لوگ نہیں تھے اس طرح ہم مزار کے
عقب میں پہنچ گئے اور پھر مرزا نے ایک طرف اشارہ
کیا اور ہماری نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں۔

چاندنی میں ہم نے ایک پرنور شکل دیکھی وہ جائے نماز
پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سر پر سفید دوپٹہ تھا اور نظریں جھکی ہوئی
تھیں۔ وہ شاہدہ تھی۔ میری پیاری بہن۔ میرا کلیجہ پھٹنے لگا
میرا دل چاہا کہ سینہ چیر کر اسے سینے میں چھپا لوں۔ عارف
کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہ تھی۔ ہم لرزتے قدموں سے
اس کے قریب پہنچ گئے۔ اس نے سلام پھیرتے ہوئے پہلے دائیں
اور پھر بائیں دیکھا اور پھر دو مردوں کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔
دوپٹہ اس نے چہرے پر ڈال لیا۔ میں نے لرزتے لہجے میں اسے
آواز دی۔

"شاہدہ!"

اور نہ جانے میری آواز کیسی تھی کہ وہ دیوانوں کی طرح کھڑی
ہو گئی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھا اور پھر عارف
کو اور پھر ایک دلدوز چیخ مار کر وہ میری طرف لپکی اور مجھ
سے لپٹ گئی۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ میں بھی زار و قطار
رو رہا تھا۔ نہ جانے میری مردمی کہاں گئی تھی۔ عارف نے ہم
دونوں کو بازوؤں میں بھر لیا۔ اس کی سسکیاں بھی سنائی دے
رہی تھیں۔ نہ جانے کتنی دیر شاہدہ مجھ سے لپٹی سسکتی رہی وہ
رو رو کر دیوانی ہوئی جا رہی تھی جیسے دل کی بھڑاس نکل گئی
تھی اور میں اور عارف اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہے
تھے۔ بار بار شاہدہ چہرہ اٹھا کر مجھے دیکھتی۔ میں اس کی کیفیت
سمجھ رہا تھا۔ وہ یقین کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ میں ہی
ہوں یا اسے دھوکہ ہوا ہے۔ اس کی آنکھوں میں جنونِ بے قراری
اور استعجاب کی ملی جلی کیفیتیں رقصاں تھیں۔ پھر وہ رندھی ہوئی
آواز میں بولی۔

"بھائی جان، کیا یہ آپ ہی ہیں، کیا میں یقین کر لوں کہ یہ
خواب نہیں ہے۔ میری تو زندگی ہی خواب بن گئی ہے۔ خدارا
اگر یہ خواب ہے تو مجھے یہ خواب کیوں دکھایا۔ اس خواب کو
دیکھنے کے بعد میں برسوں سسکتی رہوں گی۔"

"شاہدہ، یہ خواب نہیں حقیقت ہے، بالکل حقیقت۔
آخر خدا کو ہم پر ترس آ ہی گیا۔ اس نے اس بچے کھچے خاندان کو
دوبارہ ملا ہی دیا۔ میری بہن یہ خواب نہیں ہے۔" عارف نے
دل سوز آواز میں کہا اور شاہدہ بھیا کہہ کر اس سے لپٹ گئی۔
اور پھر ہم مزار شریف کے عقب میں لگی ہوئی گھاس پر بیٹھ
کر گفتگو کرنے لگے۔ ہم نے شاہدہ کو امی کے بارے میں
بتایا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔
میں نے شاہدہ سے کہا کہ میں اس کے اوپر بیتنے والی تمام
حقیقت سے واقف ہوں اس لئے وہ مجھے کچھ بتانے
کی کوشش نہ کرے۔

الغرض ہمیں باتیں کرتے ہوئے تمام رات گزر گئی۔ اور
وقت کا ذرا بھی احساس نہ ہوا۔ صبح کی اذان کی آواز سنائی
دی اور شاہدہ چونک کر اٹھ گئی۔ وہ نماز پڑھنے چلی گئی اور
میں اور عارف مزار کے اردگرد کی سیر کرنے لگے۔ اذان دینے
والا ہمیں کہیں نظر نہ آیا۔ بہرحال ہمیں اس بات پر حیرت نہ
ہوئی کیونکہ ہم جانتے تھے کہ یہاں کسی انسان کا گزر تو ناممکن
ہے اور جنوں کے لئے ضروری نہیں ہے کہ انسان انہیں ہر
وقت دیکھ سکے۔ ابھی ہم سیر ہی کر رہے تھے کہ ایک طرف
سے نسترن آتی نظر آئی۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے حیرت
ہوئی لیکن پھر خود بخود یہ حیرت ختم ہو گئی۔ کیونکہ نسترن مرزا
برق کے ساتھ نظر آئی تھی۔ اسے انسان سمجھنا حماقت تھی۔

"پانی گرم ہے، منہ ہاتھ دھو لیں، ناشتہ تیار ہے۔"

"ارے نسترن تم یہاں بھی موجود ہو۔" عارف نے کہا۔

اور نسترن آنکھیں مٹکانے لگی۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب
سی مسکراہٹ تھی۔ بہرحال ہم دونوں نے گرم پانی سے منہ

دھو یا، شاہدہ، نماز سے فارغ ہو کر آ گئی۔ ہم نے مزار کے ایک حصے
میں بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ نسترن تمام وقت
ہمارے ساتھ ہی رہی۔ پھر جب ہم ناشتہ کر چکے تو نسترن نے
مجھ سے کہا۔

"مرزا برق مزار شریف کی پشت پر آپ کے منتظر ہیں۔"

"اوہ۔" میں جلدی سے اٹھ گیا۔ اور مزار کی پشت
کی طرف چل دیا۔ درحقیقت مرزا برق وہاں موجود تھا۔ وہ
پشت پر ہاتھ باندھے ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے
ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بہن سے ملاقات پر مبارکباد قبول کرو۔" اس نے کہا۔

"شکریہ مرزا۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔" میں نے ممنون
انداز میں کہا۔

"ارے نہیں، میرا شکریہ ادا کر کے مجھے کیوں شرمندہ
کر رہے ہو شارق۔ میں تو صرف ایک کارکن ہوں، ہدایات
تو اوپر سے ہی ملتی ہیں۔ بہرحال شاہدہ تمہیں مل گئی۔ اب تم
اس کام کی تیاری شروع کر دو شارق جس کے لئے تم نے پورا
گھر لٹا یا ہے۔ ویسے مرشد کی اجازت ہے کہ اگر تم ایک ہفتہ
شاہدہ کے ساتھ رہنا چاہو تو کسی کو اعتراض نہ ہوگا، لیکن
نیک کام میں تاخیر کبھی پسند نہیں کی گئی۔"

"میں تیار ہوں مرزا۔ مجھے کیا کرنا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"آستہ بن ـــــ مجھے اس وقت صرف یہ معلوم کرنا تھا
کہ تمہاری کیا خواہش ہے۔ کیا تم کچھ عرصہ آرام کرنا چاہتے ہو
یا اپنے فرض کی انجام دہی کے لئے تیار ہو۔ بہرحال شام کو
ملنے کے بعد تمہیں کچھ تفصیل بتائی جائے گی اور اس کے بعد
تمہیں اپنا کام شروع کر دینا ہوگا۔"

میں نے گردن ہلا دی اور مرزا برق مجھ سے مصافحہ
کر کے چلا گیا۔

بظاہر اب میری زندگی کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ میرے
خاندان کے دو افراد زندہ تھے عارف اور شاہدہ ـــ میری
خواہش تھی کہ انہیں کے ساتھ بقیہ زندگی گزاردوں لیکن
شاہدہ سے ملاقات سے قبل مرزا نے مجھ سے عہد لیا تھا اور
اب میں عہد شکنی نہیں کر سکتا تھا۔ باسدیو کی شیطانی قوتوں
کے مقابلے میں مجھے کچھ ایسی روحانی قوتیں مل گئی تھیں جو ان
شیطانی قوتوں کو مفلوج کر سکتی تھیں۔ میں ان قوتوں کو ناراض
نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور دل کی بات آپ کو بتا دوں، اب
مجھے بھی اس عجیب و غریب راز سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔
آخر باسدیو اس مسجد میں کیوں داخل ہونا چاہتا ہے اس کام
کے لئے اس نے مجھے ہی کیوں منتخب کیا ہے اور وہ کون سا
راز ہے جس کے لئے وہ شیطان ایسی کوشش کر رہا ہے ـــ
باسدیو کے بارے میں مرزا نے مجھے جو تفصیل بتائی تھی وہ بھی
میرے لئے حیران کن تھی۔

مرزا مزار کے سامنے والے حصے کی طرف جا کر غائب
ہو گیا اور میں عارف اور شاہدہ کے پاس پہنچ گیا۔ عارف اسے
اپنی جدوجہد کی داستان سنا رہا تھا۔ وہ شاہدہ کو ضروری باتیں
بتا چکا تھا اور شاہدہ اداس تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے بولی۔

"آپ ہم سے پھر جدا ہو جائیں گے بھائی جان؟ خدارا
ایسا نہ کریں، اب میں آپ کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔"

"میں خود بھی تم لوگوں کو آنکھوں سے اوجھل نہیں کرنا
چاہتا شاہدہ، لیکن تمہاری بہتر زندگی اور ان فرعونی
قوتوں کو شکست دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ میں ان بزرگوں
کے کہنے پر عمل کروں، اور پھر میری جدوجہد کو نیکی سے تعبیر کیا
گیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کون سا نیک کام ہوگا، بہرحال
جب ایسے ایسے لوگ اس کے بارے میں کہہ رہے ہیں، تو یقیناً
کوئی اچھی بات ہی ہوگی۔ بہرحال مطمئن رہو اگر زندگی رہی
تو کبھی نہ کبھی تمہیں تلاش کر کے تم سے آ ملوں گا۔" میں نے

کہا اور شاہدہ سسکیاں بھرنے لگی۔

"تم بالکل فکر مت کرو شاہدہ، عارف تمہارا پورا پورا خیال رکھے گا میری درخواست ہے عارف کہ اب تم سنبھل جاؤ، ٹھوکریں انسان کو عقل دیتی ہیں مجھے تم پر کسی حد تک اعتماد ہے بس خوف یہ ہے کہ سکون کی زندگی ملتے ہی تم پھر نہ بہک جاؤ، شاہدہ تمہاری ذمہ داری ہے تم نے اس کے حصول کے لئے جو کچھ کیا ہے اس کی قدر کرنا"

"میں شاہدہ کے لئے اپنی زندگی وقف کر دوں گا بھائی جان" عارف نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا اور ماحول سوگوار ہو گیا۔

پورا دن ہم نے گفتگو کرتے ہوئے گزارا بہترین کھانے پینے کے وقت پر نہ جانے کہاں سے نمودار ہوتی اور ہمارے لئے کھانے کا بندوبست کر کے غائب ہو جاتی۔ پھر رات ہو گئی۔ اور مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ گونجنے لگی۔ قدموں کی آہٹیں، لباس کی سرسراہٹ، جیسے ہزاروں انسان جمع ہوں۔ حلقہ ہو رہا تھا۔ اور یہ کیفیت ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ اس کے بعد مرزا میرے پاس آیا اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"آؤ" اس نے کہا اور میں ایک نگاہ شاہدہ اور عارف پر ڈال کر اس کے ساتھ چل پڑا۔

میں نے ان بے شمار لوگوں کو دیکھا جو گردنیں جھکائے بیٹھے ہوئے تھے۔ مرزا مجھے ایک بے حد ضعیف شخص کے پاس لے گیا۔ جس کی داڑھی ناف تک لٹکی ہوئی، چہرے سے بے پناہ رعب ٹپکتا تھا ضعیف العمر شخص نے میری طرف نظریں اٹھائیں۔ خدا کی پناہ، ان آنکھوں میں کیسا جلال تھا۔ لیکن پھر ان کے ہونٹ مسکرائے۔ اور ان سے ایک لرزتی آواز نکلی۔

"آفرین ہے تیری ثابت قدمی پر، بے شک انسان مصیبتوں میں پھنس کر گناہ کی دلدل کی طرف دوڑنے لگتا ہے لیکن تو نے اس گناہ سے بچنے کے لئے اپنا پورا گھر لٹا دیا۔ بلاشبہ تو اس منصب کے قابل ہے جو تجھے ملنے والا ہے۔ بلاشک تیری وجہ سے اس فرعون کا منہ کالا ہوگا۔ اور وہ عذاب کی قبر میں دفن ہو جائے گا۔ میں تیری پیشانی پر فتح کا نور چمکتا دیکھ رہا ہوں۔"

پھر ان بزرگ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کالے رنگ کا حلقہ نکالا اور اسے میری کلائی میں ڈال دیا۔ پھر وہ مرزا برق کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے۔

"آؤ — میرے ساتھ آؤ" انہوں نے کہا اور میں ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ صرف چند لمحات پھر نہ وہ مزار تھا اور نہ ویرانہ۔ ایک عجیب پراسرار سا جنگل تھا جہاں چاروں طرف سوکھے درخت کھڑے تھے۔ بزرگ رک گئے۔ اور انہوں نے مجھ سے کہا۔

"اپنے دونوں ہاتھ پھیلاؤ"

میں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا اور حیران رہ گیا میرے دونوں ہاتھ شیشے کی طرح شفاف اور چمکدار تھے۔ میں ان ہاتھوں میں دیکھتا رہا۔ اور پھر ان پر مناظر ابھرنے لگے۔ بالکل ٹیلی ویژن کی طرح۔ میں نے ان میں تارا گڑھ کے ٹھکانے دیکھے جنہیں میں بخوبی پہچان گیا۔ سیبوں کے باغات دیکھے اور اس کے بعد وہ پہاڑی علاقہ دیکھا جہاں باسدیو سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ پھر کچھ اور آگے کے مناظر، اس کے بعد وہ مسجد نظر آئی جس میں باسدیو داخل ہونا چاہتا تھا۔

اور پھر میں نے خود کو مسجد کے دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ میرے نتھنوں میں عود و عنبر کی خوشبوئیں گھس گئیں۔ اور میں نے خود کو ایک نیم تاریک ماحول میں محسوس کیا۔ میں قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ میرے سر پر بلند محراب تھے جن کے نیچے سے میں گزر رہا تھا۔ اور پھر ایک بہت بڑے ہال میں پہنچ گیا۔ یہاں ایک پراسرار ہلکی نیلی روشنی پھیلی ہوئی

تھی۔ اور اس روشنی میں ایک چمکدار مسہری نظر آ رہی تھی جس
کے پائے شائد کسی دھات کے تھے اور اس مسہری پر کوئی
محوِ خواب تھا۔

مسہری پر چاروں طرف مکڑی نے جالا تنا ہوا تھا۔
بالوں کے باریک تار چاندی کی طرح چمک رہے تھے میں اس
سوتے ہوئے انسان کو دیکھنے لگا۔ اور پھر ایسا محسوس ہوا
جیسے کیمرہ کسی چیز کے قریب پہنچ جاتا ہے اب مجھے سوتے
والے کا چہرہ بھی نظر آنے لگا۔ اور میرا دل زور سے دھڑکا۔
وہ ملکوتی چہرہ جس پر ایک ابدی مسکراہٹ تھی۔ وہ محوِ خواب
حسن میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر گیا۔ میری عجیب سی کیفیت
ہونے لگی۔ میں ان تاثرات کو الفاظ نہیں دے سکتا ہوں نے
شارق بزمی کی حیثیت سے درجنوں کہانیاں لکھی تھیں ان
کہانیوں کی ہیروئینیں اکثر حسن کا اعلیٰ ترین معیار ہوتی تھیں
لیکن میں پورے اعتماد سے کہتا ہوں کہ میرا تخیل کبھی اس قدر
بلند نہیں ہوا۔ میں اس حسن بے مثال کے بارے میں کبھی سوچ
بھی نہ سکا۔ جو اب میرے سامنے تھا۔ میں سحر زدہ ہو گیا۔ لیکن
وہ میری سمجھ میں نہ آسکی۔ اس کے ملکوتی حسن پر مردنی چھائی
ہوئی تھی۔ اور پھر اس کے گرد تنا ہوا مکڑی کا جالا۔ وہ کب
سے اس جالے میں محصور ہے اور پھر میرے ذہن کے کچھ
اور دریچے کھلے۔

"کیا باسدیو اسی کے لئے مسجد میں داخل ہونا چاہتا
ہے۔ مگر کیوں؟"

"اس لئے کہ وہ اس معصوم ہستی کو نرسول کنڈ کی داسی
بنانا چاہتا ہے" بزرگ کی آواز سنائی دی۔

اور میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ بزرگ میری آنکھوں
میں دیکھ رہے تھے۔ میں نے پھر اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا
لیکن اب وہاں کچھ نہیں تھا۔

میرا دل ڈوبنے لگا۔ اس چہرے کو دیکھنے کے بعد میرے
دل کو قرار نہیں رہا تھا۔ میں پہلی بار عشق کی لذت سے روشناس
ہوا تھا۔ میرے جیسا انسان جس کا دل مصائب نے چھلنی کر
دیا تھا۔ میں جو حسن و عشق کی چاشنی محسوس کرتا تھا لیکن اب
اسے بھول چکا تھا۔ ایک بار پوری قوت سے عشق کرنے لگا
تھا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں اس چہرے پر فریفتہ ہو
گیا ہوں۔

میں آنکھیں مل مل کر اس چہرے کو دیکھنے لگا۔ کوشش
کرتے لگا۔ اور بزرگ نے پھر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"وہ صدہا سال سے سو رہی ہے۔ ایک طویل نیند۔
اسے صرف تم جگا سکتے ہو۔ صرف تم ——— اس کی زندگی کے
تار تم سے وابستہ ہیں"

"مگر وہ کون ہے؟"

"ابھی یہ بتانے کا وقت نہیں آیا۔ ابھی تمہیں بہت کچھ
کرنا ہے۔ اگر میں نے تمہیں حقیقت بتادی تو تمہاری جستجو ختم
ہو جائے گی۔ ہاں اتنا ضرور بتاؤں گا کہ وہ تمہارا انتظار کر رہی
ہے۔ صدہا سال سے۔ اور اگر تمہاری لگن میں ذرا بھی کھوٹ
پیدا ہوئی تو پھر باسدیو کا جادو چل جائے گا۔ اور وہ نرسول
کنڈ کی داسی بن جائے گی۔ باسدیو امر ہو جائے گا شیطان
آزاد ہو جائے گا۔ اور باسدیو کی صدہا سال کی محنت بار آور
ہو جائے گی"

"مجھے کیا کرنا چاہئے محترم بزرگ؟"

"جدوجہد، باسدیو کے ہتھکنڈوں سے بچتے ہوئے جاؤ
اور اپنے شہر تارا گڑھ پہنچ جاؤ، پھر اس مسجد میں تنہا داخل
ہو جاؤ، وہ تمہاری منتظر ہے۔ مسجد میں داخل ہونے کے بعد
ہی تمہیں پتہ چل سکے گا کہ تم اسے کیسے جگا سکو گے"

میں نے تھوک نگلتے ہوئے گردن ہلا دی بہت سارے
وسوسے میرے دل میں سر ابھار رہے تھے۔ اپنے وطن میں میں
ایک مفرور قاتل تھا جس کی پولیس کو تلاش تھی۔ صدہا

مصائب میرے منتظر تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرے دل کی ایک اور خواہش تھی۔ کسی بھی طرح ہو، اس مسجد میں داخل ہو کر اس عین خوابیدہ کو دوبارہ دیکھوں، اس کی پرستش کروں اس خواہش نے میری ہمت جوان کر دی۔

"میں وہاں جانا چاہتا ہوں محترم بزرگ۔"

"تو پھر جاؤ۔ اپنے لئے خود راہیں تلاش کرو خدا تمہاری مدد کرے۔" بزرگ نے کہا اور دوسرے لمحے وہ میری نظروں سے غائب ہو گئے۔

چاروں طرف لق و دق صحرا تھا اور میں تنہا۔ بے یار و مددگار۔ لیکن —— ایک عزم تھا، ایک حوصلہ تھا۔ ایک موہنی صورت میری ہمت جوان کر رہی تھی۔ عارف اور شاہدہ کو چھوڑنے کا غم مجھے ضرور تھا لیکن اب اس غم میں وہ شدت نہ تھی۔ میں نے دل ہی دل میں انہیں خدا حافظ کہا اور سیدھا چل پڑا۔ میں جانتا تھا کہ میرے مصائب کا دوسرا دور شروع ہو چکا ہے۔ لیکن پہلے دور اور اس دور میں فرق تھا پہلے میرے چاروں طرف مایوسی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ میری زندگی کی کوئی راہ نہیں تھی لیکن اس بار ایک روشنی تھی جو دیوانہ وار مجھے کھینچ رہی تھی۔ ایک خواہش ایک لگن تھی۔ اور میں نے اس لگن کو اپنی منزل بنا لیا اور چل پڑا۔

رات کے اندھیرے مجھے خوفزدہ کرتے رہے۔ درندوں کی چیخوں سے جنگل گونج رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں کسی صحیح راستے پر جا رہا ہوں یا کسی اور گھنے جنگل کی طرف۔ بس میں چل رہا تھا۔ تیز قدموں سے۔ میرا سفر عجیب تھا۔ کئی بار چند درندے میرے قریب سے گزرے اور مجھے گھورتے ہوئے نکل گئے۔ نہ جانے انہوں نے میری طرف توجہ کیوں نہیں دی تھی۔

پھر ظلمت شب چھٹنے لگی۔ روشنی کی کرنیں آسمان صاف کرنے لگیں۔ اور پھر اوپر کے کام کو ختم کرنے کے بعد زمین کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ سورج جنگلوں کے آخری سرے سے بلند ہو رہا تھا۔ پرندے غول در غول سفر کر رہے تھے۔ میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں، کیونکہ پچھلی رات بھی میں شاہدہ سے گفتگو کرتا رہا تھا۔ طویل سفر کی وجہ سے بھوک بھی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی لگ رہی تھی مگر میرے پاس کھانے کو تو کچھ نہیں تھا۔

میں نے اپنی حالت پر غور کیا۔ بے یار و مددگار —— خالی ہاتھ، ویران جنگل، تن تنہا —— میں اتنا طویل سفر کیسے کر سکوں گا۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میں کہاں ہوں، اپنے وطن پہنچنے کے لئے مجھے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ مجھے اپنی کیفیت سے خوف ہونے لگا۔ گو اس امتحان میں کامیابی کی منزل بے حد حسین ہے لیکن اس کٹھن صورت حال کا مقابلہ بھی تو آسان نہیں ہے۔

میں چلتا رہا۔ بھوک شدید ہوتی رہی۔ پرندے اور دوسرے جانور میرے سامنے سے گزرتے رہے لیکن میں نہتا بھی تھا کوئی ہتھیار نہیں تھا جس سے شکار کرنے کی کوشش کرتا۔ اور دور تک جنگل پھیلا ہوا تھا لیکن کوئی ایسا درخت نہیں تھا جس پر کسی قسم کے پھل ہوتے۔ عجیب عجیب سے درخت تھے جنہیں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

کافی دور چلنے کے بعد مجھے ایک چشمہ نظر آیا اور میں تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ پانی بھی اس وقت نعمت معلوم ہوا۔ میں نے پیٹ بھر کر پانی پیا۔ اور تھوڑی دیر آرام کرتے لیٹ گیا۔ اس کے بعد مجھے خبر نہ رہی۔ نہ جانے کتنی دیر سویا تھا۔ اور ایسی گہری نیند کہ سورج کی تپش بھی مجھے نہ جگا سکی۔ آنکھ کھلی تو سورج سر سے گزر چکا تھا۔ اور شام کی آمد آمد تھی۔ میرا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ میں اٹھا۔ چشمے میں منہ ہاتھ دھویا، تھوڑا سا پانی پیا اور پھر چل پڑا —— گو بھوک اب بھی لگ رہی تھی لیکن سونے کے بعد حالت قدرے بہتر ہو گئی تھی۔ اس لئے اس بار میری رفتار تیز تھی۔ اب آخری

کی چوٹیوں کی دوسری طرف پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ گویا یہ جنگل ختم ہو رہا تھا میرے قدم تیزی سے اٹھنے لگے اور شام جھکنے سے قبل میں جنگل عبور کر گیا۔ چھوٹے چھوٹے جانور خوف زدہ ہو کر بھاگنے لگے۔ میں اس وقت تک دوڑتا رہا جب تک میرے دونوں پاؤں میں سکت رہی۔ اور پھر جب قدم اٹھانا دوبھر ہو گیا تو اسی جگہ بیٹھ گیا۔ چاروں طرف چٹانیں بکھری ہوئی تھیں میں حسرت سے ان چٹانوں کو دیکھنے لگا۔ خدا جانے یہاں سے نکلنا بھی نصیب ہوتا ہے یا نہیں میں نے دل میں سوچا۔

لیکن مایوسی کفر ہے۔ اگر میں نے ہمت ہار دی تو پھر کچھ بھی نہ کر سکوں گا۔ شام اب تیزی سے جھک رہی تھی۔ میں نے پلٹ کر جنگل کی طرف دیکھا تاکہ اندازہ لگا سکوں کہ کتنی دور نکل آیا۔ اور یہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا کہ اب جنگل کا نام و نشان نہیں ملتا تھا۔ گویا میں نے اس عرصے میں بہت کافی سفر کر لیا تھا۔ تھوڑی دیر ستانے کے بعد میں ایک اونچی چٹان کی طرف بڑھا تاکہ دیکھ سکوں کہ قرب و جوار میں کوئی بستی، کوئی آبادی تو نہیں ہے۔"

چٹان پر چڑھنا میرے بھوکے اور تھکے ہوئے آدمی کے لئے بہت مشکل تھا لیکن میں اس میں کامیاب ہو گیا۔ چٹان پر پہنچ کر میں نے تاحد نگاہ نظریں دوڑائیں، خشک اور بنجر پہاڑیوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ میرے دل میں مایوسی کروٹیں لینے لگی۔ اس حالت میں میں ان چٹانوں کو کیسے عبور کر سکوں گا۔ بھوک اور تھکن سے نڈھال میں اسی جگہ لیٹ گیا۔ نیچے سخت اور کھردری زمین تھی۔ لیکن مجھے کوئی احساس نہیں تھا۔ اس وقت سب سے بڑا احساس بھوک کا تھا۔ اب تو پانی بھی میسر نہیں ہو سکتا تھا۔

رات ہو گئی اور میں یونہی پڑا رہا۔ اور پھر قدرت کو مجھ پر رحم آ گیا۔ یعنی مجھے نیند آ گئی۔ گہری نیند بلکہ بالفاظ دیگر غشی نے مجھے بھوک پیاس سے بے گانہ کر دیا۔ اور میں صبح تک اسی طرح پڑا رہا۔ صبح کو سورج کی تیز کرنوں نے میرے جسم کو جھنجوڑا اور میری بے ہوشی ختم ہو گئی۔ لیکن کیفیت یہ تھی کہ زبان سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ ہاتھ پاؤں من من بھر کے تھے میں انہیں ہلانے میں ناکام رہا۔

مجھے اپنی زندگی کی انتہا نظر آنے لگی۔ اور میں اس انتہا سے خوف زدہ ہو گیا ـــــ ہاں میں ـــــ جس نے خودکشی کرنے کے لئے ریل کی پٹڑی پر گردن رکھ دی تھی۔ مجھے اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اب موت کو قریب دیکھ کر میں پریشان تھا۔ میں زندہ رہنا چاہتا تھا، میں نے اپنے حواس مجتمع کئے اور اپنی حالت پر غور کرنے لگا۔

بیشک میں بھوک سے نڈھال تھا۔ میرے قویٰ مفلوج ہو گئے تھے، لیکن موت سے اتنی جلدی شکست قبول کر لینا تو مردانگی نہیں ہے مجھے اپنا عزم بروئے کار لانا چاہئے۔ ایک کوشش اور سہی۔ موت تو آنی ہی ہے۔ پھر جدوجہد کرتے ہوئے کیوں نہ جان دی جائے۔ میں نے اس تصور کو دل سے نکال دیا کہ میں بے جان ہاتھ پاؤں کا مالک ہوں۔ میں نے سوچ لیا کہ میرا جسم میرے تابع ہے۔ میں اس سے ہاتھ پاؤں کا کام لے سکتا ہوں۔ اور اس نئے عزم کے تحت میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں چٹان سے نیچے اتر آیا۔ اور ایک طرف چل پڑا۔ میرا ذہن تاریک تھا لیکن قدم مضبوط تھے۔ بس میں چل رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ میں اس سفر کے دوران کیا سوچ رہا تھا۔ بس چل رہا تھا۔ چلا جا رہا تھا۔ پتھر میرے قدموں تلے تھے۔ اور پھر ـــــ میں زمین کے اختتام تک پہنچ گیا۔

ہاں ـــــ اس وقت میں نے یہی سوچا تھا کہ شاید زمین ختم ہو گئی ہے۔ یہ زمین کا آخری کنارہ ہے کیونکہ اس کے دوسری طرف تاریکی تھی۔ مکمل تاریکی۔ میں نے اس تاریکی میں جھانک کر دیکھا لیکن نیچے کی تاریکی اور گہری

تھی۔ مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ اور میں پلٹ پڑا۔ آگے راستہ ختم
ہے گویا۔ میں نے غلط راستے کا انتخاب کیا ہے۔ میں نے
بائیں طرف دیکھا اور پھر ادھر چل پڑا۔ نہ جانے کتنی دیر چلتا
رہا اور پھر وہی تاریکی۔ یہ بھی ویسا ہی کنارہ تھا۔ میں چلتا رہا۔
مختلف سمتوں میں۔ اور پھر یہ تاریکی چاروں طرف مسلط ہو گئی۔
سورج چھپ گیا تھا۔ مگر میں چلنا چاہتا تھا۔ تاکہ کوئی منزل
پا لوں۔ اور میں چلتا رہا۔ روشنی نہ سہی تاریکی سہی۔ اور پھر
مجھے روشنی نظر آ گئی۔

ہوں، وہ روشنی ہی تھی۔ شاید کوئی چراغ۔ اور اسے
دیکھ کر میری امیدوں کے چراغ روشن ہو گئے۔ میں نے ڈوبتے
ذہن کو سنبھالا۔ مجھے اپنے جسم کا ہوش نہیں تھا۔ وہ تو ایک مشین
تھی جو بغیر ایندھن کے چل رہی تھی۔ اگر میں اس مشین کے
بارے میں سوچنے لگتا تو ایک قدم بھی نہ چل سکتا۔ روشنی قریب
آتی گئی۔ اور میں اپنے دل کو بہلاتا رہا۔

بس اب منزل قریب ہے، بالکل قریب۔ اور منزل
قریب آ گئی۔ میرا دل مسرت سے جھوم اٹھا۔ وہ ایک
عمارت تھی۔ سیاہ پتھر سے بنی ہوئی عمارت اور اس کے اوپری
کلس پر یہ چراغ جل رہا تھا۔ چراغ کی روشنی بہت تیز تھی،
اس کے قرب و جوار کا ماحول منور تھا۔ اور اسی روشنی میں
میں نے اس عمارت کو دیکھا۔ عجیب سی عمارت تھی ۔۔ کسی
مقبرے کی طرح۔ اوپر مندر کا سا کلس تھا۔ بہرحال مجھے اس
عمارت کی بناوٹ سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میں تو صرف
ایک بات سوچ رہا تھا۔ جہاں روشنی جل رہی ہے اس لئے
زندگی بھی ضرور ہو گی۔ میں بے چینی سے عمارت کا دروازہ
تلاش کرنے لگا۔

دروازہ دوسری طرف تھا۔ میں گھوم کر عمارت کے
دوسرے حصے میں پہنچ گیا۔ جو اصل میں سامنے والا حصہ تھا۔
عمارت میں داخلے کے دو دروازے تھے، لیکن دونوں نامکمل۔

ان کی شکل کچھ عجیب سی تھی۔ اس وقت میں نے اس شکل
پر توجہ نہ دی اور اندر داخل ہو گیا۔ اندر کا منظر دیکھ کر میری
آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ایک حسین باغ لگا ہوا تھا
جس میں چاروں طرف پھولوں کے تختے تھے۔ باغ پھولوں
سے مہک رہا تھا۔ درمیان میں ایک روش تھی جس کے
دونوں طرف پانی کے حوض بنے ہوئے تھے۔ ان حوضوں
میں کنول کھلے ہوئے تھے۔ روش کا اختتام ایک دروازے
پر ہوتا تھا۔ جو سنہرے رنگ کا تھا۔ دروازہ سونے کی طرح
چمک رہا تھا۔

میں اس بند دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس سے
قبل کہ میں دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا۔ اس کے بند
کواڑ خود بخود کھل گئے۔ اور تیز روشنی باہر چھنکنے لگی میں اس
خیرہ کر دینے والی روشنی کو نظر انداز کر کے اندر داخل ہو گیا۔
اور میری آنکھوں میں رنگ بکھر گئے۔ ہاں باریک کپڑوں
میں ملبوس دو قیامتیں میرے سامنے کھڑی تھیں۔ انہوں نے
ہندو داسیوں کے سے لباس پہنے ہوئے تھے جن سے ان کے
عریاں جسم کا ایک ایک خط نمایاں تھا۔ میں حقیقت کہہ رہا
ہوں۔ ان دونوں کو دیکھ کر کچھ دیر کے لئے میں اپنی بھوک
پیاس بھول گیا۔ ان کے حسین جسم میرے رگ و پے میں سنسنی
پیدا کر رہے تھے۔ اور ان کے یاقوتی لبوں پر پھیلی ہوئی دلکش
مسکراہٹ میرا خیر مقدم کر رہی تھی۔

پھر وہ صبا کے جھونکوں کی طرح آگے بڑھیں اور انہوں
نے دونوں طرف سے میرے بازو پکڑ لئے۔ ان کے نرم و نازک
ہاتھ اپنے بازوؤں پر محسوس کر کے میں بے خود ہو گیا۔

"آئیے مہاراج ۔۔" انہوں نے مترنم آواز میں کہا اور
مجھے آگے لے جانے لگیں۔ میں بے خودی میں ان کے ساتھ
آگے بڑھتا گیا۔ اور وہ مجھے لئے ہوئے سنگ مرمر سے بنے
ہوئے ایک کمرے میں داخل ہو گئیں۔ یہاں ایک حوض بنا ہوا

تھا جس کے کنارے پتھر کی ایک سل تھی اور ایک عجیب سی تھالی میں کچھ چیزیں رکھی ہوئی تھیں جنہیں میں نہیں جانتا تھا۔

"مہاراج پہلے اشنان کر لیں اس کے بعد بھوجن ہوگا۔"

ان میں سے ایک نے کہا۔

میں تو کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں تھا اس لئے کچھ نہ بول سکا۔ میں تو اس وقت بھی کچھ نہ کہہ سکا جب ان حسیناؤں نے اپنے کومل ہاتھوں سے میرا لباس اتارا۔ انہوں نے میرا مکمل لباس اتار کر مجھے برہنہ کر دیا اور پھر ان میں سے ایک نے پیتل کے چمکدار لوٹے سے حوض سے پانی نکال کر اور مجھے پتھر کی سل پر بٹھا دیا۔ اس کے مرمریں ہاتھ میرے جسم پر پھسل رہے تھے اور میں نہ جانے کون سی دنیا میں پہنچ گیا تھا۔

چمکدار تھال سے وہ کچھ نکال کر میرے جسم پر ملنے لگیں۔ اور میں انہیں روک بھی نہ سکا۔ نیم گرم پانی سے انہوں نے مجھے خوب اچھی طرح نہلایا۔ اور پھر کمرے کا دروازہ کھول کر ایک لڑکی اندر داخل ہو گئی۔ یہ بھی حسن و جمال میں دوسری لڑکیوں سے کم نہ تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک بڑا سا تھال تھا جس میں ایک خوب صورت لباس رکھا ہوا تھا۔

چوڑی دار پائجامہ، سلیم شاہی جوتے اور چمکدار شیروانی پہنا کر انہوں نے مجھے تیار کر دیا۔ میں ان کی کسی بات میں مداخلت نہیں کر رہا تھا۔ پھر آنے والی نے ایک صافہ اٹھا کر میرے سر پر باندھا اور پھر ایک پیالی میں رکھا ہوا صندل اٹھایا۔ وہ میری پیشانی پر تلک لگانا چاہتی تھی۔ لیکن اس وقت میں چونک پڑا۔

میں نے اس کا نازک ہاتھ پکڑ لیا۔ جو اپنی انگلیاں صندل میں ڈبو کر میری پیشانی تک لے جانا چاہتی تھی۔ اور وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔ اچانک جیسے مجھے ہوش آ گیا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ انہوں نے میرا جسم دھلایا ہے اور مجھے سخت شرم محسوس ہوئی۔ بیشک وہ حسینائیں دنیا کا چنیدہ حسن رکھتی تھیں لیکن میں اس حد تک نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے انہیں اپنا جسم برہنہ کرنے کی اجازت نہیں دینا چاہئے تھی۔

اس سوچ کے ساتھ ہی میرے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں بیدار ہو گئیں۔ وہ کون تھیں۔ اس ویرانے میں یہ عجیب و غریب عمارت کیا اسرار رکھتی ہے۔ گو میری بھوک اور تھکن کی وہی حالت تھی لیکن اپنا اب تک کا کٹھن سفر یاد تھا۔ اب میں پوری طرح سوچ سمجھ سکتا تھا۔

"کیا بات ہے مہاراج، چندن نہیں لگوائیں گے۔"

ایک نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں" میں نے سخت لہجے میں جواب دیا۔ اور اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

لڑکی نے پیالی کے کناروں سے انگلیاں صاف کیں اور پھر وہ تینوں دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ میں ان کے ساتھ تھا۔ وہ مجھے لئے ہوئے ایک اور خوب صورت کمرے میں پہنچیں۔ یہاں ایک لمبی میز لگی ہوئی تھی جس پر سونے چاندی کے گنگا جمنی برتن سجے ہوئے تھے۔ انہوں نے میرے لئے ایک کرسی گھسیٹی اور میں بیٹھ گیا۔

پھر حسین لڑکیوں کا ایک پورا غول اندر آ گیا۔ ان کے ہاتھوں میں تھالیاں تھیں جن میں انواع اقسام کے کھانے تھے۔ گو میں سمجھ گیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے اور یہ مناسب جگہ نہیں ہے۔ لیکن میں نے سنا ہے کہ چند فاقوں کے بعد حرام بھی حلال ہو جاتا ہے۔ میں تو بھوک کی وجہ سے قریب المرگ تھا پھر بظاہر کوئی ایسی چیز بھی نہیں تھی جسے کھانے میں مجھے اعتراض ہوتا۔ چنانچہ میں کھانے پر ڈٹ گیا۔ اور خوب سیر ہو کر کھایا۔

کھانے کے بعد میرے ہاتھوں اور پیروں میں سنسنی ہونے لگی۔ اور آنکھوں میں غنودگی چھانے لگی ــ دو تین لڑکیوں نے مل کر مجھے اٹھایا اور اس کمرے سے نکال لائیں۔

مجھے ایک دوسرے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں ایک اعلیٰ درجے کا چھپر کھٹ موجود تھا۔ میں نیند سے بے تاب ہو رہا تھا چنانچہ جوتوں سمیت چھپر کھٹ پر جا پڑا۔ اور اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

ایک پرسکون نیند لینے کے بعد جب میری آنکھ کھلی تو شاندار دن نکل آیا تھا۔ روشنیاں گل تھیں اور قدرتی اجالا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور گزرے ہوئے واقعات پر غور کرنے لگا۔ رات کی باتیں خواب کی باتیں معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن وہ خواب نہیں تھا۔ میرے جسم کے نیچے اب بھی نرم بستر تھا۔ میں نے دوبارہ آنکھیں کھول کر کمرے کے ماحول کو دیکھا۔ انتہائی نفیس کمرہ تھا۔ دیواروں پر تصاویر آویزاں تھیں۔ لیکن یہ تصاویر ہندو ازم سے متعلق تھیں۔ دیوی دیوتاؤں کے بے شمار روپ دکھائے گئے تھے۔

ان میں چند تصاویر بے حد شرمناک تھیں ـــــ میں چھپر کھٹ سے اٹھ بیٹھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے جسم پر کپڑے نہیں ہیں جو ان لڑکیوں نے پہنائے تھے۔ گویا انہوں نے دوبارہ میرا لباس بدلا۔ اس وقت میرے جسم پر ریشم کا ایک گون سا تھا۔ لیکن اسے صرف گون بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کچھ عجیب سا لباس تھا۔ مجھے پھر شرم آنے لگی اور میں حالات پر غور کرنے لگا۔

یہ کون سی جگہ ہے اور یہاں میری یہ آؤ بھگت کیوں ہو رہی ہے؟ اچانک مجھے باسدیو کا خیال آیا۔ کیا یہ سب باسدیو کی حرکت ہے۔ ورنہ پھر یہ ہندوانہ جگہ۔ اوہ ـــــ اگر وہ اپنی کسی سازش میں کامیاب ہو گیا ہے تو بہت برا ہوا ـــــ میں اپنے آئندہ اقدام پر غور کرنے لگا۔ پھر دروازہ کھلا اور دو بالکل نئی شکلیں نظر آئیں۔ یہ بھی بہت حسین لڑکیاں تھیں۔

"اشنان کریں گے مہاراج۔" ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

"تب لباس بدل لیں، بھوجن تیار ہے۔" دوسری بولی۔ اور ایک طرف رکھا ہوا لباس اٹھا کر میرے پاس پہنچ گئی۔ دوسری میرے لبادے کے بند کھولنے لگی لیکن میں نے اس کا ہاتھ روک دیا۔

"تم باہر جاؤ، میں لباس بدل کر ابھی آتا ہوں۔" میں نے کہا۔

اور وہ حیرت سے میری شکل دیکھنے لگیں۔ پھر ان میں سے ایک اداس آواز میں بولی۔

"کیا مہاراج ناراض ہیں، داسی سے کوئی بھول ہو گئی ہے؟"

"نہیں، بس میں لباس خود پہن لوں گا۔ تم باہر میرا انتظار کرو۔" میں نے کہا۔

اور وہ دونوں گردنیں جھکا کر باہر نکل گئیں۔

میں نے لباس تبدیل کیا اس دوران میں حالات پر غور کرتا رہا تھا۔ میرا ذہن پوری طرح بیدار تھا۔ بھوک بھی رفع ہو چکی تھی اور تھکن بھی۔ دماغ ایک ہی بات سوچ رہا تھا۔ بلاشک یہ سب کچھ باسدیو کی کارستانی ہے۔ وہی مجھے یہاں تک لایا ہے۔ اور اب کسی نئے جال میں پھانسنا چاہتا ہے۔

اور پھر مجھے ان بزرگ کی ایک ایک بات یاد آ گئی۔ انہوں نے کہا کہ میں جدوجہد کروں اور باسدیو کے ہتھکنڈوں سے بچتا ہوا تاراگڑھ پہنچ جاؤں۔ شاید ان کا اشارہ انہی ہتھکنڈوں کی طرف تھا۔ میں باسدیو کے چکر میں پھنس گیا تھا اور اب مجھے اس چکر سے نکلنا تھا۔ یہاں بے شمار حسین جال تھے۔ یہ خوبصورت لڑکیاں، خودسپردگی کا انداز اختیار کئے ہوئے تھیں۔ ہر ایک میرے ایک اشارے پر سب کچھ کرنے کو تیار تھی۔ میں یہاں راجہ اندر بن سکتا تھا۔

لیکن مجھے سنبھلنا تھا۔ مجھے باسدیو کے اس طلسم کو توڑنا تھا۔
ہوشیاری سے۔ چالاکی سے۔

اور پھر میری نگاہوں میں مکڑی کا ایک جالا اُبھر آیا۔

اور اس جالے میں محبوس ایک حسین چہرہ۔ اس حسین چہرے کے سامنے تمام حسن ماند پڑ گیا۔ اور میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ میں بے قرار ہو گیا۔ اور اس بے قراری کے عالم میں میں اپنا عزم تازہ کر کے باہر نکل آیا۔

دونوں حسین لڑکیاں میری منتظر تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ جھکیں اور پھر میرے ساتھ چل پڑیں۔

راستے میں ان کے ساتھ چلتے ہوئے میں نے ان میں سے ایک کا بازو پکڑا اور وہ مجھ سے لگ گئی۔

"مجھے ایک بات بتاؤ۔" میں نے سرگوشی سے پوچھا۔

"حکم کریں مہاراج۔" وہ ادب سے بولی۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ترسول کنڈ۔" اس نے جواب دیا۔ اور میرے قدم جم گئے میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اس مکروہ جگہ آ پھنسوں گا۔ ترسول کنڈ کے بارے میں مجھے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ ان کے تحت مجھے اس سے نفرت ہو گئی تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ شیطان کا گڑھ ہے حالانکہ یہاں کی جو کیفیت تھی اسے دیکھ کر بڑے بڑے عابد و زاہد پھسل سکتے تھے۔ چاروں طرف حسین اور نیم برہنہ لڑکیوں کا جمگھٹ، ایک سے ایک اعلیٰ حسن اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ خود سپردگی کا انداز لیے ہوئے صرف میری نگاہ کی دیر تھی۔ جس کی طرف ملتفت ہو تا وہ اپنا سب کچھ میرے حوالے کرنے کو تیار تھی۔

لیکن میں جانتا تھا کہ شیطان کے جال بے حد حسین ہوتے ہیں۔ گناہ کی ظاہری شکل اچھی نہ ہو تو کوئی انسان گناہ نہ کرے اس لئے مجھے اس جال سے بچنا تھا اگر میرے محسن اور خدا کے نیک بندے مجھے اس طلسم سے ہوشیار نہ کر دیتے تو شاید میرے قدم بہک جاتے لیکن اب میں سنبھل گیا تھا۔ مجھے راجہ باسدیو کے بارے میں پوری پوری معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ وہ شیطان ابدی زندگی حاصل کر چکا تھا۔ لیکن ابھی اس کی یہ زندگی مکمل نہ ہوئی تھی اور اس کے لئے اسے میرے

اُردو زبان میں پہلی بار
خواتین کے لئے
ایک خوبصورت تحفہ

پین ورک و تھریڈ ورک

قیمت
۱۸ روپے

بے شمار جدید و نت نئے ڈیزائن جنہیں آپ گھر میں بیٹھ کر کتاب میں دی گئی تراکیب کو دیکھ کر باآسانی خود بنا سکتی ہیں۔

ناشر
مکتبۂ کون
اردو بازار
کراچی

سہارے کی ضرورت تھی۔ میں نے حالات پر غور کیا۔ زمین کا ختم ہو جانا، چاروں طرف تاریکی نظر آنا، یہ ثابت کرتا تھا کہ وہ مجھے گھیر کر یہاں تک لایا ہے۔ اس وقت جب میں بھوک اور تھکن سے نڈھال ہو چکا تھا تو اس نے میری مجبوری سے فائدہ اٹھایا۔

لیکن اب میں سنبھل چکا تھا۔ اب میں آسانی سے اس کے قابو میں نہیں آ سکتا تھا۔

"چلئے مہاراج رک کیوں گئے"، میرے جسم سے چمٹی ہوئی لڑکی نے محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہاں ___؟"

"بھوجن تیار ہے" لڑکی نے کہا

"میں نہیں کھاؤں گا!" میں نے کہا اور لڑکی سے خود کو چھڑا لیا۔ وہ سہم سی گئی اور لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"داسی سے کوئی بھول ہو گئی ہے مہاراج، شما کر دیں، اس نے دونوں ہاتھ جوڑ لئے۔ اس کی شکل پر بے پناہ معصومیت تھی اور پھر اس کے ہاتھ جوڑنے کا انداز۔ میرا دل دھڑکنے لگا اور اس پر رحم سا آنے لگا۔ لیکن اچانک میں سنبھل گیا۔ یہ سب حسین دھوکے تھے۔ اس وقت جب میں عقل و خرد سے بیگانہ تھا۔ بھوک اور تھکن نے میری سوچنے سمجھنے کی قوت چھین لی تھی۔ اگر میں نے شیطان کے اس گڈھے میں کچھ کھا پی لیا تھا تو اس میں میرا قصور نہیں تھا لیکن اب میں ٹھیک تھا میرے ہوش قائم تھے اور میں مزید چار دن کے فاقے کر سکتا تھا تو اس شیطان کا نمکخوار کیوں بنوں۔

"تم سے کوئی بھول نہیں ہوئی ہے۔ لیکن اس شیطان سے میری پرانی دشمنی ہے جو ترسول کنڈ کا مالک ہے تم سب جاؤ میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں" میں نے کہا۔

"اگر ہم آپ کو خوش نہ رکھ سکے مہاراج تو ہم سب کو کشٹ بھوگنا ہو گا، شما کریں۔ ہماری زندگیاں عذاب میں نہ ڈالیں"۔

"جاؤ" میں نے گرج کر کہا: اور وہ دونوں سہم کر رہ گئیں، پھر خوفزدہ نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی چلی گئیں۔ میں نے خود پر پوری طرح کنٹرول کیا۔ مجھے اس طلسم سے ہر قیمت پر نکلنا تھا۔ چنانچہ میں آگے بڑھ گیا۔ اس کمرے سے نکل کر میں ایک کمرے میں آ گیا۔ یہاں بھی کئی لڑکیاں موجود تھیں ان کے مرمریں جسم پر صرف باریک پٹیاں لٹکی ہوئی تھیں اور ان کا انداز اس قدر ہیجان خیز تھا کہ کنپٹیوں میں دھمک ہونے لگی۔ لیکن میں نے ذہن جھٹک دیا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ جو جو مناظر میرے سامنے آ رہے تھے انہیں دیکھ کر دل چاہ رہا تھا کہ نیکی بدی کا تصور چھوڑ دوں اور خود کو ان مناظر میں گم کر دوں لیکن یہی تو آزمائش کی منزل تھی۔ اگر مجھے یہی سب کچھ کرنا ہوتا تو باسدیو کی پہلے دن کی بات مان لیتا اور ہر قوت سے بیگانہ ہو کر اسے مسجد میں داخل کر دیتا۔ اس کے بعد یہ سب کچھ ہوا تھا۔

لیکن میں نے قربانیاں دی تھیں۔ میں نے اپنا گھر بار لٹا دیا تھا۔ میں نے وہ تکلیفیں اٹھائی تھیں کہ دوسرا انسان صرف ان کے تصور سے خوفزدہ ہو کر مر جائے' اور اب جب میری منزل قریب تھی، میں اس طلسم میں ڈوب کر اپنی منزل کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے قدم میں مضبوطی پیدا کی اور اس کمرے سے بھی نکل آیا۔

عجیب پیچ در پیچ عمارت تھی۔ نہ جانے کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں ختم ہوئی تھی۔ ایک اور دروازے سے نکل کر میں ایک پتلے سے کوریڈور میں آ گیا۔ جہاں ایک چوبی دروازہ نظر آ رہا تھا۔ دروازے میں سونے کی کیلیں جڑی ہوئی تھیں۔ یہاں قدم قدم پر زر و جواہر کے انبار موجود تھے لیکن مجھے ان سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ میں نے دروازے کو دھکیلا اور ایک عجیب پر سحر موسیقی نے میرے قدم روک لئے

کیا آپ نے یہ پراسرار کہانیاں پڑھ لیں؟

محمود خاور کی لکھی ہوئی بچوں کی پراسرار سیریز کے تمام ناول شائع ہو گئے ہیں

انوکھی بلا	حصہ اول	۷/۵۰
بلا کا ہنگامہ	حصہ دوئم	۷/۵۰
خوفناک انسان	حصہ اول	۷/۵۰
پراسرار کتا	حصہ دوئم	۷/۵۰
انوکھا ہنگامہ	حصہ اول	۷/۵۰
بھیانک غار	حصہ دوئم	۷/۵۰
روحوں کا محل	حصہ اول	۷/۵۰
چمگادڑوں کا راز	حصہ دوئم	۷/۵۰
سمندری بلا	حصہ اول	۷/۵۰
مشینی آفت	حصہ دوئم	۷/۵۰
سانپ کے قیدی	حصہ اول	۷/۵۰
ڈھانچوں کی سلطنت	حصہ دوئم	۷/۵۰
سائے کی آواز	حصہ اول	۷/۵۰
خوفناک روشنی	حصہ دوئم	۷/۵۰

اور خاص نمبر

سر کٹا شیطان قیمت ۲۲/۵۰

یہ تمام کتابیں حاصل کرنے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ ـ ۳۷ اردو بازار کراچی فون ۲۱۶۳۶۱

موسیقی کی لہریں دروازہ کھلتے ہی پیدا ہوئی تھیں۔ ایک انوکھی اور عجیب لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ موسیقی میری سماعت کے ذریعہ میرے جسم میں پیوست ہوتی جا رہی تھی اور میری آنکھیں وفورِ بیخودی سے بند ہونے لگیں۔ میرے ہونٹ خود بخود مسکرانے لگے اور میرے قدم اندر کھینچنے لگے۔ میں اندر داخل ہو گیا اور موسیقی کی لے تیز ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی دھیمے سروں میں ایک گیت بھی شروع ہو گیا۔ بہار کی آمد کا گیت جہاں ایک حسین دوشیزہ کا محبوب ایک طویل عرصہ کے بعد واپس آ گیا تھا اور اور دوشیزہ محبوب کی آمد کی خوشی میں مست ہو کر گا رہی تھی۔

آہستہ آہستہ میری آنکھیں کھل گئیں۔ پورے ہال پر ہفت رنگ کہر چھایا ہوا تھا۔ اس کہر میں سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ مرمریں جسم کی برہنہ دوشیزائیں ستار، ربط اور دوسرے ساز لئے سنگ مرمر کے پتھروں پر بیٹھی تھیں۔ ان کے سازوں سے نغمے ابل رہے تھے اور ہونٹوں سے گیت پھوٹ رہے تھے اور ان کے درمیان ایک پتھر کا ہنس نظر آ رہا تھا۔ راج ہنس اور اس سفید راج ہنس پر ایک قیامت جلوہ فگن تھی۔

حسن، اس قیامت پر ختم تھا۔ اس کا شفق رنگ چہرہ بڑی بڑی شربتی آنکھیں، یاقوت سے تراشے پنکھڑیاں جیسے ہونٹ سڈول اور نیم عریاں جسم جس پر گلابی رنگ کا لبادہ پڑا اس جسم کی رعنائیوں کو اور نمایاں کر رہا تھا۔ اس کے موتی جیسے دانت اندھیرے کی کرن کی طرح جگمگا رہے تھے اور اس کی آنکھوں میں بے پناہ محبت تھی۔

کون دیوانہ تھا جو اس حسن بے پناہ کو دیکھ کر پاگل نہ ہو جاتا ــــ!

محبت کا نغمہ اور حسن منتظر۔ میرے حواس منتشر ہو گئے اور اس نے بازو پھیلا دیئے۔ میرے دونوں ہاتھ بھی آگے بڑھے اور قدم بے اختیار اس کی طرف اٹھنے لگے۔ وہ راج ہنس پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آغوش وا تھی اور آنکھیں منتظر تھیں۔ اس طرح بیٹھنے سے اس کے جسم پر پڑے ہوتے ہوا کی طرح باریک لبادے کی سلوٹیں بھی مٹ گئیں اور اس کا اچھلتا جسم میرے سامنے نمایاں ہو گیا۔ وہ دنیا کا سب سے حسین سب سے سڈول جسم تھا۔ میں کشاں کشاں اس کے قریب پہنچ گیا وہ محبت بھرے انداز میں کھڑی ہو گئی۔ اس کی مدھر آواز میرے کانوں میں گونجی۔

"آؤ میرے محبوب۔ میری آغوش تمہارا انتظار کر رہی تھی ہنس اداس تھا، سیج سونی تھی۔ آؤ اسے آباد کریں۔ وصال ملن کا گیت گا رہی ہیں۔ تمنا پیاسی ہے آؤ من مندر میں سما جاؤ"
اور اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر مجھے ہنس پر آنے کے

جھوٹ کی عادت

"کمال ہے۔" انٹرویو لینے والے جرنلسٹ نے کمال عاجزی سے پوچھا "کیا آپ چائے نہیں پیتیں؟"

"جی نہیں۔"

"اور سگریٹ؟"

"وہ بھی نہیں۔"

"شراب؟"

"بالکل نہیں۔"

"گوشت تو آپ ضرور کھاتی ہوں گی؟"

"جی نہیں، بالکل نہیں۔"

"کمال ہے اتنی بڑی ہیروئن ہونے کے باوجود آپ میں کوئی عیب نہیں۔"

"عیب ــــ جی عیب تو بس ایک ہی ہے۔"

"وہ کیا؟" جرنلسٹ نے سراپا تصویر بن کر پوچھا۔

"مجھے جھوٹ بولنے کی عادت ہے۔" ہیروئن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

لئے سہارا دیا۔ لیکن اس کا ہاتھ میری کلائی پر پڑتے ہوئے اس حلقے پر پڑ گیا۔ جو مجھے اس بزرگ نے دیا تھا۔

اور اچانک بجلی سی کوند گئی۔ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی ایک چمک ہوئی اور اس کے ساتھ ہی چیخیں بلند ہونے لگیں نغمے ختم ہو گئے اور ایک عجیب سی افراتفری مچ گئی۔ میں ہوش میں آ گیا اور سراسیمہ ہو کر اس قیامت کو دیکھنے لگا۔ میں نے اپنے سامنے کھڑی ہوئی حسین عورت کو دیکھا۔ اور میری آنکھیں شدت حیرت سے پھیل گئیں۔

کیونکہ اب اس عورت کی جگہ باسدیو کھڑا تھا۔ کریہہ شکل بوڑھا جو اس حسین عورت کے روپ میں آیا تھا۔

میں بوکھلا کر اس کی شکل دیکھنے لگا اور پھر میں نے گرد و پیش کے ماحول پر نگاہ ڈالی۔ سنگ مرمر کے پتھر اب بھی یونہی تھے لیکن ان پر بیٹھ کر نغمے گاتی ہوئی لڑکیاں اب خوفناک شکل چڑیلوں میں بدل گئی تھیں جن کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں دانت لمبے اور نوکیلے اور چہرے دہشت خیز تھے۔

باسدیو میرے ہاتھ میں پڑے ہوئے کڑے کو دیکھ رہا تھا اور میں صورتحال سمجھ چکا تھا، باسدیو نے مجھے جال میں پھانسنے کی مختلف کوششوں کے بعد یہ ایک اور کامیاب کوشش کی تھی۔ وہ حسین عورت کا روپ دھار کر مجھے مسحور کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن اس طلسمی حلقے نے اس کا تمام جادو توڑ دیا اور وہ اصلی شکل میں آ گیا۔

یہ کڑا اتار کر پھینک دے۔ اس نے خونخوار آواز میں کہا۔

"کیوں۔ راجہ باسدیو۔" میں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"میں نے تجھے آج تک نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ بس اس بات پر آمادہ کرتا رہا ہوں کہ تو میرا کام کر دے لیکن یہ مقصد نہیں کہ تو نے یہ کڑا پہن کر میری شکتی کو للکارا ہے اگر میں تجھے اپنی شکتی دکھانے پر آ گیا تو پھر پورا استھان تیرے لئے جہنم بن جائے گا۔ مجھے معلوم ہے تیری بہن اور تیرا بھائی تجھے مل سکتے ہیں۔ ان لوگوں کو آزاد زندگی مل گئی۔ پرنت تو سمجھتا ہے کہ وہ پورا جیون اسی جگہ گذاریں گے وہ یہاں سے نکلیں گے اور پھر۔۔۔ اس کے بعد وہ میرے شکنجے میں ہوں گے۔ میں ان کے دماغ پلٹ دوں گا اور انہیں تیرے سامنے لے آؤں گا کیا تو یہ دیکھنا پسند کرے گا کہ تیرا بھائی تیری بہن کو استری کی طرح استعمال کرے وہ بھی تیرے سامنے۔ میں یہ اوشیہ کر دوں گا ورنہ۔۔۔ تو یہ کڑا اتار پھینک۔

"ذلیل کتے۔ تو میرے خاندان کو تباہ کر رہا ہے اور تو کہتا ہے کہ تو نے آج تک مجھے نقصان نہیں پہنچایا۔ میں نے اپنے بہن بھائی کو خدا کے سپرد کر دیا ہے۔ اگر اسے ان کی حفاظت منظور ہوگی تو وہ ان کی حفاظت کرے گا اور مقدر میں جو لکھا ہوتا ہے وہ پورا ہو کر رہتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس کڑے کی موجودگی میں تیری تمام قوتیں بیکار ہو گئی ہیں اس لئے تو اس سے گھبرا رہا ہے۔"

"یہ تیری بھول ہے بالک۔ میری شکتی اتنی کمزور نہیں ہے میں جانتا ہوں ان لوگوں نے تجھے کیا پٹی پڑھائی ہے۔ مگر میرے بغیر تو اس مسجد میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ میں تیرا بندوبست کر دوں گا۔ باسدیو نے کہا اور اچانک کچھ غیر مرئی ہاتھوں نے پیچھے سے مجھے پکڑ لیا۔ میں نے پلٹنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا مجھے سختی سے پکڑ رکھا تھا اور اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ میرا کڑے والا ہاتھ بے بس ہو جائے اور میں کڑا کسی کے جسم سے لگا نہ سکوں۔

میں بخوبی محسوس کر چکا تھا کہ باسدیو عورت کے روپ میں مجھے پکڑنے کے لئے اٹھا تھا تو میرا کڑا ہی اس کے جسم سے لگ گیا تھا اور اسی کڑے کی وجہ سے اس کا جادو ٹوٹ گیا تھا پھر باسدیو کا کڑا اتارنے پر اصرار بھی اسی بات

کی طرف اشارہ کرتا تھا اور اب انھوں نے میرے کرتے والے ہاتھ کو بے بس کر دیا تھا۔

لے جاؤ، اس پاپی کو۔ پاتال میں ڈال دو تاکہ یہ بھوکا پیاسا مر جائے۔ زہریلے ناگ چھوڑ دو اس پر تاکہ یہ میرے غصہ کا مزا بھی چکھ سکے۔ باسدیو نے کہا اور غیر مرئی ہاتھ مجھے کھینچنے لگے میں دوسری بار ان کمروں سے گزرا۔ لیکن اب وہ کھنڈر بنے پڑے تھے ان میں غلاظت کے ڈھیر تھے۔ جن میں کیڑے کلبلا رہے تھے۔

طلسم ٹوٹ چکا تھا اور اب ترسول کنڈ اپنی اصل شکل میں تھا۔ اور اس کی شکل بے حد بھیانک تھی۔ مجھے لیجانے والے غیر مرئی ہاتھ مجھے گھسیٹتے رہے اور پھر وہ نیچے اترنے لگے نیچے اترنے کی رفتار بہت تیز تھی مجھے ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے میں آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں میں جا رہا ہوں اور میرا دماغ چکرانے لگا۔ میرا کلیجہ حلق کی طرف آ رہا تھا۔

نہ جانے میں کب بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو چاروں طرف اندھیرا تھا سخت اندھیرا جس میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا لیکن ۔ پھر اس اندھیرے میں مجھے ننھے ننھے ستارے جگمگاتے نظر آئے۔ چمکدار نقطے حلقے کی شکل میں میرے چاروں طرف موجود تھے۔

یہ کیا ہے ۔ میں کہاں ہوں ۔ میں نے سوچا اور چند لمحات میں مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ میرا ہاتھ بے اختیار دوسرے ہاتھ کی کلائی میں پڑے ہوئے حلقے کو ٹٹولنے لگا اور حلقہ مجھے بخوبی محسوس ہو گیا۔

میں نے سکون کی سانس لی میں کسی قدر محفوظ ہوں۔ شیطان باسدیو نے کہا تھا کہ مجھے پاتال میں پھینک دیا جائے تو کیا یہ تحت الثریٰ ہے کیا در حقیقت میں زمین کی سب سے نچلی تہہ میں ہوں۔ اگر میں یہاں ہوں تو ۔ پھر یہاں سے کیسے نکل سکوں گا۔ ان گہرائیوں سے نکلنا میرے بس کی بات تو نہیں تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے کمزوری کا احساس ہونے لگا میں خود کو تھکا تھکا محسوس کر رہا تھا تاریکی مجھے کھائے جا رہی تھی۔ اور ان ننھے جگمگاتے نقطوں کا اسرار ابھی تک مجھ پر نہیں کھلا تھا۔

وہ کیا ہیں : کبھی کبھی وہ نقطے مجھے ہلتے ہوئے محسوس ہوتے تھے میں نے ایک گہری سانس لی اور اپنے نیچے سخت کھردری اور ٹھنڈی زمین کو محسوس کرنے لگا۔

"کیا یہ کوئی غار ہے" ؟ میں نے خود سے سوال کیا۔ ممکن ہے کوئی اندھیرا کنواں ہو ۔ اور میں اس میں ہوں ۔ اس خیال سے میں نے اوپر دیکھا۔ شاید کنوئیں کا دہانہ نظر آ جاتا لیکن اوپر بھی تاریکی تھی۔ کیا ماجرا ہے۔ میں نے ہاتھوں کا سہارا لیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے اٹھتے ہی ایک دم بہت سی پھنکاریں گونج اٹھیں اور چمکدار نقطے ہلنے لگے۔ وہ بار بار نیچے جھک اور اوپر اٹھ رہے تھے۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اب میں سمجھ گیا کہ وہ نقطے کیسے تھے۔ وہ زہریلے ناگ تھے جو میرے گرد حلقہ بنائے کھڑے تھے۔ باسدیو نے کہا تھا کہ میرے اوپر زہریلے ناگ چھوڑ دیئے جائیں تاکہ میں اس کا غصہ دیکھ سکوں۔

لیکن یہ سانپ میرے اوپر حملے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے وہ مجھے ڈسنے سے معذور تھے۔ اگر معذور نہ ہوتے تو یقیناً اب تک سب میرے جسم سے لپٹے ہوئے ہوتے۔ اس تصور سے مجھے ڈھارس ہوئی اور میرا خوف کسی حد تک کم ہو گیا۔ ناگ پھنکار رہے تھے اور ان کی زہریلی آوازیں میرے رونگٹے کھڑے کر رہی تھیں۔ میں اب باسدیو کا قیدی تھا اب مجھے کیا کرنا چاہئے میں سوچنے لگا، لیکن کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

تاریکی میں میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ یہی کیا کم تھا کہ ان سانپوں نے مجھے ڈسا نہیں تھا۔ میں ان کے درمیان سے گذر کر آگے جانے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔ اور پھر

مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ جگہ جہاں میں موجود ہوں، کتنی بڑی ہے۔ کہاں تک گئی ہے میرا کوئی قدم مجھے کہاں لے جائے گا میں نے ایک بار پھر پہلو بدلا اور سانپ پھر پھنکارنے لگے۔

میں تھک کر لیٹ گیا۔ کسی ایسے آدمی کا تصور کریں۔ یا آپ یہ کیفیت خود پر طاری کریں۔ آپ بھوکے ہوں۔ کسی تاریک غار میں پڑے ہوں۔ اور آپ سے صرف چند قدم کے فاصلے پر زہریلے سانپ گھیرا ڈالے ہوں ان کی آنکھیں تاریکی میں ننھے ننھے نگینوں کی طرح چمک رہی ہوں تو آپ کی ذہنی کیفیت کیا ہو گی۔ میری صحیح کیفیت کا اندازہ آپ اسی صورت میں لگا سکتے ہیں۔

لیکن پے در پے مصیبتوں نے مجھے قوت برداشت دے دی تھی۔ میں ہر ماحول ہر مصیبت میں خود کو ضم کر لینے کا عادی بن گیا تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد ان سانپوں سے میرا خوف زائل ہونے لگا۔ میں نے یقین کر لیا کہ یہ کسی شکل میں مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ لیکن ــــ صرف یہی بات سب کچھ نہیں تھی مجھے ان کے نرغے سے نکلنا بھی تھا یہاں سے نکلنے کا راستہ تلاش کرنا تھا۔

اور میں کر ہمت باندھنے لگا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی نہ جانے ان تاریکیوں میں پڑے مجھے کتنی دیر ہو گئی تھی میں نے وہاں بھی کھانا نہیں کھایا تھا اور اب بے پناہ بھوک بڑھ گئی تھی۔

لیکن درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا۔ میں نے صبر کر لیا میں نے بھلانے کی کوشش کی کہ مجھے بھوک لگ رہی ہے اور پھر ایک بار میں ہمت کر کے اٹھ گیا۔ سانپوں کی پھنکاریں ایک دم تیز ہو گئیں اور وہ غضبناک ہو گئے۔ لیکن میں نے ملتے والا ہاتھ آگے کر دیا اور میری یہ کوشش کارگر رہی۔ میں نے سانپوں میں ابتری دیکھی۔ وہ پیچھے ہٹ رہے تھے۔ میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ لیکن میں خدا کا نام لے کر آگے بڑھتا رہا۔

اب میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو گئی تھیں اور میں اپنے پیروں کے سامنے سے ہٹتے ہوئے سانپوں کو بخوبی دیکھ رہا تھا وہ کیچوؤں کی طرح پھن گرا کر میرے سامنے سے بھاگ رہے تھے۔

میرے پہریداروں کا حلقہ ٹوٹ گیا تھا اور وہ سراسیمہ ہو کر بھاگ رہے تھے۔ میری ہمت کچھ گنا بڑھ گئی اور میں دونوں ہاتھ آگے پھیلائے اندھوں کی طرح بڑھتا رہا۔ میرا یہ خیال غلط ثابت ہو گیا کہ میں کسی کنویں میں ہوں۔ کنویں کی کوئی دیوار تو ہوتی لیکن میرے ہاتھوں کے سامنے خلا تھی اور میں پیروں سے ٹٹولتا ہاتھ آگے کئے بڑھتا رہا

تقریباً دس منٹ تک میں چلتا رہا اور وہ سانپ کافی دور رہ گئے۔ اب میری پشت پر سرسراہٹ بھی نہ تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ہوا کے فرحت بخش جھونکوں کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ لیکن روشنی کہیں نہ تھی۔ ٹھیک گیارہویں منٹ پر میرے ہاتھ کسی چیز سے ٹکرائے اور میں رک کر اسے ٹٹولنے لگا۔ پتھر کی دیوار تھی۔ ابھرے ہوئے ناہموار پتھروں سے میرے ہاتھ ٹکرانے لگے۔ گویا یہ اس غار کا اختتام ہے میں نے سوچا۔

پھر اب کیا کروں۔ ممکن ہے یہاں کوئی راستہ بھی ہو۔ میں نے سوچا اور دیوار کو ٹٹولتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ جہاں تک یہ دیوار جائے گی میں بھی چلتا جاؤں گا خواہ پوری زندگی کیوں نہ چلنا پڑے اور میں چلتا رہا۔ نہ جانے کتنی دیر۔ پھر دیوار میرے ہاتھوں سے نکل گئی۔ آگے پھر خلاء تھا میں رک گیا۔ نہ جانے یہ کیسا خلاء تھا میں نے پیر آگے بڑھا کر جگہ ٹٹولی۔ زمین موجود تھی۔ پھر میں نے خلاء ٹٹولی اور چند قدم آگے بڑھا کر اس جگہ پہنچ گیا۔ میں خلاء میں مڑ گیا اور بہت جلد میرے ہاتھ کسی چیز سے ٹکرائے۔ وہ چیز پتھر نہیں تھی۔ پھر کیا تھا ـ! اور بہت جلد ہی میں نے محسوس کیا کہ وہ کوئی دروازہ تھا۔ لکڑی کا دروازہ ــــ!

میرا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ نہ جانے یہ دروازہ کہاں کا

ہے۔ ممکن ہے یہاں سے باہر نکلنے کا راستہ ہو۔ میں نے دروازے
کو پوری قوت سے دوسری طرف دھکیلا اور کافی تیز چرچراہٹ
کے ساتھ سالخوردہ دروازہ کھل گیا اور دوسری طرف روشنی
دیکھ کر میری آنکھیں خوشی سے جگمگا اٹھیں۔ یہ روشنی ایک فانوس
کی تھی جو چھت میں لٹک رہا تھا۔

اندر داخل ہو کر میں نے چاروں طرف دیکھا، اور ایک
طرف دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس بڑے
غار کے ایک حصے میں ایک بت ایستادہ تھا۔ ایک قد آدم
بت، جو کسی پتھر سے تراشا گیا تھا، فانوس کی روشنی میں مجھے اس
بت کے خدوخال نظر آ رہے تھے۔ وہ مندرانہ لباس میں تھی۔
پجاریوں کا سا لباس۔ رقص کا پوز، لیکن اس کی شکل

میں اس کی شکل دیکھ کر سناٹے میں رہ گیا میرا دل در سے
تڑپنے لگا۔ یہ تو وہی شکل تھی جو میں نے اپنے ہاتھوں کے آئینے
میں دیکھی تھی۔ وہی حسین شکل جسے میں نے مکڑیوں کے جالے
میں محو خواب دیکھا تھا۔

"یا خدا۔ کیا یہ بھی باسدیو کی کوئی چال ہے۔ کوئی نئی
چال۔ ورنہ پھر یہ مجسمہ کیسا ۔۔۔؟ یہ یہاں کیوں ہے؟ کیسے آگیا
میں سوچتا رہا اور میرے قدم خود بخود اس مجسمے کی طرف اٹھ گئے
اس کا انداز رقص کا تھا لیکن چہرے پر بے چارگی اور لاچاری تھی
ایسا لگتا تھا جیسے وہ رقص مجبوری ہو۔ میں بے خود ہو کر اس کی
آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ مجھے کوئی خبر نہ رہی کہ میں کہاں ہوں،
کیا کر رہا ہوں۔ بس میں اسے دیکھ رہا تھا۔ دیکھتا رہا۔ اور
وقت گزرتا رہا۔! ایک بار پھر میرا ذہن تاریکیوں میں گم ہو گیا۔

نہ جانے کب ہوش آیا۔ میرا اندازہ تھا کہ کافی وقت گزر
چکا ہے۔ میں اس مجسمے کے قدموں میں پڑا تھا اور اب میرے جسم
میں ہلنے کی بھی سکت بھی نہیں تھی بھوک سے ہاتھ پاؤں ڈھیلے
ہو چکے تھے۔ دفعتاً میں نے قریب ہی گوشت کی بو محسوس کی۔
بھنے ہوئے گوشت کی بو۔ اور میری بھوک طوفانی انداز میں جاگ
اٹھی میں نے گردن گھما کر دیکھا ۔۔۔ مجھ سے تھوڑے فاصلے پر بھنا
ہوا گوشت رکھا تھا۔ گرم گرم گوشت۔ اس کے نزدیک ایک صراحی
اور گلاس بھی موجود تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں گوشت پر ٹوٹ پڑوں
اور پوری پلیٹ صاف کر جاؤں لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ میں باسدیو
کا قیدی ہوں اور یہ مراعات باسدیو کے علاوہ کسی کی نہیں ہو سکتیں
میں باسدیو کا کوئی احسان نہیں قبول کرنا چاہتا تھا۔ خواہ بھوک
سے میری جان ہی کیوں نہ نکل جائے۔

لیکن اس وقت میرے کانوں میں ایک مترنم سرگوشی گونجی

"باسدیو ہندو ہے اس کے مذہب میں گوشت حرام
ہے۔ اس نے یہ گوشت تمہیں فراہم کیا، اسے کھالو۔

میں چونک کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ یہ کس کی آواز تھی
کیسی آواز تھی۔ کس قدر نغمگی تھی آواز میں۔ کیسی حسین آواز تھی
تب میں نے مجسمے کی طرف دیکھا۔ اور حیرت سے اچھل پڑا۔ پہلے میں
نے جب اسے دیکھا تھا تو اس کے چہرے پر سوگواری تھی بیچارگی
تھی لیکن اس وقت یہ مجسمہ مسکرا رہا تھا، ایک انوکھے انداز میں۔
کیسی مسکراہٹ تھی یہ مسکراہٹ سکون بن کر میری روح میں
اتر گئی اور میں نے ان الفاظ پر غور کیا جو سرگوشی میں ابھرے تھے
میں سوچنے لگا۔ بیشک باسدیو ہندو ہے۔ اگر وہ
مجھے کھانے کے لئے کچھ دیتا تو وہ کوئی اور چیز ہوتی ۔۔۔ پھر یہ
میری غیبی امداد ہے۔ میں نے دل ہی دل میں خدا سے مدد مانگی
میں نے کہا، پروردگار، اگر یہ بھی اسی ناپاک شیطان کی سازش
ہے تو اس گوشت کو متعفن کر دے۔ اسے کریہہ بنا دے،
اس میں کیڑے ڈال دے تاکہ میں اس سے گھن کھانے لگوں
میں بھوک سے جان دینا پسند کرتا ہوں لیکن اس کے اشاروں
پر چلنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اور اگر یہ تیرا عطیہ ہے تو اسے یونہی
رہنے دے۔

نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ میری دعا قبول ہو جائے گی
میں اسے دیکھتا رہا اور گوشت سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھتی

رہی۔ میں اس کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے اسے کھانے سے پہلے بسم اللہ
کہا اور پھر گوشت کھانے لگا۔ میں اسے قدرت کا عطیہ سمجھ کر
کھا رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں، میں شکم سیر ہو گیا۔ میری قوتیں واپس
آگئیں اور میرے دل میں ایک نیا عزم پیدا ہو گیا۔ مجھے یقین ہو
گیا کہ میں نے جو کچھ کھایا ہے وہ نجس نہیں تھا۔ بہرحال اس نئی
قوت کے حصول کے بعد مجھے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھنا تھا۔
اب اگر دو تین دن تک کچھ کھانے کو نہیں ملتا تو مجھے فکر نہیں
تھی۔ کم از کم اس وقت تو میں یہاں سے نکلنے کی جدوجہد کر
سکتا تھا اور میں اس کے لئے تیار ہو گیا۔ میں نے اس پورے
غار کا چکر لگایا۔ لیکن مجھے کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔ میں نے تمام
دیواروں کو ٹھونک بجا کر دیکھا۔ لیکن کوئی صورت نہیں تھی کئی
گھنٹے تک میں کوشش کرتا رہا اور ایک بار پھر میں اس روشن
کمرے سے تاریکی میں نکل آیا۔

ممکن ہے یہاں سے باہر جانے کا راستہ کہیں اور ہو، اور
میں راستہ تلاش کرتا رہا۔ لیکن نہ جانے کتنے گھنٹے کے بعد بھی
میں ناکام رہا۔ ایک بار پھر ناکامیوں نے مجھے گھیر لیا۔ میں سوچنے
لگا۔ شاید میری زندگی کی شام اسی غار میں ہو جائے اور اس تصور
کے ساتھ ہی میرے دل میں ہوک سی اٹھی۔ مجھے وہ حسین شکل یاد
آگئی جو مکڑی کے جالے میں موجود تھی۔

کاش میں اسے زندہ دیکھ سکتا۔ کاش میں اس کی مدد کر
سکتا، میرا دل اس قدر بے چین ہوا کہ میں اس مجسمے کو دیکھنے کے لئے
واپس پلٹ آیا۔ اسے دیکھ کر میرے دل کو سکون ملتا تھا۔ غار میں
راستہ تلاش کرتے ہوئے میں نے اس کمرے کا راستہ ذہن میں رکھا تھا
لیکن واپسی میں، میں اس راستے کو تلاش نہ کر سکا۔ مجھے انتہائی
کوشش کے بعد بھی وہ دروازہ نہ ملا جس کے دوسری طرف کمرہ
تھا اور جس کمرے میں وہ حسین بت موجود تھا اور اس نئی افتاد
پر میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

کاش میں وہاں سے باہر نہ آتا۔ آہ۔ اب میں اسے
کہاں تلاش کروں۔ اور زندگی میں پہلی بار میں اپنی بے بسی پر
پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ میری ہچکیاں بلند ہو گئیں اور کافی دیر تک
میں روتا رہا۔ ایک بار پھر میں روشنی سے محروم ہو گیا تھا۔ میں تھک
گیا تھا۔ جسم میں اینٹھن سی ہو رہی تھی۔ میں وہیں زمین پر لیٹ
گیا اور نیند نے کچھ دیر کے لئے تفکرات سے بے نیاز کر دیا۔

میں سوتا رہا۔۔۔ اور پھر نہ جانے کیوں میری آنکھ کھل گئی
تاریکی اور گہری ہو گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اس تاریکی میں چند
روز اور گزارنے پڑے تو میں بینائی کھو بیٹھوں گا! لیکن ۔۔۔
اچانک مجھے کچھ روشنی محسوس ہوئی۔ ایک روشنی کی کرن دور سے
نظر آ رہی تھی۔ میں اچھل پڑا۔ اور دوسرے لمحے میں اٹھ کر بیٹھ گیا

پھر میں نے قدموں کی چاپ سنی اور روشنی تیز ہوتی گئی۔ اب
مجھے ایک عظیم الشان غار کی دیواریں نظر آ رہی تھیں ۔۔۔ اور پھر
میں نے ایک پیکر نور دیکھا۔ ایک روشن ہیولا ۔۔۔ جو مجھ سے تقریباً
سو گز کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ بلاشبہ وہ انسانی پیکر تھا۔ لیکن اس
کے خدوخال نہ تھے۔ البتہ روشنی کا لباس پہنے ہوئے کوئی نسوانی
جسم تھا۔ پھر اس جسم نے ہاتھ بلند کیا اور مجھے اس طرح اشارہ
کرنے لگا، جیسے اپنے ساتھ آنے کے لئے کہہ رہا ہو۔

میں بے اختیار چل پڑا اور روشن سایہ مجھ سے اتنا ہی
فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے چل پڑا۔ میں اس کی روشنی میں زمین
دیکھ سکتا تھا۔ پتھر دیکھ سکتا تھا جن سے مجھے ٹھوکر لگ سکتی
تھی اور میں بے تکان اس کے پیچھے جا رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم
تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ بس میں چل رہا تھا، اور ہم اس
طویل سرنگ میں چلتے رہے۔ چلتے رہے یہاں تک کہ میری
ٹانگیں شل ہو گئیں۔

اور پھر اچانک مجھے تیز روشنی نظر آئی۔ یہ روشنی ایک
دوسری شکل میں تھی۔ اس تیز روشنی سے میری آنکھیں چکاچوند ہو
گئیں۔ ایک لمحے کے لئے میں نے آنکھیں بند کیں اور پھر دوبارہ
کھولیں تو وہ روشن ہیولا غائب تھا۔ البتہ روشنی کا دائرہ بدستور

موجود تھا اور اس سے تیز روشنی چھن رہی تھی۔

میں نے اپنے پیچھے اس روشن میوسے کو تلاش کیا۔ لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ تب میں اس روشن دائرے کی طرف بڑھ گیا اب مجھے تازہ ہوا کے جھونکے محسوس ہو رہے تھے اور بہت جلد ہی سمجھ میں آ گیا کہ وہ روشن دائرہ دراصل غار کا دھانہ ہے یہ اندازہ لگا کر کہ میں اس غار سے باہر نکل سکتا ہوں میں سب کچھ بھول گیا اور دیوانہ وار اس دھانے کی طرف لپکا ـــــ اور نہ جانے کتنے دن کے بعد میں نے سورج کی روشنی دیکھی۔

میں دھانے سے باہر نکل آیا، باہر چمکدار دھوپ پھیلی ہوئی تھی میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ دھوپ مجھے بے حد خوشگوار لگ رہی تھی میں دھانے سے نکل کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور دھوپ سینکتا رہا۔ پھر میں وہاں سے آگے بڑھا اور اس بڑی چٹان کے پیچھے سے دوسری طرف آ گیا جس نے اس غار کے دھانے کو پوشیدہ کیا ہوا تھا۔ دوسری طرف دیکھ کر میں خوش ہو گیا۔ ایک چٹیل میدان کے دوسرے سرے پر مجھے جھونپڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ یقیناً کوئی بستی تھی پھر میں نے دائیں بائیں نگاہ دوڑائی اور حیران رہ گیا ـ!

یہ تو کوئی جزیرہ تھا۔ چاروں طرف سمندر پھیلا ہوا تھا۔ جزیرہ زیادہ بڑا نہ تھا۔ پھر وہ طویل سرنگ کہاں سے آئی تھی جس میں سے گزر کر میں یہاں آیا تھا۔ کافی دیر تک غور کرتا رہا اور پھر ہنس پڑا۔ میرا یہ غور و خوض حماقت نہیں تو اور کیا تھا میں طلسماتی چکر میں پھنسا ہوا تھا ایسی شکل میں جو کچھ بھی نہ ہوتا کم تھا۔ پھر حیرانی کیسی۔

ایک اونچے پتھر پر چڑھ کر میں بستی کی طرف دیکھنے لگا۔ میں اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ یہ کونسا علاقہ ہے اور یہاں سے میرا مطلب ہے اس جزیرے سے باہر نکلنے کے کیا امکانات ہو سکتے ہیں

میں نے چند بچوں کو دیکھا جو گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے گلی ڈنڈا! میرے ذہن نے سوچا، یہ کھیل تو میرے وطن میں کھیلا جاتا ہے ممکن ہے اس علاقے کے لوگ بھی اس کھیل سے واقف ہوں۔ نہ جانے وہ اس کھیل کو کیا کہتے ہوں۔ لیکن یہ بچے بھی میرے وطن کے سے تھے۔ چند نے قمیص اور پاجامے پہنے ہوئے تھے۔ چند جانگیوں میں تھے۔

یہ جو کوئی بھی ہیں۔ ہمارے وطن کے طرز رہائش سے بہت مطابقت رکھتے ہیں۔ بہر حال ان کے پاس چلنا چاہئے۔ ممکن ہے یہ یہاں سے نکلنے میں کوئی مدد کر سکیں۔ میں بھی ان کی طرف چل پڑا اور چٹیل میدان عبور کر کے جھونپڑیوں کے نزدیک پہنچ گیا۔ میرے جسم پر چندر راجکماروں کا لباس تھا۔ یہ وہی لباس تھا جو ترسول کنڈ میں مجھے ملا تھا۔ بچوں کے لئے یہ لباس شاید عجیب تھا اس لئے وہ اپنا کھیل بھول کر مجھے دیکھنے لگے۔

بالآخر میں بچوں کے نزدیک پہنچ گیا۔ ان کا رنگ اور قد و خال دیکھ کر میں پھر الجھن میں پڑ گیا۔ یہ قد و خال بھی میرے ملک کے باشندوں کے سے تھے۔ میں نے ایک بچے کو جو ان سب سے بڑا تھا۔ اشارہ کیا اور بچہ میرے قریب پہنچ گیا۔

کیا تم میری زبان سمجھ سکتے ہو بیٹے؟ اور بچہ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگا۔ شاید وہ میرے الفاظ نہیں سمجھ سکا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے" میں نے دوسرا سوال کیا۔ اس خیال سے کہ ممکن ہے کہ بچے کی سمجھ میں میری بات نہ آئی ہو۔

"عبدالرشید" بچے نے جواب دیا اور میں مسرت سے اچھل پڑا۔ یقیناً یہ میرا وطن تھا۔ میرے لئے طویل مسافت ختم ہو گئی تھی اور میں نے اپنے ہی وطن میں تھا۔ میرے دل میں کیسے کیسے وسوسے تھے۔ نہ جانے مجھے اپنے وطن تک کے سفر میں کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ لیکن یہ تمام مرحلہ کتنی آسانی سے طے ہو گیا کیسے ہو گیا تھا۔ اس بارے میں مجھے سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ میں جن طلسمات میں پھنسا ہوا تھا ان کو سامنے رکھتے ہوئے اب دنیا کی کوئی بات میرے لئے عجیب نہ رہی تھی۔"

"تمہارے باپ کا نام کیا ہے"؟
"عبدالغفور"
"خوب، تمہارا باپ کیا کرتا ہے۔"
"مچھلیاں پکڑتا ہے" بچے نے جواب دیا۔ اوہ تو یہ مچھیروں کی بستی ہے۔ میں نے اس خیال کی تصدیق کرنے کے لئے دوسرے بچے سے پوچھا
"تمہارا باپ بھی مچھلیاں پکڑتا ہے بیٹے"
"ہاں"
"تمہارے اس جزیرے کا نام کیا ہے" میں نے پوچھا
"ناگرہ" بچے نے جواب دیا اور میں نے ذہن پر زور دیا یہ نام میں نے اپنے وطن میں سنا تھا۔ مگر یہ جزیرہ کہاں تھا ناگرہ، ناگرہ۔ مجھے یاد نہ آسکا تو میں نے بچے سے ایک اور سوال کیا۔
"تمہارے ابا مچھلیاں بیچنے کہاں جاتے ہیں بیٹے"
"رانی پور" بچے نے جواب دیا۔
"اوہ، رانی پور ــــــ" میں خوشی سے اچھل پڑا۔ مجھے یاد آگیا ناگرہ کہاں ہے۔ ایک مرتبہ یہ جزیرہ طوفان میں پھنس گیا تھا اور یہاں بڑی ہلاکت ہوئی تھی۔ اس لئے میں نے اس کا ذکر اخبارات میں پڑھا تھا۔ مجھے علم تھا کہ یہ کہاں ہے اور پھر ظاہر ہے یہ مچھیرے مچھلیاں بیچنے رانی پور جاتے تھے اس کا مطلب تھا کہ رانی پور زیادہ دور نہیں تھا
ابھی میں بچوں کے قریب کھڑا ان سے بات چیت ہی کر رہا تھا کہ ایک نوجوان عورت جھونپڑیوں کے درمیان سے نکل آئی اور مجھے حیرت سے دیکھنے لگی۔ وہ ایک خوبصورت مچھیرن تھی۔ پھر وہ چند قدم آگے بڑھ کر میرے پاس آگئی
"کون ہو تم" اس نے کہا
"ایک مصیبت زدہ انسان ہوں، کیا آپ میری مدد کریں گی" میں نے پوچھا

"یہاں کیسے آگئے" عورت نے دوسرا سوال کر دیا۔ اور میں ایک لمحے کے لئے چکرا گیا۔ اس کے اس سوال کا کیا جواب دوں۔ ظاہر ہے میرا صحیح جواب اس کی سمجھ میں نہیں آسکے گا اور نہ جانے وہ میرے بارے میں کیا سوچے۔ اس لئے اس وقت جھوٹ کا سہارا ہی مناسب معلوم ہوا۔
"بس بوٹنگ کرتا ہوا ادھر آگیا تھا۔ میری کشتی الٹ گئی، ادھر آنکلا ــــــ"
"کشتی الٹ گئی تھی۔" وہ حیرت سے بولی
"ہاں۔"
"کب الٹی تھی"
"ابھی تھوڑی دیر پہلے اس ساحل پر" میں نے یونہی ایک طرف اشارہ کر دیا۔"
"خشکی میں الٹی تھی!" وہ بولی اور ہنس پڑی

"تمہارے کپڑے تو خشک ہیں۔" وہ شرارت سے بولی اور میں بوکھلا کر اپنے کپڑوں کو دیکھنے لگا۔ جلد بازی میں جھوٹ بھی ایسا بولا تھا جو چل نہ سکے۔ چنانچہ میں کھسیانے انداز میں ہنس پڑا۔"
"خیر۔ مجھے کیا۔ آؤ چاچا کے پاس چلو۔ وہی تمہاری مدد کرے گا۔ اس نے کہا اور میں اس بات کو غنیمت جان کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ عورت کافی خوبصورت تھی اگر تعلیم یافتہ اور اچھے طبقے کی ہوتی تو بے مثال تھی۔ بہرحال میں اس کے ساتھ ایک جھونپڑے کے سامنے پہنچ گیا۔ جھونپڑے کے سامنے ایک چھپر پڑا ہوا تھا جس کے نیچے ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی اور ایک قوی ہیکل مچھیرا چارپائی پر دراز حقہ گڑگڑا رہا تھا
مجھے دیکھ کر اس نے حقے کی نے منہ سے نکالی
"یہ کوئی مصیبت زدہ ہے چاچا بچوں سے باتیں کر رہا تھا"
"آؤ بیٹھو ــــــ" بوڑھے لیکن تنومند مچھیرے نے مجھے

چارپائی پر جگہ دیتے ہوئے کہا۔ اور میں شکریہ ادا کرکے بیٹھ گیا
"کہاں سے آئے ہو۔"
"میں ۔۔ رانی پور سے آیا ہوں" میں نے دوسرا جھوٹ
بولا اور عورت بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے گھورنے لگی
"ادھر کیسے آنکلے" یہ تو مچھیروں کی بستی ہے
"وہ ۔ چاچا۔ بس دوستوں نے مذاق کیا ہے۔ بڑے ذلیل
ہیں میرے دوست۔ مجھے کشتی سے لے کر یہاں آئے اور پھر ساحل
پر اتار کر بولے کہ میں یہاں کی سیر کردں وہ ابھی واپس آرہے ہیں
اور پھر وہ مجھے یہاں چھوڑ کر بھاگ گئے میں نے کہا اور عورت
کی نظروں سے نظریں چرالیں ـــــ وہ زیر لب مسکرا رہی تھی
ہندو دھرم سے تعلق رکھتے ہو" بوڑھے نے پوچھا
"نہیں جی یہ مسلمان ہوں خدا کے فضل وکرم سے" ایس
نے جلدی سے کہا اور بوڑھا چونک کر مجھے دیکھنے لگا عورت
کی آنکھوں میں حیرانی نظر آئی پھر بوڑھے نے تعجب خیز لہجہ میں پوچھا
"لیکن تمہارا لباس تو ہندوؤں جیسا ہے"
یہ بھی انہیں کمبخت دوستوں کی شرارت ہے۔ ان میں
میرا ایک دوست ہندو بھی تھا اس نے زبردستی اپنا لباس
مجھے پہنا دیا۔ ویسے میں مسلمان ہوں، میں نے بوڑھے کو کلمہ پڑھ کر
سنایا تو اسے فوراً یقین آگیا
عجیب دوست تھے تمہارے، کہیں انہوں نے تمہارے
ساتھ دشمنی تو نہیں کی۔!
نہیں صرف شرارت کی ہے میں واپس جا کر انہیں مزہ
چکھادوں گا۔ میں نے کہا اور بوڑھا ہنسنے لگا: پھر بولا
"چائے پیو گے"
چائے ۔ میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بوڑھے
نے عورت سے کہا "شریفہ چائے بنا دو" اور عورت موٹی
موٹی آنکھوں سے مجھے گھورتی ہوئی اندر جھونپڑی میں چلی گئی

تھوڑی دیر کے بعد اس نے میلے کچیلے پیالوں میں چائے لا کر ہم
دونوں کو دیدی اور میں چائے پینے لگا
"اب تم کیا چاہتے ہو بیٹے" بوڑھے نے پوچھا
مجھے رانی پور تک پہنچوا دیں چاچا۔ بڑا شکر گذار ہوں گا
آج یہیں رہو بیٹے، شبیر مچھلیاں لے کر رانی پور گیا ہوا
ہے ہم لوگ رات کو مچھلیاں پکڑتے ہیں اور صبح انہیں شہر میں بیچنے
چلے جاتے ہیں کل جب شبیر مچھلیاں لے کر جائے گا تو تم اس کے
ساتھ چلے جانا۔ بوڑھے نے کہا اور میں مجبور ہو گیا میں ان لوگوں کو
اور کسی طرح مجبور بھی تو نہیں کرسکتا تھا۔ بہرحال بوڑھے کے ساتھ
بیٹھا رہا۔ کچھ اور لوگ بھی اگر بوڑھے کے پاس بیٹھ گئے اور
بوڑھا ہنس ہنس کر انہیں میرے بارے میں بتانے لگا سیدھے
سادھے لوگ تھے وہ میرے فرضی دوستوں کی شرارت پر ہنسنے
لگے اور میں بور بیٹھا رہا۔ عورت کبھی کبھی اگر مجھے دیکھ لیتی۔ وہ
بہت شریر معلوم ہوتی تھی۔ لیکن صرف شریر۔ میں نے ـــ
اس کی آنکھوں میں بے حیائی نہیں دیکھی ـــ وقت گزرتا
رہا اور پھر شام ہو گئی ـــ سورج چھپنے سے پہلے بوڑھے کا بیٹا
اور شریفہ کا شوہر آگیا۔ لمبا، تڑنگا، تیز اور چالاک آدمی معلوم
ہوتا تھا اس نے گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا نہ جانے کیوں
میں نے اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار محسوس کئے
بہرحال وہ اندر چلا گیا ـــ اور کافی دیر تک باہر نہ نکلا،
میں اس بوڑھے سے بات چیت کرتا رہا
رات کو میں نے بوڑھے اور اس کے بیٹے کے ساتھ کھانا
کھایا ـــ ساگ اور مکئی کی روٹی کتنی لذیز معلوم ہوئی اسکے بارے
میں میں بیان نہیں کرسکتا۔ یہاں کے ایک ایک ذرے سے
اپنائیت ٹپک رہی تھی۔ رات کو بوڑھے نے میرے سونے
کے لئے اپنے قریب ہی چارپائی بچھائی تھی اور میں اسکے نزدیک
میلے کچیلے بستر پر لیٹ گیا شریفہ اور بوڑھے کا لڑکا اندر جھونپڑی

چالباز مہارانی کی فتنہ انگیزیاں

گوندنی ایک چمارن جو مہارانی بن گئی اور پھر اُس نے اپنی ذہانت اور چالبازی سے راجوں مہاراجوں کو ٹھکانے لگا دیا۔

مہارانی ایک خوبصورت مگر عیّار عورت جس نے سابق مہاراجوں کے محل میں ہلچل پیدا کر دی۔ وہ لوگوں کو دیوانہ بنا دینے کی صلاحیّت رکھتی تھی۔

نوجوانوں کی دُشمن مہارانی کا نام ہر زبان پر تھا۔ راج محل میں ہر شخص صرف ایک بات جانتا تھا۔

مہارانی — مہارانی — مہارانی ——؟

آخر یہ مہارانی کون تھی ——؟

وہ ایک چمارن سے مہارانی کیسے بن بیٹھی

چالباز مہارانی کی فتنہ انگیزیاں جاننے کے لئے پڑھئے

عمران ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ مہارانی۔ اب کتابی شکل میں۔ آپ کے شہر کے ہر بک سٹال پر دستیاب ہے۔

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، ۳۷ اردو بازار کراچی

میں تھے۔ بہت عرصہ کے بعد آرام دہ چارپائی ملی تھی۔ مجھے بہت جلد نیند آگئی۔ ـــــ اس وقت رات کا نہ جانے کیا بجا ہوگا کہ میری آنکھ کھل گئی۔

میں نے بوڑھے کی آواز سنی۔ کیا ہے شبیر۔ کیا بات ہے

اندر تو آؤ چاچا۔ کچھ بات کرنی ہے :۔ نوجوان نے کہا اور بوڑھا حیرت سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ پھر دونوں اندر جھونپڑی میں چلے گئے اور نہ جانے کیوں مجھے کچھ کریدسی ہوگئی میں دبے پاؤں اٹھا اور ایک حصہ میں پہنچ گیا جہاں سے میں اندر کی گفتگو سن سکوں۔ اندر لالٹین روشن تھی اور بوڑھا اور اس کا بیٹا اور بہو ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے

" یہ کیا ہے ـــــ ! کیا دکھا رہا ہے مجھے :۔ بوڑھے نے کہا

آہستہ بولو چاچا ـــــ غور سے دیکھو ـــــ یہ تصویر ہے ایسی تصویریں دیواروں پر لگی ہوئی تھیں رمضانی اکھاڑ لایا تھا کسی دیوار سے ۔ یہ تصویر ایک خونی کی ہے جو جیل سے نکل بھاگا تھا۔ اور اس کی گرفتاری پر دہ ہزار روپے انعام ہیں ۔ غور سے دیکھو چاچا ہمارا مقدر کھلنے والا ہے ۔ یہ وہی ہے جو باہر سو رہا ہے ۔

کیا ـــــ ! بوڑھا اچھل پڑا

ہاں چاچا یہ وہی خونی ہے ۔ یقین کرو ۔ جب میں اس سے ہاتھ ملا رہا تھا تو میں نے اس کی شکل دیکھی تھی اس وقت مجھے یاد نہ آرہا تھا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے ۔ پھر میں دماغ لڑاتا رہا مجھے یاد آگیا کہ میں نے اس کی تصویر کہاں دیکھی تھی ۔ یہ پرچہ میں نے ایسے ہی صندوق میں چھپا لیا تھا جس وقت ، رمضانی نے مجھے بتایا تھا میں نے اسی وقت خدا سے دعا مانگی تھی اگر یہ خونی مجھے مل گیا تو مزے آجائیں گے مجھے نہیں معلوم تھا چاچا کہ میری یہ دعا ایسے پوری ہو جائے گی

" مگر وہ تو ہمارا مہمان ہے " بوڑھے نے الجھے ہوئے انداز میں کہا

" پر وہ خونی ہے چاچا ۔ اگر پولیس کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ہم نے اسے اپنے ہاں پناہ دی ہے تو وہ ہمیں سالوں گھسیٹے گی اس کا پولیس کے حوالے کر دینا ہی اچھا ہے "

" ہاں یہ تو ہے ۔ مگر بیٹا وہ خونی ہے ۔ اس کے لباس میں کوئی چھرا وغیرہ نہ ہو

" اسے فکر مت کرو چاچا ۔ تمہارا بشیر کمزور نہیں ہے دیکھ لوں گا سالے کو "

" مگر تو اسے پکڑے گا کیسے "

" بس سوتے میں ، میں اور تم مل کر ہاتھ پاؤں باندھ لیں گے اور صبح کو دونوں مل کر اسے رانی پور لے چلیں گے "

جیسے تیری مرضی ۔ پر شکل سے سیدھا نظر آئے ہے بیٹے ۔ نہ جانے کیوں مجھے دکھ ہو رہا ہے " ، بوڑھے نے کہا

" تم تو بہت ہی نرم دل چاچا ، کیوں شریفہ ، پانچ ہزار مل جائیں گے تو مزے نہیں آجائیں گے ، اس نے اپنی بیوی سے پوچھا لیکن بیوی نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا مجھے معلوم نہ تھا کہ میرے ملک کی حکومت نے میرے لئے انعام مقرر کیا ہے ۔ یہ معصوم لوگ دولت حاصل کرنے کے چکر میں تھے مجھے ان پر غصہ نہیں آرہا تھا ۔ لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اب میں کیا کروں ـــــ یہاں بھی میرے لئے مصیبت پیدا ہوگئی ہے ۔ میں کیسے رانی پور جاؤں ۔ میں خاموشی سے جھونپڑی کے پاس سے پلٹ کر پلنگ پر آگیا ۔ دل سخت پریشان تھا ،

تو یہ ہیکل بوڑھا اور اس کا بیٹا بہت تندرست تھے وہ دونوں مل کر با آسانی مجھے قابو میں کر سکتے تھے ۔ چنانچہ ان کے آنے سے قبل ہی کچھ سوچ لینا چاہیئے ۔

لیکن اگر میں نے فرار ہونے کی کوشش کی تو وہ شور مچا دیں گے اور اس جزیرے سے نکل بھاگنا آسان نہیں ہے اس سے قبل کہ میں کوئی فیصلہ کر سکتا وہ دونوں باہر نکل آئے اور میں

خاموش پڑا رہا۔ شبیر نے قریب آکر مجھے غور سے دیکھا، بوڑھا کچھ فاصلے سے ہی کھڑا تھا میں نے ان کی آن میں ایک فیصلہ کیا اور پلنگ سے اٹھ کر بیٹھ گیا وہ دونوں اچھل کر پیچھے ہٹ گئے تھے۔

میں چارپائی سے کھڑا ہو گیا اور پھر میں نے دکھ بھرے لہجہ میں کہا۔ "محترم بزرگ" میں آپ دونوں کی گفتگو سن چکا ہوں۔ کاش میں آپ کے کام آسکتا۔ بیشک میں نے خون کیا ہے لیکن مجبوری کی حالت میں۔ میں جیل سے بھاگا ہوا قیدی بھی ہوں اگر مجھے ایک اہم کام نہ ہوتا تو بخدا میں اپنے آپ کو آپ کے حوالے کر دیتا تاکہ آپ کو دس ہزار روپے حاصل کرکے خوشی مل سکتی۔ لیکن محترم بزرگ اور میرے دوست۔ میں مجبور ہوں۔ میں ابھی گرفتار ہونا نہیں چاہتا ۔۔۔ البتہ تم سے ایک وعدہ کر سکتا ہوں۔ میں نے دونوں کی شکل دیکھی۔ وہ سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ بالکل مجرموں کی طرح ۔۔۔

"میں وعدہ کرتا ہوں بزرگ کہ اگر میں اس قابل ہو گیا کہ آپ کو یہ رقم مہیا کر سکوں تو خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ آپ کو یہ رقم پہنچا دوں گا

"مگر تم خونی بھی ہو! اگر ہم نے تمہیں نکال دیا تو ہم بھی پھنس جائیں گے۔"

"آپ کسی سے کیوں کہتے ہیں کہ میں یہاں آیا تھا۔"

"صبح لوگوں کو معلوم ہو جائے گا جب میں تمہیں چھوڑنے جاؤں گا۔"

"تم مجھے رات کے اندھیرے میں لے چلو، آج مچھلیاں مت پکڑو۔ یہ نیک کام کرو میرے دوست، ممکن ہے تمہیں اس کا بہت بڑا صلہ مل سکے۔"

"میں تمہیں ضرور گرفتار کروں گا، دیکھوں گا تم میرا کیا بگاڑ لیتے ہو۔"

" بشیر۔۔: جھونپڑے کے دروازے سے عورت کی آواز سنائی دی۔ تو ایسا پتھر دل کب سے ہو گیا ہے بشیر، قدرت نے ہمیں سب کچھ دیدیا ہے۔ ہمیں نہیں چاہیئے پانچ ہزار دس ہزار اسے چھوڑ آ جا ابھی چھوڑ آ۔"

"تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے شریفہ۔" لڑکے نے کہنا چاہا

'دماغ تیرا خراب ہو گیا ہے جو گھر آئے مہمان کو پولیس کے حوالے کر رہا ہے دولت تو آنی جانی چیز ہے اس کی زندگی بچ جائے تو ہمیں سب کچھ مل جائے گا۔ جا بشیر اسے چھوڑ آ ورنہ میں زندگی بھر بات نہیں کروں گی تجھ سے یہ عورت کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔ بشیر اس کی شکل دیکھنے لگا پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے تم سب کی یہی مرضی تو یہی سہی۔۔ کیوں چاچا؟"

" ہاں بیٹا۔۔ چھوڑ آ بے چارے کو۔ خدا سب سے خود ہی نپٹ لیتا ہے اگر اس نے کسی بے گناہ کا ناحق خون کیا ہے تو خدا اسے نہیں چھوڑے گا اور اگر یہ سچا ہے تو اس کی جان بچ جائے گی ۔۔۔ جا چھوڑ آ۔ اللہ ہمیں کہیں اور سے دیگا۔"

اچھا چاچا ۔۔۔۔ آؤ دوست۔ صبح ہونے سے پہلے تمہیں چھوڑ آؤں۔ ورنہ دوسرے لوگ دیکھ لیں گے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور بشیر کے ساتھ ساحل کی طرف چل پڑا۔ ایک چھوٹی سی کشتی میں ہم دونوں بیٹھ گئے اور بشیر نے اپنے ہاتھوں میں پتوار سنبھال لئے اور پھر کشتی لہروں پر ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھنے لگی چاند نکلا ہوا تھا، سمندر جوان تھا ہم آگے بڑھتے رہے رانی پور میرے اندازے سے کہیں قریب تھا۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہی رانی پور کی روشنیاں نظر آنے لگیں میں نے کشتی کھینے میں بشیر کی مدد کرنا چاہی اس نے نرم لہجے میں کہا

" رہنے دو بابو۔ ہم تو عادی ہیں۔ تمہارے ہاتھ تھک جائیں گے۔ مگر تم نے خون کیوں کیا تھا اور پھر جیل سے کیسے بھاگے؟"

سچ پوچھو بشیر۔ تو میں نے کوئی خون نہیں کیا اور اگر
غور کیا جائے تو میں نے کئی خون کئے ہیں۔ جیل سے نکل بھاگنے
میں بھی میرا کوئی دخل نہیں رہا ہے۔ بس حالات میرے لئے
راستہ بناتے رہے ہیں اور ــــ اب میں مزید حالات کا منتظر
ہوں، شاید میری قسمت میں بچ جانا لکھا ہوا ہے ورنہ تم ہی
مجھے پولیس کے حوالے کر دیتے۔ ممکن ہے میری آنکھ نہ کھلتی
یا ممکن ہے تم اپنی بیوی کی بات نہ مانتے۔

"کیسے نہ مانتا بابو۔ شریفہ تو میری زندگی ہے جو کچھ کرتا ہوں
اس کے لئے کرتا ہوں۔ جب وہی ناخوش تھی تو مجھے سالی
"دولت" کا کیا کرنا ہے۔"

میں خاموش ہو گیا۔ مزید ایک گھنٹے کے بعد ہم ایک
ساحل پر پہنچ گئے اور بشیر نے مجھے ساحل پر اتارتے ہوئے مجھ
سے مصافحہ کیا۔ "اچھا بابو ــــ اجازت دے، خدا تجھے نئی زندگی
دے"

شکریہ بشیر۔۔ ویسے مجھے اپنا وعدہ یاد رہے گا ممکن
ہے میں تمہیں وہ رقم دے سکوں، جو تم نے میرے لئے
ٹھکرا دی ہے

"اللہ مالک ہے بابو"، وہ ہنستے ہوئے بولا

"یہاں سے شہر کتنی دور ہے" میں نے اس سے پوچھا

"ارے بس ایک میل سے زیادہ نہ ہوگا، وہ
روشنیاں نظر آ رہی ہیں۔ ماہی گیری کے لئے یہی ساحل ہے
ورنہ میں تمہیں بندرگاہ پر اتارتا۔ وہاں سے شہر بالکل قریب
ہے" بشیر نے جواب دیا

"نہیں بشیر شکریہ میں چلا جاؤں گا۔ اور ایک دفعہ
اور اس سے گرمجوشی سے مصافحہ کر کے چل پڑا۔ چاند اپنا
فاصلہ طے کر چکا تھا اور چاندنی پھیکی پڑتی جا رہی تھی۔
روشنی ہونے سے پہلے رانی پور کے علاقے میں داخل ہو گیا
تھا۔ مجھے علم ہو گیا تھا کہ پولیس کو آج تک میری تلاش ہے
اس لئے اپنی حفاظت کرنا بھی ضروری تھا میرا لباس عجیب تھا
میں چاہتا تھا کہ کسی طرح اس لباس سے چھٹکارا حاصل کر لوں
لیکن اب یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ یہ سب کچھ تو عارف کے
دم سے تھا۔ اب تو میں دو وقت کے روٹی کے پیسے بھی نہیں
حاصل کر سکتا تھا

پھر کیا کروں۔ میرے راجکماروں جیسے لباس سے تو
لوگ میری طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ میں پریشان گھومتا
رہا۔ شہر کے بازار سنسان پڑے ہوئے تھے کہیں آوارہ کتے
بھونکتے نظر آتے تھے، لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ کوئی کتا
مجھے دیکھ کر نہیں بھونکا اور میں چلتا رہا یہاں تک کہ سورج
نکل آیا۔ لوگ ادھر ادھر آ جا رہے تھے اور میں ان کی نظریں
دیکھ رہا تھا میں اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ انہوں نے میرے
لباس کو دیکھ کر کیا اثر لیا ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا
کہ کوئی بھی میری طرف توجہ نہیں دے رہا تھا کسی نے مجھے
خاص طور سے نہیں دیکھا تھا۔ جب میں چلتے چلتے تھک
گیا تو سڑک کے درمیان بنے ہوئے ایک گھاس کے قطعہ
پر بیٹھ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں؟ پہلے میں اپنے
پوشیدہ کرنے انتظام کر دوں یا ـــ حالات کو اسی طرح چلنے
دوں۔۔ پھر میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ مجھے بہت جلد تارا
گڑھ پہنچ جانا چاہیئے۔ جتنی دیر لگاؤں گا اتنی ہی الجھنیں
بڑھیں گی۔ اس خیال کے تحت میں نے اسٹیشن جانے کی
ٹھانی ایک جگہ میں نے ایک راہ گیر کو روک کر پوچھا

"بھائی صاحب: اسٹیشن کو کونسا راستہ جاتا ہے

لیکن کوئی خر دماغ آدمی تھا یا پھر جلدی میں تھا اس نے
میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور آگے بڑھ گیا میں نے
ایک ٹھنڈی سانس لی اور چلتا رہا راستے میں میں نے ایک
تانگے والے کو روک کر راستہ پوچھنا چاہا لیکن تانگے
والا نرا جنگلی تھا اگر میں خود ہی راستہ سے نہ ہٹ جاتا تو

وہ تانگہ میرے اوپر چڑھا دیتا۔ میرا دل چاہا کہ تانگہ والے کو روک کر دو چار گالیاں دوں لیکن پھر میں نے اسے معاف کر دیا۔

ایک چوراہے پر میں نے تختیاں لگی دیکھیں جو مختلف سمتوں کا راستہ بتاتی تھیں اور انہیں میں سے ایک تختی پر اسٹیشن روڈ بھی لکھا ہوا تھا چنانچہ میں اس کی سیدھ میں چل پڑا اور تھوڑی دیر کے بعد اسٹیشن پہنچ گیا۔ لیکن یہاں ایک خاص خیال سوہان روح تھا۔ میرے پاس پیسے تو بالکل نہیں تھے۔ ٹکٹ کہاں سے لوں گا۔ بغیر ٹکٹ۔۔۔ نہ جانے کتنے مسافر بغیر ٹکٹ سواری کرتے ہیں۔۔ جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔

میں گاڑیوں کے چارٹ میں ٹرینوں کے اوقات، دیکھنے لگا ایک ٹرین ٹھیک نو بجے یہاں پہنچتی وہی ٹرین تارا گڑھ ہوتی جاتی تھی۔ میں ایک بنچ پر بیٹھ گیا پلیٹ فارم پر چائے کے اسٹال لگے ہوئے تھے۔ میرا دل چاہا کہ میں، چائے پیوں۔ لیکن پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر، خاموش ہو گیا۔ میرے پاس بالکل پیسے نہیں تھے، ناشتہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

خدا خدا کر کے نو بجے اور پھر اسٹیشن پر ٹرین کے آنے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ بالکل مسافر نہ تھے میرے علاوہ اکا دکا لوگ ٹہل رہے تھے ٹرین آ گئی اور میں تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں سوار ہو گیا۔ کافی مسافر بھرے ہوئے تھے لیکن ایک کونا خالی مل ہی گیا اور میں بیٹھ گیا۔

کبھی میں بھی ایک باعزت اور باوقار آدمی تھا مجھے ایسے جرائم سے سخت نفرت تھی جس سے انسان خواہ مخواہ ذلیل ہو۔ لیکن اب تو میری کوئی حیثیت کوئی عزت نہیں تھی جس کا دل چاہے جوتے مار سکتا تھا۔ میں تقدیر پر شاکر ہو کر بیٹھا رہا۔ ٹرین چند منٹ رکی اور پھر وسل دے کر آگے بڑھ گئی۔

کئی گھنٹے گذر گئے۔ کئی اسٹیشن آئے اور گذر گئے، مسافر چڑھتے اور اترتے رہے اور میں سہما سہما بیٹھا رہا، لیکن کسی نے مجھ سے تعرض نہ کیا۔ اب میرے جانے پہچانے مناظر شروع ہو گئے تھے۔ یہ میرا وطن تھا، میرا دیس۔ مجھے اس سے کیسی محبت تھی۔ میں اس پر کیسی کیسی کہانیاں لکھتا تھا لیکن یہ سب کچھ اب مجھ سے کس قدر اجنبی تھا۔ میں اپنے وطن کا مجرم تھا۔ میں اپنے وطن کے انسانوں سے خوفزدہ تھا۔ میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔

اور پھر میرا دل دھک سے ہو گیا ــــــ دروازے سے ٹکٹ چیکر اندر داخل ہو رہا تھا۔ موٹا جسم اور سخت چہرے والا ٹکٹ چیکر۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے بلی کو دیکھ کر کبوتر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ مسافر ٹکٹ دیتے رہے اور وہ انہیں چیک کرتا ہوا میرے قریب آتا رہا ــــــ

میری آنکھیں بند تھیں اور میں گہری گہری سانسیں لے رہا تھا

ٹکٹ، ٹکٹ چیکر کی آواز میرے کانوں میں گونجی اور میں گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ میں منتظر تھا کہ اب اس کا ہاتھ میرے گریبان پر پڑے گا، وہ مجھے اٹھا کر کھڑا کر دے گا اور پھر کمپارٹمنٹ میں بیٹھے لوگ میری بے عزتی کا تماشہ دیکھیں گے اور پھر کسی اسٹیشن پر مجھے ریل سے اتار کر حوالات میں پہنچا دیا جائے گا اور اس کے بعد ــــــ بغیر ٹکٹ سفر کے جرم میں پکڑے جانے والے کے بارے میں معلوم ہو گا کہ وہ تو ایک خطرناک قاتل اور جیل سے مفرور انسان ہے اخبارات سرخیاں لگائیں گے کہ ایک خطرناک قاتل شارق بڑے ڈرامائی انداز میں گرفتار ہو گیا۔

لیکن نہ جانے کیا ہوا ٹکٹ چیکر نے میرا گریبان نہ پکڑا۔

نہ ہی دوبارہ اس نے مجھ سے ٹکٹ کا مطالبہ کیا۔ میں نے سہمے ہوئے انداز میں آنکھیں کھول کر دیکھا تب مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے تو مجھ سے ٹکٹ مانگا ہی نہیں بلکہ میرے برابر بیٹھے ہوئے مسافر کا ٹکٹ دیکھ کر چلا گیا۔ الٰہی کیا ماجرہ ہے اس نے میرے اوپر یہ کرم کیوں کیا؟ اور میرا ذہن الجھن میں پھنسا دیا۔ سفر طے ہوتا رہا۔ جب بھی کوئی ٹی ٹی کمپارٹمنٹ میں آتا۔ میں لرز اٹھتا کہ ممکن ہے یہ پہلے ٹی ٹی کی طرح مجھے نظر انداز نہ کرے۔ لیکن رانی پور سے تارا گڑھ تک کا سفر بخوبی طے ہو گیا۔ مجھے بھوک کے علاوہ کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ تارا گڑھ کے پلیٹ فارم پر میں ریل سے اتر گیا۔

اب آخری مرحلہ اور باقی تھا۔

یعنی ریلوے پھاٹک سے نکلنا۔

لیکن اس مرحلے پر بھی مجھے کوئی دقت نہ ہوئی۔ گیٹ پر کھڑا ٹکٹ کلکٹر مسافروں سے ٹکٹ وصول کرتا رہا اور جب میری باری آئی تو وہ میرے پیچھے چند قدم دور آنے والے مسافر کو دیکھنے لگا۔ میں اطمینان سے اس کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔ میں ان پے در پے پیش آنے والے واقعات پر سخت حیران تھا ــــــ اور پھر میرے ذہن میں ایک خیال آیا ــــــ میری شخصیت میں کوئی تبدیلی تو نہیں ہوئی ــــ میں نے واقعات کا تجزیہ وہاں سے شروع کیا۔ جب بشیر مجھے رانی پور چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے لوگوں سے اسٹیشن کا راستہ پوچھا۔ لیکن وہ بے اعتنائی سے میرے قریب سے گزر کر چلے گئے۔ میں نے اسٹیشن پر کلرک سے گاڑیوں کے بارے میں پوچھا، اس نے بھی کوئی جواب نہ دیا، اور پھر ریل میں ٹکٹ چیکروں کا رویہ، اور یہاں اسٹیشن پر ــــــ

اوہ ــــــ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ لوگ مجھے دیکھ ہی نہ پا رہے ہوں ــــــ یہ بات قرین قیاس تھی ــــ میں جس دور سے گزر رہا تھا اس میں کوئی بات ناممکن نہیں رہی تھی۔ نیکی اور بدی بر سر پیکار تھی۔ نیکی کی قوتیں میرا تحفظ کر رہی تھیں۔ اور بدی میرے خلاف نبرد آزما تھی ــ اگر ایسا نہ ہوتا ــــــ اگر میں تنہا ہوتا تو پتھروں کے اس طلسم سے کبھی نہ نکل سکتا۔ لیکن میں نہ صرف وہاں سے نکل آیا تھا بلکہ ایسی جگہ نکلا تھا جہاں سے میری منزل زیادہ دور نہ تھی۔ ورنہ نہ جانے مجھے کہاں کہاں کا تکلیف دہ سفر کرنا ہوتا۔

اور اب ــــــ جب میرے وطن پر چپے چپے پر میرے دشمن بکھرے پڑے ہیں۔ ہر آن مجھے خطرہ تھا کہ میں کسی بھی لمحے گرفتار کر لیا جاؤں گا ــــــ مقامی پولیس کو میری تلاش تھی۔ میری گرفتاری پر انعام مقرر تھا۔ میرا تحفظ کرنے والی قوتوں نے مجھے دنیا کی نگاہوں سے اوجھل کر کے محفوظ کر دیا

تھا۔ اس تصور سے میرا دل کئی گنا بڑھ گیا۔ اور میں نے اپنے اس
خیال کو آزمانے کی کوشش کی۔

مجھے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ میں اسٹیشن سے کچھ دور
ایک چائے خانے کی طرف بڑھ گیا اور پھر چائے خانے میں داخل
ہوکر ایک میز پر بیٹھ گیا۔ میں نے بیرے کو آواز دی لیکن بیرا
میری طرف متوجہ نہ ہوا۔ نہ ہی قرب وجوار بیٹھے لوگوں نے میری
طرف دیکھا اور پھر میرے اس خیال میں کوئی شک و شبہ نہ رہا کہ
لوگ مجھے نہیں دیکھ سکتے۔

پھر اب میں کیا کروں؟ کھانے پینے کا کیا بندوبست کروں۔
بھوک لگ رہی تھی۔ کھانا میری دسترس سے باہر نہیں تھا،
اب تو میں جہاں سے چاہتا ہاتھ بڑھا کر کچھ بھی اٹھا سکتا تھا،
کسی کو علم نہ ہوتا۔ لیکن میرے دل نے یہ گوارا نہ کیا۔ بھوک
برداشت کرنا میرے لئے زیادہ مشکل نہ تھا۔ اب تو میں ایسی
تکلیفیں اٹھانے کا عادی ہو گیا تھا چنانچہ میں خاموشی سے
چائے خانے سے اٹھ آیا۔ بہرحال اب میرے دل سے پولیس
کا خوف دور ہو گیا تھا۔ اب تو صرف ایک ہی کام رہ گیا
تھا، ورنہ پہلے پولیس سے خوف دامنگیر تھا۔ چائے خانے
سے نکل کر میں چل پڑا۔ یہ میرا وطن تھا جہاں میں نے جنم لیا
تھا جس کے گلی کوچوں میں کھیل کر میں بڑا ہوا تھا جہاں کے
اسکولوں میں میں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ ایک ایک جگہ مانوس
تھی، ایک ایک جگہ سے مجھے محبت محسوس ہو رہی تھی۔ اگر
قسمت کھیل نہ بگاڑ دیتی تو اب یہیں کے کسی ادارے میں میں
کوئی بڑا افسر لگا ہوتا۔

لیکن اب ——— اب میں یہاں چوروں کی طرح داخل
ہوا تھا اور چوروں ہی کی طرح سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ آپ کسی
ایسے شخص کے دل کی کیفیات کا اندازہ کر سکتے ہیں جو اپنے ہی
وطن میں اس قدر اجنبی ہو۔ میں کچھ شکلوں کو پہچان رہا تھا
لیکن انہیں مخاطب نہیں کر سکتا تھا کیسی عجیب بدنصیبی،
کیسی عجیب بے بسی تھی۔ لیکن یہی بے بسی اب میرا مقدر تھی۔
میرے لئے کسی کو مخاطب کرنا نہ کرنا برابر تھا۔ اوّل تو میری
آواز ہی کوئی نہ سنتا۔ دوسری بات یہ کہ اگر وہ آواز سن
سکتے، مجھے دیکھ بھی سکتے، تب بھی یا تو مجھے گرفتار کرانے
کے سنہرے خواب دیکھتے یا پھر مجھ سے نفرت کا اظہار کرتے کیونکہ
ہمارا خاندان اب یہاں کا بدنام ترین خاندان تھا۔ باسدیو
نے ہمارے لئے جو گڑھے کھودے تھے ان کا پُر کرنا ناممکن تھا۔

میں ایک ایک چیز کو حسرت سے دیکھتا آگے بڑھتا رہا۔
گو میرا مشن دوسرا تھا۔ ایسی شکل میں مجھے نہ تو ان باتوں کی
طرف توجہ دینی چاہئے تھی، نہ ان کی پرواہ کرنی چاہئے تھی۔
وہاں، تارا گڑھ کے ڈھلوانوں سے پرے اس ویران مسجد میں
مکڑی کے جالوں کے اندر خوابیدہ حسن میرا منتظر ہے ۔ مجھے
جلد از جلد اس کے پاس پہنچ جانا چاہئے ۔

اور اس تصور نے میری تمام محرومیوں کو دور کر دیا۔
میں اپنے والدین کو کھو چکا تھا۔ اپنا خاندانی وقار کھو بیٹھا تھا۔
یہ چیزیں میں واپس نہ لا سکتا تھا۔ جو ہونا تھا وہ تو اب ہو
ہی چکا تھا۔ لیکن ان تمام چیزوں کے صلے میں مجھے جو کچھ
ملنے والا تھا وہ ان سب کا نعم البدل تو نہیں تھا، کیوں کہ
ماں کی مامتا، باپ کی شفقت، بہن کا پیار، خاندان کی
عزت، کوئی چیز ایسی نہیں تھی جو انمول نہ ہو۔ لیکن اب یہ
سب کچھ میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس کے بدلے میں مجھے
نہ جانے کیا ملنے والا تھا، ممکن ہے وہ میرے دکھوں کا مداوا
بن جائے۔

میں نے ذہن سے تمام خیالات جھٹک دیئے اور
ایک طویل چکر کاٹ کر اپنے مکان کے قریب پہنچ گیا۔
ہاں ——— یہ وہی خوبصورت علاقہ تھا جہاں میں رہتا تھا۔
یہیں اسی جگہ کبھی میرا مکان تھا لیکن مشتعل پڑوسیوں نے
میرے مکان کی بنیادیں تک کھدوا کر پھنکوا دی تھیں اور اب

وہاں میرے مکان کا کوئی وجود نہیں تھا۔

لیکن تاراگڑھ کے ڈھلوان اسی طرح تھے۔ ان کے اختتام پر پیپیوں کے درخت یونہی لہرا رہے تھے۔ اس پورے علاقے کا حسن اسی طرح برقرار تھا۔ میں سست قدموں سے اپنے گھر کی کھدی ہوئی بنیادوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ اپنا گھر یاد کر کے ایک بار پھر میرے دل میں ہوک سی اٹھی تھی اور میرے قدم سست پڑ گئے تھے۔ پھر میں نے آنکھوں کی کوروں سے آنسوؤں کی نمی خشک کر کے اور آگے بڑھ گیا۔ اب میرے قدم ڈھلانوں کی طرف تھے۔

جوں ہی میں نے ڈھلانوں پر قدم رکھا، میرے کانوں میں خوفناک آوازیں آنے لگیں یہ آوازیں مجھے روک رہی تھیں۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

"خبردار، ایک قدم آگے بڑھایا تو قیامت آ جائے گی، خبردار، پیچھے ہٹ پیچھے ہٹ جا!"

میں نے سہمے ہوئے انداز میں چاروں طرف دیکھا، آوازوں کا مخرج مجھے معلوم نہ ہو سکا۔

میں ڈھلان پر اتر گیا۔ میں جانتا تھا کہ باسدیو کی شکست نزدیک آ پہنچی ہے۔ اس وقت وہ جو کچھ بھی کرے کم ہے۔ چنانچہ میں نے ان آوازوں پر توجہ نہ دی۔ اور کئی قدم ڈھلان پر نیچے اتر گیا۔ اور اچانک میں نے زمین ہلتی محسوس کی۔ ہاں زمین ہل رہی تھی۔ زلزلہ آ گیا تھا، فضا میں ایک خوفناک گونج ابھر رہی تھی۔ اور یہ۔۔۔ میرا وہم نہیں تھا۔ کیونکہ چند ہی لمحات کے بعد میں نے ڈھلان کے اوپر آبادی میں چیخ و پکار کی آوازیں سنیں۔ لوگ گھروں سے نکل رہے تھے۔ عورتیں، بچے، بوڑھے سب زلزلہ آ گیا، زلزلہ آ گیا چیخ رہے تھے۔

اور اب زمین باقاعدہ ہل رہی تھی۔ میرے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ میرے سامنے درخت زمین سے اکھڑ کر

آدمی اور پراسرار علوم پر
ایک بار پھر سنسنی خیز کتاب
پیش کرتے ہیں

اردو میں اپنی نوعیت کی سب سے الگ سب سے منفرد اور مفید کتاب
جسے ہر شخص، ہر فرد اور ہر گھر کی ضرورت کہا جا سکتا ہے
قیمت ۱۰ روپے

کالا جادو، جیسے ہیبت ناک علم پر
سنسنی خیز کتاب

قیمت ۱۰ روپے

یہ دو نوں کتابیں آپ بذریعہ وی پی حاصل کر سکتے ہیں

ہر بک اسٹال
پر بھی دستیاب ہیں

۳۷۔ اردو بازار کراچی

گر رہے تھے۔ آبادی کی اونچی عمارتیں گرنے لگی تھیں اور شور بڑھتا جا رہا تھا۔ میں انتہائی کوشش کے باوجود اپنے پاؤں زمین پر نہ جما پا رہا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میں کسی جھولے میں جھول رہا ہوں۔

اور پھر میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور نیچے گر پڑا۔ میں ڈھلان پر لڑھک رہا تھا۔ بری طرح۔ اور زمین ہل رہی تھی۔ یہ زلزلہ تاراگاہ کے تاریخی زلزلوں میں شمار ہوتا ہے۔ ممکن ہے لوگ اب بھی میری بات پر یقین نہ کریں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ تباہی صرف میری وجہ سے پھیلی تھی۔ یہ عفریتی قوتوں کا کرشمہ تھا۔ میرے قریب کئی جگہ سے زمین پھٹ گئی تھی۔ ممکن تھا کہ میں کسی دراڑ میں جا پڑتا، لیکن اس وقت میرے بس میں کچھ نہیں تھا۔ میں لڑھک رہا تھا اور میرے جسم میں پتھروں اور کانٹوں کے چبھنے سے خراشیں پڑ رہی تھیں۔ بالآخر میں ڈھلان کے اختتام پر رک گیا۔ لیچیوں اور خوبانیوں کا باغ اجڑ گیا تھا۔ تمام درخت جڑوں سے اکھڑ کر ایک دوسرے سے الجھے پڑے تھے۔

ایک درخت کے نیچے میں نے تلسی کی لاش دیکھی۔

تلسی میرا بوڑھا دوست ـــــ جس نے مجھے منع کیا تھا کہ آج میں جنگلوں میں نہ جاؤں منگل کا دن ہے اور بری روحیں آزاد ہوتی ہیں۔ میں نے تلسی کی کمر پر پڑے ہوئے درخت کو کھسکانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ زلزلہ رک چکا تھا۔ لیکن ڈھلان کے اوپر خوفناک شور اب بھی سنائی دے رہا تھا۔ نہ جانے کتنا زبردست انسانی زندگی کا نقصان ہوا تھا۔

میں نے دونوں انگلیوں سے کان بند کر لئے۔ یہ شور مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اس شور سے میرے کان پھٹے جا رہے تھے۔ میں تلسی کی لاش کے نزدیک کھڑا رہا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اگر مجھے زلزلے سے پہلے وہ ہیبت ناک آوازیں نہ سنائی دیتیں جو مجھے ڈھلان سے اترنے سے روک رہی تھیں تو میں اس زلزلے کو اتفاقیہ سمجھتا لیکن ـــــ اب ان انسانی زندگیوں کی تباہی کا ذمہ دار میں خود کو سمجھ رہا تھا۔ میری وجہ سے یہ سب کچھ ہوا تھا ـــــ یا سدیو اپنی آخری حرکت سے باز نہیں آیا تھا۔

لیکن بے سود ـــــ سب کچھ بے سود ـــــ میں کوئی انتقامی کارروائی نہیں کر سکتا تھا۔ قدرت خود ہی اس موذی کے لئے کوئی بندوبست کرے گی۔ میں نے سوچا۔ اور پھر میں تلسی کی لاش کے پاس سے ہٹ گیا۔ لیچیوں کے اجڑے ہوئے باغ کو دیکھ کر مجھے بہت غم ہو رہا تھا۔ میں نے چند قدم آگے بڑھائے اور اچانک مجھے گہری گہری سانسوں کی آوازیں سنائی دیں۔

بے شمار آوازیں ـــــ ان میں کچھ آوازیں اسٹیم انجنوں کی آوازوں سے مشابہ تھیں۔ کچھ آوازوں سے سیٹیاں سی بلند ہو رہی تھیں۔ میں نے تلسی کی لاش پر پڑے ہوئے موٹے درخت کو بل کھا کر تلسی کی لاش سے ہٹتے ہوئے دیکھا۔ وہ کسی نرم چیز کی طرح مڑ رہا تھا۔ تلسی کی لاش سے ہٹ کر وہ پلٹا ـــــ اور میری نگاہ اس کے سر پر پڑ گئی۔ اس کا سر پھیلا ہوا تھا اور اس میں دو سرخ سرخ آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔ ہیبت ناک آنکھیں ـــــ

دہشت سے میری چیخ نکل گئی ـــــ اور میں اچھل کر وہاں سے بھاگا۔ لیکن چند قدم دوڑتے ہی میرے قدم رک گئے۔ لیچیوں کے دوسرے درخت بھی کروٹیں بدل رہے تھے۔ وہ سب ایک دوسرے پر چڑھتے جا رہے تھے۔ سب کے جسم لچک دار ہو گئے تھے۔ اور ان کے سرے پھیل کر اژدھوں کے چہروں کی شکل اختیار کر گئے تھے ـــ جن کی

خوف ناک آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں اور موٹی موٹی زبانیں مجھے ہڑپ کرنے کے لئے بار بار نکل رہی تھیں۔ ان کے جسم مجھو اُچھاپے ہے تھے اور میرے لئے یہاں سے نکلنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ میرا کلیجہ خوف و دہشت سے پھٹنے لگا۔ میں نے چیخنے کی کوشش کی آواز نہ نکل سکی — پھر ایک اژدھا پھن پھیلائے میرے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اور میں اچھل کر بھاگا۔ اب مجھے ان اژدھوں کے جسموں پر سے گزرنا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی ترکیب نہیں تھی۔ میرے وزنی قدم ان کے لیجلجے جسموں پر پڑ رہے تھے اور وہ بل کھا رہے تھے۔ کئی بار میں ان کے جسموں پر گرا۔ میں نے کئی اژدھوں کو خود پر جھپٹنے کی کوشش کرتے دیکھا لیکن میں پھر اٹھ کر بھاگا۔ میں ہر قیمت پر یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ بالآخر میں ان کے درمیان سے نکل گیا۔ لیکن دُور دُور تک سیاہ ناگ پھنکار رہے تھے۔ چھوٹے بڑے کالے اور رنگین سانپ۔ کئی سانپ تیزی سے میری طرف لپکے اور میں نے راستہ بدل دیا۔ میں جس راستے پر جا رہا تھا سانپ میرا تعاقب کر رہے تھے لیکن کب تک!

یہ مصیبت بھی میرے لئے کچھ نہ رہی اور پھر میں لیچیوں کے باغ سے کافی دُور پہاڑی میدان میں نکل آیا۔ بھاگ دوڑ سے میرا سانس بُری طرح پھول گیا اور میں ایک بڑے پتھر سے پیٹھ لگا کر گدھے کی طرح ہانپنے لگا۔ میرا دل اچھل کر نکل پڑنا چاہتا تھا آنکھوں کے سامنے تاریکی پھیل رہی تھی۔ لیکن میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا۔ اور جب تھوڑی دیر کے بعد میری کیفیت درست ہوئی تو میں نے خوف زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اب شیلا یا بسیلا اور کون سی آفت مجھ پر نازل کرنا چاہتی ہے۔

سانپوں اور اژدھوں کا اب دُور دُور تک پتہ نہیں تھا اور میرے چاروں طرف ویران چٹانیں بکھری ہوئی تھیں۔ میں آگے بڑھ گیا۔ یہاں سے میں نے راستے کا صحیح تعین کر لیا تھا اور آگے بڑھ رہا تھا۔ جوں جوں میرے قدم مسجد کی طرف اُٹھ رہے تھے میرے جسم میں ایک نئی قوت آتی جا رہی تھی۔ ایک بار پھر میرے ذہن میں اس حسین عورت کا تصور اُبھر آیا تھا۔ جو مکڑی کے جالے کے اندر سو رہی تھی۔ اور میرے دل میں اسے دیکھنے اسے چھونے کا شوق کروٹیں بدل رہا تھا۔

اور اب میں اس منحوس جگہ تھا جہاں باسدیو ایک معذور بوڑھے کی شکل میں پہلی بار مجھے ملا تھا۔ ہاں، یہی وہ جگہ تھی۔ جہاں سے میری بدنصیبی کا دَور شروع ہوا تھا۔ میں نے حقارت سے اس جگہ کو دیکھا اور اس پر تھوک دیا۔ مجھے اس جگہ سے سخت نفرت محسوس ہو رہی تھی — پھر میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

لیکن — ابھی تھوڑی ہی دُور چلا ہوں گا کہ اچانک میرے کان ایک عجیب قسم کی آواز سے گونج اٹھے۔ یہ گھوڑوں کے ٹاپوں کی سی آواز تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے بے شمار گھوڑے دوڑ رہے ہیں۔ ٹاپوں کی آوازوں میں گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں بھی شامل تھیں — اور یہ آوازیں قریب آتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"وہم —" میں نے سوچا۔

لیکن یہ وہم نہیں حقیقت تھی — چند لمحات کے بعد میں نے ایک ٹڈی دل لشکر دیکھا۔ تاحدِ نگاہ گھوڑے ہی گھوڑے پھیلے ہوئے تھے — اور آہن پوش ان گھوڑوں پر سوار تھے۔ سب سے آگے تین آدمی تھے۔ ایک کے ہاتھ میں ایک پرچم لہرا رہا تھا۔ نیلے رنگ کا پرچم جس پر سیاہ رنگ کے کسی عفریت کی شکل بنی ہوئی تھی۔ باقی دو آدمی خالی ہاتھ تھے۔

کیا آپ حیرت انگیز کتاب پڑھنا چاہتے ہیں؟

کیا آپ نے یہ کتاب پڑھ لی؟

نروان کی تلاش ایک ایسے شخص کی کہانی جو

ناقابلِ تسخیر قوتوں کا مالک تھا

راجہ ہوا اصغر

کی ناقابل فراموش آپ بیتی

نروان کی تلاش

اب کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے

ہر بک سٹال پر دستیاب ہے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ ۳۷۔ اردو بازار کراچی

پرشکر ایک نیم دائرے کی شکل میں پھیلا ہوا تھا ایسا لگتا
تھا جیسے وہ مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوں۔ میں رک گیا
اور بت بنا ان سواروں کو دیکھنے لگا۔ جو اب کافی قریب آ
گئے تھے۔ سامنے والے دو سواروں کے قریب آتے ہی میں
ان میں سے ایک کو پہچان گیا۔

یہ راجہ باسدیو تھا۔ اس وقت وہ بالکل جوان نظر
آرہا تھا۔ ماتھے پر چندن تلک لگائے ہوئے بڑی بڑی سیاہ
مونچھوں اور خوفناک آنکھوں سے وہ مجھے گھور رہا تھا۔
پھر اس نے اپنے گھوڑے کی زین میں اڑسا ہوا ترسول نکال
لیا۔ تین پھل والا چمکدار ترسول ——— اور اسے بلند کر لیا۔

"مہاراجہ باسدیو کی ——— جے ——" پورے لشکر نے
نعرہ لگایا۔

اور میرے کان اس شور سے پھٹنے لگے۔

باسدیو گھوڑا دوڑاتا ہوا میرے سامنے پہنچ گیا۔

"سمے آ گیا ہے مورکھ ——— کہ میں ترسول میں تیرے
شریر کو پرو دوں۔ میں نے آج تک تیرے ساتھ نیائے
کیا، پر تو نے میری بات نہ مانی۔ تو جس اپسرا کے سپنے
دیکھ رہا ہے وہ ترسول کنڈ کی داسی ہے۔ اسے اوش
ترسول کنڈ کی داسی بننا ہے۔ وہ تیری نہیں ہو سکتی ——
میں نے دیوتاؤں کو وچن دیا ہے اور اگر میں اپنا وچن
پورا نہ کر سکا تو میری برسوں کی تپسیا بھسٹ ہو جائے گی۔
اب مجھے تیرے جیون کی چنتا نہیں ہے۔ میں کوئی اور
اوپائے کر لوں گا۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ترسول
تول لیا۔ اور میں خوفناک نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

اس وقت میرے کان میں ایک آواز آئی۔

"شارق ——— اسے سنبھالو۔"

اور میرے داہنے ہاتھ میں کوئی سخت اور ٹھنڈی
چیز آ گئی۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ ایک تلوار
کا دستہ تھا۔ بجلی اور چمکدار تلوار ——— اور وہ آواز
اگر میرے کانوں نے دھوکا نہیں کھایا تو وہ آواز مہ
برق کی تھی۔ ہاں میں نے اس آواز کو صاف پہچانا تھا
تو میں بے سہارا نہیں ہوں، میرے محسن میرے دوست
میرے ساتھ ہیں وہ میری مصیبتوں سے آگاہ ہیں۔ اور
میری مدد پر کمربستہ ہیں۔ میرا دل بے انتہا بڑھ گیا
اور میں نے غراتے ہوئے کہا۔

"آج میں بھی تیرے سے پورا حساب بیباق کر لینا
چاہتا ہوں ناہنجار شیطان۔ دیکھتا ہوں آج ہم دونوں
میں سے کون باقی رہتا ہے۔" میں نے تلوار کبھی چھوئی
بھی نہیں تھی، لیکن اس وقت مجھے ایسا لگ رہا تھا
جیسے میں ایک ماہر شمشیر زن ہوں۔

راجہ باسدیو نے اپنے گھوڑے کو حرکت دی اور
گھوڑا تیر کی طرح میری طرف لپکا۔ باسدیو کا ترسول
میرے جسم میں پیوستہ ہونے کے لئے جھکا ہوا تھا جونہی وہ
میرے قریب سے گزرا، میں نے پینترا بدل کر اس کا وار
خالی دیا بلکہ خود بھی اس پر حملہ کر دیا۔ میری برق صفت تلوار
اس کے گھوڑے کی پچھلی ٹانگ پر پڑی اور گھوڑا تین
ٹانگوں کا رہ گیا۔ اس نے قلابازی کھائی اور باسدیو
منہ کے بل نیچے آرہا۔ اس کے ترسول کا پھل زمین میں
ایک فٹ کے قریب دھنس گیا تھا۔

میں نے اسے ترسول نکالنے کا موقع نہ دیا اور تلوار
لے کر اس پر چھلانگ لگا دی۔ میرے جسم میں انگارے بھرے
ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ
وقت تمام عمر کے بدلے لینے کا ہے۔ میں اس وقت باسدیو
کو ہر قیمت پر قتل کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے اس پر تلوار
کا بھرپور وار کیا، لیکن وہ جھکائی دے کر نکل گیا۔ اسی
وقت اس کے دوسرے ساتھی نے اس کی طرف اپنا گھوڑا

کھانڈا اچھال دیا۔ باسدیو نے کھانڈا پکڑ لیا۔ بھوڑا اور زنی کھانڈا سنبھال کر باسدیو مجھے گھورنے لگا۔ اس وقت اس کا لشکر اس سے تقریباً پچاس گز دور خاموش کھڑا تھا لیکن سب کی غیض و غضب میں ڈوبی آنکھیں مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔ میں نے ان کی کوئی پرواہ نہیں کی اور باسدیو کے وار کا انتظار کرنے لگا۔

باسدیو بھی کھانڈا تولے مجھ پر نظریں جمائے پینترے بدل رہا تھا۔ پھر اس نے موقع پاتے ہی کھانڈے کا بھرپور وار کیا اور میں بجلی کی طرح ایک طرف کود گیا۔ میں نے اس پر ترچھا وار کیا۔ لیکن باسدیو بھی ہوشیار تھا وہ پلٹا کھا گیا۔ اور میری تلوار اس کے شانے کے پاس سے نکل گئی۔ ہم دونوں پھر آمنے سامنے تھے۔ ہماری آنکھوں میں خون تھا۔ اور دل میں ایک دوسرے کو قتل کر دینے کی خواہش۔ لیکن دونوں مدمقابل زور دار تھے میرے پاس ایمان کی قوت تھی تو شیطان باسدیو کے ساتھ تھا۔ ہم نے ایک دوسرے پر وار کیا۔ باسدیو کا کھانڈا وزنی تھا۔ اس لئے اسے خود کو بچانے کے بعد کھانڈا ابھی سنبھالنا پڑتا تھا اس کے برعکس میری تلوار ہلکی تھی۔

اور اس بار میں نے اپنی تلوار کے ہلکے پن سے پورا فائدہ اٹھایا۔ باسدیو نے میرے اوپر کھانڈے کا وار کیا اور میں نے اس کے وار کو خالی دیتے ہوئے تلوار کا وار بھی کر دیا۔ باسدیو اس وار کو خالی دینے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ میں نے یوں بھی جان بوجھ کر اس وار کو ہلکا کیا تھا تاکہ اس کے فوراً بعد دوسرا وار کر سکوں۔ اور یہی ہوا —— باسدیو میرا متوقع وار خالی دے کر اپنے کھانڈے کی طرف متوجہ ہوا اور میں نے ایک بھرپور وار اس پر کر دیا۔

باسدیو کی گردن اس کے شانوں سے علیحدہ ہو کر کئی گز دور جا گری اور میری تلوار سے خون ٹپکنے لگا۔ لیکن باسدیو کا لشکر اب بھی خاموش کھڑا ہوا تھا —— باسدیو کا جسم زمین پر گر پڑا۔ اس کی کٹی ہوئی گردن دور تڑپ رہی تھی۔ باسدیو کے قدم اس کی طرف بڑھے اور اس نے دونوں ہاتھوں سے گردن اٹھا کر پھر شانوں پر رکھ لی اور تلوار لے کر میرے مقابل آ گیا۔

یہ دیکھ کر میرا دل ٹوٹنے لگا۔ اور میں نے ایک بار پھر سنبھل کر اس پر وار کر دیا لیکن باسدیو کی مدافعت میں اب پہلے جیسی جان نہیں رہی تھی۔ ایک بار پھر اس کی گردن شانوں سے اڑ گئی۔

لیکن بے فائدہ —— اس نے گردن دوبارہ اٹھا کر شانوں پر رکھی اور کھانڈا لے کر میرے مقابل آ گیا —— لیکن اب اس کا لشکر اس کی کمزوری محسوس کر چکا تھا، چنانچہ ان سب نے ہتھیار بلند کر لئے اور مہاراجہ باسدیو کی جے کا نعرہ لگا کر میری طرف دوڑ پڑے۔ لیکن اسی وقت نہ جانے کیا ہوا۔ آگے دوڑنے والے گھوڑے بری طرح زخمی ہو کر نیچے گرے اور اس کے ساتھ ہی باسدیو کے لشکر میں ابتری پھیل گئی۔ تلواریں چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، باسدیو کا لشکر بھی سہمے ہوئے انداز میں حملے کر رہا تھا۔ لیکن ان کے گھوڑوں کی زینیں خالی ہوتی جا رہی تھیں۔ کسی غیر مرئی لشکر نے ان پر حملہ کر دیا تھا۔ اور تیزی سے اس کا صفایا کر رہا تھا۔

میں نے باسدیو کی طرف دیکھا جو کھانڈا اٹھائے شرابیوں کے سے انداز میں جھوم رہا تھا اور اس بار میں نے اس کی کمر پر وار کر کے اس کے دو ٹکڑے کر ڈالے۔ لیکن نتیجہ کچھ بھی نہ ہوا۔ اس کے جسم کے دونوں ٹکڑے زمین پر گھسٹتے گھسٹتے ایک دوسرے سے آ ملے اور

وہ پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن اب اس نے کھانڈا پھینک دیا تھا۔
پھر وہ لپک کر ایک گھوڑے پر چڑھ گیا۔ اور اس نے اپنے لشکر
کو بھاگ چلنے کا مشورہ دیا۔ دوسرے لمحے گھوڑوں کے رُخ
بدل گئے اور وہ بری طرح بھاگ نکلے میں تلوار زمین سے ٹیکے
بھاگنے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً میں گرتے گرتے بچا۔
تلوار اچانک میرے ہاتھ سے نکل کر غائب ہو گئی۔

میں نے چونک کر پشت کی طرف دیکھا لیکن وہاں کوئی
نظر نہ آیا۔ پھر میں نے سامنے دیکھا جہاں چند ساعت قبل
ایک شکست خوردہ لشکر بھاگ رہا تھا۔ لیکن میری حیرت کی
انتہا نہ رہی جب مجھے سامنے چٹیل پہاڑیوں کے علاوہ کچھ
نظر نہ آیا۔ شکست خوردہ لشکر کے مرنے والوں کی ایک بھی
لاش وہاں موجود نہ تھی۔ یہاں تک کہ میرے قریب باسدیو
کے جسم سے بہنے والے خون کے نشان بھی باقی نہ رہے تھے۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ بہرحال باسدیو سے
میرا یہ آخری معرکہ خوب رہا۔ اور اس معرکے میں باسدیو کو
مکمل شکست ہو گئی۔ میرا جسم شل ہو رہا تھا۔ میں بھوک سے
نڈھال تھا۔ اس پر اتنی مشقت کی تھی اس لئے اور برا
حال ہو گیا تھا۔ لیکن اب منزل دور نہ تھی۔ اور میرے قدم
منزل کی طرف بڑھ گئے۔ میں تھکن سے چور ہونے کے باوجود
پوری لگن سے مسجد کی طرف جا رہا تھا۔ اور اب میرے
راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہ گئی تھی۔ میں چلتا رہا ــــ
اور منزل قریب آتی رہی۔

اور تھوڑی دیر کے بعد وہ مسجد میرے سامنے تھی۔
وہی بوسیدہ مسجد جس کے دروازے پر پہلی بار مجھے شیر
نظر آیا تھا اور اس کے بعد ایک گہری خندق ـــ مسجد
کا بوسیدہ دروازہ بند تھا۔ میں چند ساعت رک کر اسے
دیکھتا رہا ـــ اور پھر میرے قدم آہستہ آہستہ سیڑھیوں
کی سمت بڑھ گئے۔ جونہی میں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا
مسجد کا چوبی دروازہ ایک دلنشیں آواز کے ساتھ کھل
گیا۔ اندر سے ایک مست کن خوشبو کی لہر نکل کر میری
ناک سے ٹکرائی اور میرا ذہن معطر ہو گیا۔

میرے ہونٹوں پر خود بخود مسکراہٹ پھیل گئی میری
آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی اور بھوک کا احساس جاتا رہا۔
مجھے پرندوں کے خوش گوار نغمے سنائی دینے لگے ــــ یہ
عجیب سحر انگیز آوازیں تھیں۔ جو میرے ذہن و دل کو
سرور بخش رہی تھیں۔ میں نے دوسری سیڑھی پر قدم رکھا۔
اور مسجد کے اندر کا منظر مجھے نظر آنے لگا۔ میں سوچ بھی
نہیں سکتا تھا کہ باہر سے بوسیدہ نظر آنے والی یہ مسجد
اندر سے اس قدر خوبصورت ہو گی۔ سامنے ہی ایک لمبا
حوض نظر آ رہا تھا۔ جس کے درمیان لگے ہوئے فواروں
میں پانی کی دھاریں اُبل رہی تھیں۔ گہرے سبز درخت لہلہا
رہے تھے۔ خوش رنگ پھول چاروں طرف جھوم رہے تھے۔

تیسری سیڑھی سے گزر کر میں دروازے کے قریب
پہنچ گیا اور مجھے چاروں طرف عجیب سے روشن سائے
محسوس ہوئے۔ مجھے احساس ہوا جیسے میں یہاں تنہا نہیں
ہوں میرے قریب بہت سے لوگ ہیں جو مجھے دیکھ رہے
ہیں اور میرے اس خیال کی فوراً ہی تصدیق بھی ہو گئی۔
میری گردن میں پھولوں کے ہار پڑنے لگے۔

ہار ڈالنے والے ہاتھ مجھے نظر نہیں آ رہے تھے لیکن
میں ان کی سرسراہٹیں محسوس کر رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا
تھا جیسے میں قطار در قطار کھڑے ہوئے لوگوں کے درمیان
سے گزر رہا ہوں وہ سب مجھ پر پھول برسا رہے تھے۔
میرا پورا جسم پھولوں کی نازک پتیوں سے ڈھک گیا تھا۔
اور میرے قدم خود بخود مسجد کے اس دروازے کی طرف
اٹھ رہے تھے جو بند تھا۔

میرے قریب پہنچنے پر وہ دروازہ بھی کھل گیا اور میں

اس سے اندر داخل ہو گیا۔ اندر دھیمی اور ٹھنڈی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس نیلی روشنی میں ایک آرام دہ مسہری پر وہ محوِ خواب تھی۔ وینس کے مجسمے سے زیادہ خوبصورت، میرے تصورات سے کہیں زیادہ حسین۔ اس کے چہرے پر بے پناہ تقدس اور پاکیزگی تھی۔ میں بے اختیار ہو گیا۔ میرا دل اس کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ میرے ذہن میں جنون پرورش پانے لگا۔ میرا دل بے اختیار چاہا کہ میں آگے بڑھ کر اس کے کومل قدموں کو چوم لوں۔

لیکن درمیان تارِ عنکبوت حائل تھا۔ چاندی جیسے چمکدار تاروں کا حصار۔ میں آگے بڑھ کر اس کے قدموں کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر چاندی کے تار توڑ دیئے۔ اور ایک نورانی دھواں بلند ہو گیا۔ ایک عجیب دھواں جس میں ایک انوکھی مہک تھی۔ میں اس کے سراپا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک ریشمی لباس میں ملبوس تھی، کفن نما لباس۔ جو اس کے پورے جسم کو مناسب طور سے ڈھکے ہوئے تھا۔

چاندی کے تار دھواں بن کر فضا میں تحلیل ہو چکے تھے اور پھر میری آنکھوں نے اس کے سینے کا زیروبم دیکھا مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ سانس لے رہی تھی ـــــ ہاں ـــــ وہ سانس لے رہی تھی۔ گہرے گہرے سانس اور پھر اس کے گلاب کی پتی جیسے ہونٹوں پر ایک حسین مسکراہٹ پھیل گئی ایسی مسکراہٹ جیسے پھول شبنم سے دھل کر مسکرانے لگتے ہیں۔ شاید وہ کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔ کوئی حسین خواب، ـــــ

اور پھر مسکراہٹ سمٹ گئی۔ اب اس کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آ رہے تھے وہ پریشان سی تھی۔ اور اسی عالم میں اس نے اپنا ایک مرمریں ہاتھ بلند کیا جیسے وہ کسی کا سہارا لینا چاہتی ہو۔ اور میں دیوانہ وار آگے بڑھ کر گیا۔ میں نے اس کا نازک ہاتھ تھام لیا۔

اور میرے لمس سے اس نے آنکھیں کھول دیں ـــ آہ کیسا سحر تھا اس کی آنکھوں میں، کیسا جادو تھا ان آنکھوں میں۔ سادگی، بھولپن، حیرت، سب کچھ ان نگاہوں میں شامل ہو گیا تھا۔ اور پھر اسے میری محویت اور میرے ہاتھ کے لمس کا احساس ہوا۔ اور اس نے اپنا نازک ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ سرپر کفن برابر کر رہی تھی جس سے اس کے ریشمی سیاہ بال ڈھک گئے۔ اس کی نظریں جھک گئیں۔ اور چہرے پر شرم کے آثار ابھر آئے۔ پھر وہ آہستہ سے اُٹھ کر مسہری پر بیٹھ گئی۔

میں اپنے ہوش میں نہیں تھا میں پوری کائنات کو بھول گیا تھا۔ مجھے صرف وہ یاد تھی۔ اس کے علاوہ دنیا میں کچھ نہ تھا۔ میں بے اختیار ہو کر اس کی پائنتی پہ بیٹھ گیا۔

"مجھے گناہگار نہ کریں۔ آپ کی جگہ وہ نہیں ہے۔" وہ جلدی سے مسہری سے اترتے ہوئے بولی۔ "آپ کے قدموں میں تو میری جگہ ہے۔" اس کی آواز کا ترنم میرے کانوں میں رس گھول گیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"تسنیم۔" اس نے مترنم آواز میں کہا۔

"میرا نام شارق بزمی ہے ـــــ" میں نے کہا۔

"میں جانتی ہوں۔" اس نے گردن جھکائے جھکائے کہا۔

"وہ کیسے؟ تم مجھے کیسے جانتی ہو؟" میں نے مضطربانہ اور پرشوق لہجے میں کہا۔

"آپ کے علاوہ میں اور کسے جانوں گی۔ آپ نے میرے لئے اپنا گھر بار لٹایا ہے، آپ نے میرے لئے جو قربانیاں دی ہیں، کیا میں ان سے بھی واقف نہیں ہوں گی۔ میرے

جسم کا رو داں رو داں آپ کا شکر گزار ہے۔ میں آپ کو اس وقت سے جانتی ہوں جب منحوس راجہ باسدیو نے آپ کی پشت پر سوار ہو کر مسجد تک آنے کی کوشش کی تھی۔ میرا جسم سو رہا تھا لیکن روح جاگ رہی تھی۔ اور پھر میری روح آپ کا تعاقب کرتی رہی۔ میں آپ کو پہنچنے والی ہر اذیت پر تڑپ اٹھتی تھی۔ آہ ـــــ آپ کو نہیں معلوم میری روح زخموں سے چور ہے، یہ زخم آپ کی تکلیف کے ہیں۔ میری روح اس وقت بھی درد و کرب سے تڑپ رہی تھی جب آپ موت کی تلاش میں سرگرداں تھے جب آپ خودکشی کرنا چاہتے تھے! اور یقین کیجئے اگر خدانخواستہ آپ خودکشی میں کامیاب ہو جاتے تو میں خدائے قدوس سے دعا کرتی کہ مجھے اب کسی زندگی کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے بھی موت دے کر آپ سے ملا دے۔ میں آپ کے بغیر زندہ نہیں رہنا چاہتی تھی شارق صاحب۔ اور پھر ـــــ وہ میں ہی تھی جس نے آپ کو ترسول کنڈ کے منحوس قید خانے میں راستہ بتایا تھا۔"

"میں مجبور تھی شارق صاحب، میرے اختیارات محدود تھے ورنہ ـــــ میں آپ کو ذرا بھی تکلیف نہ پہنچنے دیتی۔"

"میری زندگی ـــــ میری روح ـــــ تمہیں پا کر میں دنیا کی ہر تکلیف بھول گیا ہوں۔ وہ اذیتیں جن کے بدلے میں تم ملی ہو میرے لئے دنیا بھر کی راحتوں سے زیادہ نہیں۔ مجھے اب دنیا سے کوئی شکایت نہیں ہے میری روح ـــــ" میں نے جذبات سے بھرپور لہجے میں کہا۔ مجھے احساس نہیں ہے کہ کب میں نے اسے اپنے بازوؤں میں لے کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

مجھے تو اس وقت ہوش آیا جب اس نے آہستہ خود کو میرے جسم سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"ہم مسلمان ہیں، ہمارے مذہب میں بغیر نکاح کے ایک دوسرے سے قرب جائز نہیں ہے۔ میری روح بھی آپ کے وصال کے لئے تڑپ رہی ہے لیکن ہمیں پہلے مذہبی طور پر ایک ہونا پڑے گا۔"

"میں شرمندہ ہوں ـــــ" میں نے اس سے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا۔ اسی وقت ہم نے قدموں کی آوازیں سنیں، اور چونک کر دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔ اندر داخل ہونے والی نسترن تھی۔ میں اسے دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑا۔

"ارے نسترن تم ـــــ؟"

"اے اللہ میاں، اس حسین جوڑے کو بری نگاہ سے محفوظ رکھے۔ میاں طلب کر رہے ہیں۔ باہر مرزا برق کھڑے ہیں، مارے شرم کے اندر نہیں آئے۔ چلو میاں ـــ وہاں تمہارے نکاح کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔"

میں نے تسنیم کی طرف دیکھا! اور وہ شرمائے ہوئے انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم دونوں نسترن کی رہنمائی میں باہر نکل آئے۔ باہر مرزا برق سفید شیروانی میں ملبوس اپنے مخصوص انداز میں مسکرا رہے تھے۔

"مبارک ہو شارق صاحب، راجہ باسدیو کو مکمل شکست ہو گئی اور خدائے بزرگ و برتر نے آپ کو آپ کی محنت کا ثمر عطا کر دیا۔"

"اس میں آپ کی امداد شامل ہے مرزا برق!" میں نے ممنون لہجے میں کہا۔

"ارے میاں ہمارا کیا ہے، ہم تو حکم کے بندے ہیں۔ آؤ ـــ" مرزا برق نے میرا ہاتھ پکڑا اور حسب معمول مجھ سے آنکھیں بند کرنے کے لئے کہا

اور پھر صرف چند سیکنڈ کے بعد مرزا کے کہنے پر میں نے آنکھیں کھولیں تو ہم اسی مزار شریف پر تھے،

جہاں ایک بار میں اور عارف گئے تھے اور جہاں سے میں عارف
اور شاہدہ کو چھوڑ کر روانہ ہوا تھا۔

عارف اور شاہدہ میرے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے
آگے بڑھ کر دونوں کو گلے لگا لیا۔ عارف کے چہرے پر اب چھوٹی
سی ڈاڑھی نظر آ رہی تھی اور پیشانی پر نماز کا نشان تھا۔ ان
دونوں نے بھی میرے اور تسنیم کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے
اور پھر ہمیں ایک حجرے میں پہنچا دیا گیا جہاں بہت سے
نورانی شکل والے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ نسترن اور شاہدہ
نے تسنیم کا ہاتھ پکڑا اور حجرے کے دوسری طرف کسی حصے
میں لے گئیں۔ مجھے وہیں بٹھا لیا گیا۔

پھر وہی بزرگ میرے پاس آئے جو مجھے ایک مخصوص
حصے میں چھوڑ کر گئے تھے۔ اور میرے سامنے بیٹھ گئے۔ انہیں
بزرگ نے وہ کڑا مجھے دیا تھا جس نے مجھے باسدیو کے طلسم سے
محفوظ رکھا تھا۔

"تمہارے ذہن میں اس لڑکی کے بارے میں بہت سے
سوالات ہوں گے صاحبزادے، تم دونوں کو ازدواجی زندگی
میں باندھنے سے قبل مجھے انہیں اس کے بارے میں سب کچھ
بتا دینے کی ہدایت ہے تاکہ تم اسے بحیثیت منکوحہ قبول
کرو تو تمہارے ذہن میں اس کے لئے کوئی سوال نہ ہو۔ وہ
لڑکی اسم بامسمیٰ ہے، کوثر و تسنیم کی طرح پاک وصاف،
حوروں کی طرح معصوم و سادہ۔ اس کی داستان یوں ہے":

"اب سے صدیوں قبل کی داستان ہے کہ یہ علاقہ
راج کنڈ کہلاتا تھا۔ راج کنڈ ہندو راجاؤں کا بہت بڑا
استھان تھا۔ یہ علاقہ جادو منتر کا علاقہ تھا۔ ہندو راجہ
یہاں آ کر منتر سیکھتے تھے۔ اور جادوگر بن کر جاتے تھے۔ اس
زمانے میں جادو عام تھا اور کسی راجہ کا علم اس وقت تک
مکمل نہیں ہوتا تھا جب تک وہ یہاں آ کر جادو نہ سیکھ لے۔
راجہ اس حد تک جادو سیکھتے تھے جس قدر انہیں راج پاٹ
کے کاموں میں اس کی ضرورت ہوتی تھی۔

لیکن راجہ باسدیو بہت ہوس پرست اور عیاش
راجہ تھا۔ وہ جب گدی سنبھالنے سے پہلے یہاں جادو
سیکھنے آیا تو اس کی ملاقات ہرماترن سے ہوئی۔ یہ ایک
ناپاک ہندو دیوی ہے۔ ہرماترن نے اسے بتایا کہ اگر وہ
چاہے تو ابدی زندگی حاصل کر سکتا ہے۔ ہرماترن ہر
ہندو راجہ کو یہ بات بتاتی تھی لیکن دوسرے راجاؤں کو
ہمیشہ زندہ رہنے کی خواہش نہ ہوئی۔ البتہ باسدیو اس
کے چکر میں آ گیا۔ اس نے ہرماترن کی شاگردی قبول کر
لی اور اس سے وہ جادو سیکھے جن کی اسے راج پاٹ کے
کاموں میں ضرورت نہیں تھی۔ اس طرح وہ ایک بہت بڑا
جادوگر بن گیا۔ اور پھر اپنی استاد ہرماترن کے ساتھ ہی
وہ چشمہ حیوانات تک گیا اور اس نے اس کا پانی پی لیا۔
راجہ باسدیو امر ہو گیا۔ لیکن اس کا جسم پتھر کی طرح سخت
ہو گیا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے ہلنے کے قابل بھی نہ رہا —
تب ہرماترن نے اسے بتایا کہ اب وہ قیامت تک اسی
طرح رہے گا۔ ہاں اگر وہ انسان کی جون میں رہنا چاہے
تو اسے ایک اور شرط پوری کرنی ہوگی":

"باسدیو اس مصیبت سے بری طرح گھبرا گیا تھا۔
یہاں اس کے تمام جادو دھرے رہ گئے تھے۔ اس نے وہ
دوسری شرط پوری کرنے کا وعدہ کر لیا۔ اور ہرماترن نے
اسے اس وقت تک کے لئے پھر سے انسان بنا دیا جب
تک وہ شرط پوری نہ کرے۔ اس نے کہا کہ باسدیو یہاں
ایک مندر تعمیر کرائے جس کا نام نرسول کنڈ ہو۔ اس مندر
میں وہ کسی ایسی صاحب ایمان لڑکی کو لے کر آئے — جو
مسلمان ہو — اور اس لڑکی کو اس مندر کی داسی بنا دے
باسدیو کو اپنی ابدی زندگی عزیز تھی۔ اس کے پاس بے پناہ
شیطانی قوتیں تھیں۔ چنانچہ اس نے یہ شرط پوری کرنے کا

وعدہ کیا۔ اور کسی ایسی مسلمان کنواری لڑکی کی تلاش میں نکل گیا جو صاحب ایمان ہو۔ پھر ہندوستان کے ایک دور افتادہ حصے میں جسے اب تم تاراگڑھ کے نام سے پکارتے ہو، اسے اپنے مطلب کی ایک لڑکی مل گئی۔ یہ لڑکی ایک عالم و عابد شخص مولوی عثمان علی کی بچی تھی اور اس کا نام تسنیم تھا۔ مولوی عثمان علی ہمارے پیر و مرشد کے معتقدین میں سے تھے اور اکثر ان کی خدمت میں حاضری دیتے رہتے تھے۔"

" راجہ باسدیو کی نظر میں وہ لڑکی چڑھ گئی۔ اور ایک روز اس کا جادو چل گیا۔ وہ اس مسلمان لڑکی کو اغوا کر کے وہاں سے چل پڑا۔ اور ابھی صرف وہاں تک پہنچا تھا جہاں تم نے وہ مسجد دیکھی تھی کہ پیر و مرشد نے اس شخص یعنی مولوی عثمان کو اس سانحے کی اطلاع دی۔ مولوی عثمان اپنی بچی کے غم میں پاگل ہو گیا۔ اس نے رو رو کر پیر و مرشد سے عرض کی کہ وہ اپنی بچی کی موت پسند کرے گا لیکن یہ پسند نہیں کرے گا کہ وہ ہندوؤں کے شیطانی بتوں کے سامنے رقص کرے اور اپنی عمر بھر کی ریاضت کھو بیٹھے۔ راجہ باسدیو کے چنگل سے لڑکی کو نکالنا آسان کام نہ تھا۔ وہ لڑکی کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس پر پوری طرح قابو پا چکا تھا۔ لیکن ایک ترکیب نکل ہی آئی۔ پیر و مرشد نے فرمایا کہ اگر وہ بچی صاحب ایمان ہے تو اس سے ایمان کی قوت کوئی نہیں چھین سکتا۔ پیر و مرشد نے کہا کہ وہ اتنا کر سکتے ہیں کہ راجہ باسدیو اس وقت تک اس لڑکی کو وہاں سے نہ لے جا سکے جب تک مولوی عثمان اس سے ملاقات نہ کرے۔ مولوی عثمان بچی سے گفتگو کرے اور اس سے پوچھے کہ وہ صاحب ایمان رہ کر مرنا چاہتی ہے یا ایمان کھو کر۔ اگر بچی اپنا ایمان قائم رکھنے کے لئے تیار ہو تو اسے صدیوں کی موت مرنا پڑے گا اور پھر کسی دن کوئی دوسرا صاحب ایمان شخص اسے مصنوعی موت سے نجات دلائے گا۔"

"مولوی عثمان نے یہ بات غنیمت سمجھی۔ اسے اپنی تربیت اور بچی کے ایمان پر یقین تھا چنانچہ مرشد کے کرم سے وہ اس جگہ پہنچ گیا۔ جہاں اس کی بچی پا بہ زنجیر تھی۔ اور اس نے بچی کے سامنے یہ ماجرا کہہ دیا۔ مولوی عثمان کو مایوسی نہ ہوئی۔ بچی نے بصد خلوص موت پسند کی اور مرشد نے اسے خدا کی حفاظت میں دے دیا۔ مولوی عثمان کو ہدایت ملی کہ وہ وہاں ایک مسجد تعمیر کرائے اور اس کے ایک حجرے میں لڑکی کے آرام کا بندوبست کرے۔ چنانچہ مولوی عثمان نے مرشد کی ہدایت کے مطابق عمل کر دیا۔ لڑکی کو سنہری پر سلا کر اس کے گرد تار عنکبوت قائم کر دیا گیا اور باسدیو کو وہاں سے نکال دیا۔

شیطان باسدیو اپنی ناکامی پر بہت جھلایا۔ اس کے لئے مصیبت یہ تھی کہ شرط کے مطابق اب وہ صرف اس لڑکی کو ترسول کنڈ تک لے جا سکتا تھا۔ اور اس کے لئے مجبور تھا۔ لیکن اپنے ناپاک قدموں سے وہ اس پاک جگہ داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے ہر ماترن سے مہلت مانگی اور وعدہ کیا کہ اس کی قوتوں کو اس وقت تک قائم رہنے دیا جائے جب تک وہ اس مصیبت کا کوئی حل نہ سوچ لے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کوئی ترکیب نکال لے گا۔ اور سوئی ہوئی تسنیم کو اٹھا کر ترسول کنڈ لے جائے گا۔ اس کے بعد تسنیم کو منتروں کے ذریعے جگا کر اسے داسی بنا دینا مشکل کام نہ تھا۔"

" اور وہ اپنی تگ و دو میں لگا رہا۔ اور اس وقت کا انتظار کرنے لگا جب تسنیم کو جگانے والا پیدا نہ ہو جائے۔ اور پھر یہ کام تمہاری قسمت میں لکھا تھا۔ راجہ باسدیو نے تمہیں دیکھا اور پہچان لیا کہ صرف تم ہو جو اسے مسجد میں لے جا سکتے ہو۔ کیونکہ تم ہی وہ شخص تھے جس کے مقدر میں تسنیم کا حصول تھا۔ وہ تمہاری پشت پر سوار ہو گیا۔"

عمران ڈائجسٹ آپ کے لئے

عمران ڈائجسٹ کے مقبول سلسلے آپ کی فرمائش پر کتابی شکل میں شائع کر رہا ہے

یہ وہ سلسلے ہیں جن کو پڑھنے کے لیے آپ یقیناً بے چین ہوں گے !

- مہاراجہ
- بانگڑو
- سدایو
- چمپا کلی
- میں کیا کرتا
- اسپیرا
- پُراسرار قوتوں کی ماہر
- ٹی تیکا
- ماضی کے تجزیے
- وحشی
- سلاسیہ
- صمورالہ
- ثروت بیتی
- جلاوطن
- پُراسرار علوم کی ماہر
- اس کا سایہ
- ترسول کنڈلی داسی

اگر آپ چاہتے ہیں کہ ان میں سے کوئی کتاب پڑھنے سے نہ رہ جائے تو آج ہی قریبی دکاندار سے رجوع کریں یا ہمیں لکھیں

مکتبہ عمران ڈائجسٹ ۳۷ - اردو بازار - کراچی فون ۲۱۶۳۶۱

اور یہاں سے تمہاری قوت ایمانی کا امتحان شروع ہوگیا۔ تمہاری مدد اس وقت بھی کی جاسکتی تھی جب باسدیو تمہاری پشت پر سوار تھا۔ تمہاری مدد اس وقت بھی کی جاسکتی تھی جب تمہارے بستر پر تین کٹے ہوئے سر رکھے تھے — ہر موقع پر تمہاری مدد کی جاسکتی تھی، لیکن یہ امتحان بھی مقصود تھا کہ تم اس منصب کے اہل بھی ہو جو تمہیں سونپا جانا ہے یا نہیں۔"

"اور تم حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔ تم نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن تم اس بات کے لئے تیار نہ ہوئے کہ کسی ناپاک روح کو پاک مسجد میں لے جاؤ۔ اور تمہارے امتحانات کا دور جاری رہا۔ تم ہر امتحان میں پورے اترے۔ لیکن جب مردود باسدیو تمہاری بہن کو زرسول کنڈ لے جانے لگا تو مرشد سے نہ رہا گیا اور انہوں نے اس دوسری مسلمان بچی کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ تمہارا امتحان مکمل ہوگیا تھا، اس لئے مرزا برق کو تمہارے پاس بھیجا گیا — اور برق تمہیں یہاں لے آیا۔ تسنیم حوروں کی طرح پاک ہے، اس کے والدین کے انتقال کو صدیاں بیت چکی ہیں اور اب صرف تم اس کے وارث ہو۔ بولو تمہیں یہ معصوم بار کرو قبول ہے۔ تم نے اس کے حصول کے لئے جو قیمت ادا کی ہے، تم اس پر سرشار ہو۔"

میں اس پراسرار کہانی کے طلسم میں کھویا ہوا تھا، اس عجیب و غریب اور ہولناک کہانی نے میرے ذہن کے تار جھنجھوڑ کر رکھ دیئے تھے۔ کئی منٹ تک میں ان بزرگ کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا، پھر میں نے سنبھل کر کہا۔

"جہاں تک میری زندگی کا سوال ہے محترم، میں اسے سو بار اس لڑکی پر قربان کرسکتا تھا، لیکن میں اسے اپنے والدین کا نعم البدل نہیں سمجھتا۔"

"بے شک اولاد کے لئے والدین سے بڑی چیز اور کوئی نہیں ہے، یہ تمہارے صاحب ایمان ہونے کی ایک اور دلیل ہے شارق، لیکن مشیت ایزدی — اولاد کی موت اسی طرح لکھی تھی۔ اس سلسلے میں جو بھی کام آیا — ویسی موت اس کا مقدر تھی۔ تم تو صرف ایک ذریعہ بنے۔ بہرحال ان شہیدوں کی روح بھی خوش ہوگی کہ ان کی اولاد اس قدر صاحب ایمان ہے۔"

میں نے گردن جھکا دی۔

"جواب دو، مولوی عثمان کی لڑکی کو ان تمام واقعات کے سننے اور سمجھنے کے بعد تم برضا و رغبت اپنی زوجیت میں قبول کرنے کو تیار ہو؟"

"میں تیار ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

اور پھر ہمارے نکاح کے انتظامات ہونے لگے — مجھے پہننے کے لئے لباس دیا گیا۔ نسترن اور شاہدہ تسنیم کے پاس تھیں۔ عارف بے حد خوش تھا۔ وہ مجھے دولہا بنے دیکھ کر خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ بہت طویل عرصے کے بعد ہمیں خوشی نصیب ہوئی تھی۔ بہرحال انہیں بزرگ نے تسنیم سے میرا نکاح پڑھایا اور ہم شرعی طور پر ایک دوسرے کے ہوگئے۔

اس حجرے کو ہمارا حجلۂ عروسی قرار دیا گیا! اور جب میں حجلۂ عروسی میں داخل ہوا تو پورا کمرہ تسنیم کے حسن کی ضیا سے منور تھا۔ یہ میری آرزوؤں کی تکمیل تھی۔ میرے صبر آزما امتحان کا ثمر تھا۔ اور میں اس ثمر کو حاصل کر کے کائنات کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ تسنیم نے بھی بحیثیت بیوی اپنی ایک ایک ادا مجھے سونپ دی۔ دوسری صبح ہمارے اعزاز میں دعوت ولیمہ تھی۔ ایسا زبردست انتظام کیا گیا تھا کہ میں دیکھتا رہ گیا۔ درجنوں قسم کے کھانے تھے۔ اور نہ جانے کہاں کہاں سے مہمان شریک ہوئے تھے۔

ہمارے پرمسرت شب و روز گزرتے رہے — پھر ایک

شام انہیں بزرگ نے مجھ سے ملاقات کی اور کہا۔

"تمہاری زندگی کی شام ڈھل چکی ہے شارق اور اب مسرتیں ہی مسرتیں ہیں۔ تم تارک الدنیا نہیں بلکہ ایک دنیادار انسان ہو۔ اپنی دنیا میں جاؤ اور اسے آباد کرو۔ جہاں تک ہو سکے باایمان رہو اور اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہ ہونے دو۔ تمہارے بہن اور بھائی تمہارے ساتھ جائیں گے۔ عارف اور شاہدہ کے تم وارث ہو کسی نیک لڑکی سے عارف کا عقد کر دینا اور کسی صاحب ایمان مرد سے شاہدہ کا نکاح۔ یہ اب تمہارا کام ہے۔"

"باسد بو کے بارے میں جان سکتا ہوں محترم۔" میں نے ان بزرگ سے پوچھا۔

"ہاں ـــــ اس مردود کا انجام بھی دیکھ لو۔" بزرگ نے کہا اور انہوں نے پہلے کی طرح کوئی دعا پڑھ کر میرے دونوں ہاتھوں میں پھونکی اور کہا۔ "دیکھو ـــــ اس بدکردار کا انجام۔"

اور میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کے آئینے میں دیکھا۔ سب سے پہلے مجھے ترسول کنڈ نظر آیا ـــــ ایسی بدنما اور بدرونق عمارت، جیسے شیطانی عمل سے خوبصورت بنا دیا گیا تھا۔ اب ایک خوفناک کھنڈر نظر آ رہی تھی ـــــ اور اس کھنڈر کے ایک حصے میں کریہہ صورت بوڑھا باسد بو زمین میں آدھا دفن تھا۔ اس کے پورے جسم سے چھوٹے بڑے سانپ لپٹے ہوئے تھے۔ سر پر بچھو رینگ رہے تھے۔ طرح طرح کے حشرات الارض اس کے جسم کو کھا رہے تھے، وہ اس کی آنکھوں، ناک، منہ اور کانوں میں گھسے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی باسد بو اپنے کریہہ ہاتھوں سے کسی کیڑے کو اپنے منہ سے نکال کر پھینک دیتا تھا لیکن ایک آدھ کو ـــــ باقی کیڑے شاید اس کے حلق کے راستے پیٹ تک اتر گئے تھے اس کے پھیرے کے وہ حصے جو کپڑوں سے کھلے ہوئے تھے تکلیف سے مسخ ہو گئے تھے۔ میں اس کی یہ خوفناک حالت دیکھ کر دہشت سے کانپ اٹھا۔

"یہ کب تک اس حالت میں رہے گا محترم بزرگ۔"

"ابد تک ـــــ یہ آب حیات پی چکا ہے، اس لئے اسے موت نہیں آئے گی۔ وہ زندہ رہے گا لیکن اس حال میں جس میں تم اسے دیکھ رہے ہو۔ ہوس دنیا بہت بُری چیز ہے شارق میاں۔ رب مغفرت نے انسان کو فانی بنایا ہے اس کے بنائے ہوئے قانون سے بغاوت کر کے انسان کا حشر اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اس کی دی ہوئی زندگی ایمان کے ساتھ گزارو، اور جب متاع زندگی ختم ہو جائے تو ایمان کے ساتھ جان اس جان آفریں کے سپرد کر دو۔ یہی اصول دنیا اور یہی اس کا قانون ہے۔"

اور پھر اس رات کی صبح جب ہم جاگے، تو ایک بھرے پُرے شہر کے ایک خوبصورت ہوٹل میں تھے۔ شاہدہ اور عارف اور تسنیم بھی میرے ساتھ تھے ہماری زندگی کا دنیاوی دور شروع ہو گیا تھا۔ میں نے اور عارف نے مل کر نئی زندگی شروع کر دی۔ اور اب خدا کا شکر ہے شاہدہ کی شادی ہو چکی ہے، عارف کے بھی دو بچے ہیں اور قدرت نے ہمیں بھی اولاد سے نوازا ہے۔ ■■

عامر محمود کا
ایک خطرناک تحفہ
مائیکل نائیٹ نے دشمنوں کے دانت کھٹے کر دیئے، اُس نے اپنی
چالاکی اور ذہانت سے دشمنوں کے بنائے ہوئے تمام
منصوبے خاک میں ملا دیئے
یہ سب کیسے ہوا۔؟ اس کے لئے پڑھیئے
عامر محمود
کی
نائٹ رائڈر
سسپنس سے بھرپور اس کتاب کو پڑھتے ہوئے ایسا
محسوس کرینگے جیسے نظروں کے سامنے فلم چل رہی ہے۔
دنگارنگ کتاب کلب
۳۷-اردو بازار کراچی - فون - ۲۱۶۳۶۱